دیارِ دل میں

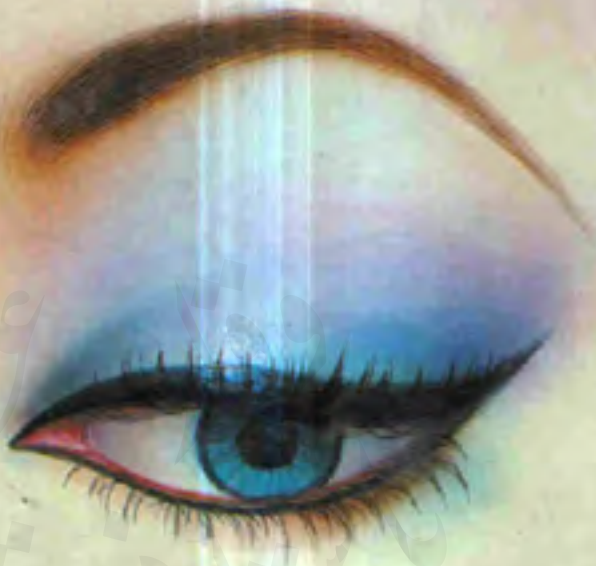

عنیزہ سیّد

پیش لفظ

''دیارِ دل میں'' کتابی شکل میں منظرِ عام پر آنے والا میرا دوسرا ناول ہے۔ وضع داری، روایات اور اقدار کی پاسداری کے پس منظر میں لکھا جانے والا یہ ناول عصرِ حاضر کے چند ایسے اہم مسائل کو ضبطِ تحریر میں لانے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے جن کی وجہ سے ریاست کے چاروں ستون بالخصوص اور معاشرہ بالعموم مسائل کا شکار ہے۔ پاپولر فکشن میں موضوعات کے تنوع کے باعث عام قاری کی معلومات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جس سے عمومی آگاہی بڑھی ہے اور شعور کا گراف بلند ہوا ہے۔ ''دیارِ دل میں'' بھی اسی ضمن میں آتا ہے اور کئی سالوں کے مشاہدے اور تحقیق کا نچوڑ ہے۔

عنیزہ سیّد

دیارِ دل میں

''تم ایسا کرو ایک کپ کافی پیو اور پھر دماغ پر زور دے کر کوئی ایسی بات سناؤ جو نئی ہو۔ جس میں کوئی جان ہو جسے سن کر ایکسائٹمنٹ پھیلنے کے چانسز ہوں۔'' اپنی بات کے جواب میں مہرین کی یہ بات سن کر وہ بھنا کر رہ گیا تھا۔

''شہر بھر کو چھوڑ کر میں یہ قصہ صرف تمہیں سنانے آیا تھا اور تم نے اس کی مٹی پلید کر کے رکھ دی۔'' اس نے مہرین کی ٹیبل کے قریب جا کر کہا۔ اس بات کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولی اپنا کام مکمل کرتی رہی۔ اس کی اس بے اعتنائی پر اس نے چند سیکنڈ وہیں کھڑے کھڑے غور کیا اور پھر اپنی فطرت کے خلاف ایک کوشش کر لینے کا ارادہ باندھا۔

''ماہی! کیا تم واقعی سمجھتی ہو کہ اس قصے میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔'' اس کے چہرے پر چھائی انتہا درجے کی سنجیدگی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مہرین کو بے اختیار ہنسی آ گئی مگر اس کی ناراضگی کے ڈر سے اس نے اس ہنسی کو ہونٹوں تلے دبا لیا۔

''حسن! مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں اس قصے میں نیا پن کہاں سے نظر آ گیا۔'' اس نے اپنے آگے سے کاغذ اور قلم ہٹاتے ہوئے بالآخر اس سے تفصیلی بات کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا اور اپنی ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر ہنوز سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

''میں سمجھتی ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہو، جہاندیدہ ہو، سمجھدار ہو۔ میری اور تمہاری

عمر میں شاید انیس بیس کا فرق ہو گا پھر بھی میں مانتی ہوں کہ تمہارا ذہن زیادہ زرخیز، زیادہ میچور ہے۔ تمہارا مشاہدہ زبردست ہے۔ تمہارے قیافے، تمہارے مفروضے سب مجھ سے زیادہ درست ہوتے ہیں پھر میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں اس قصے میں نئی بات کہاں سے نظر آگئی۔'' ٹھہرو!'' حسن کو کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتے دیکھ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کرایا۔

''میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ حسن کمال! یہ دنیا بہت پرانی ہے۔ کروڑوں سال پرانی، اس دنیا میں اتنا کچھ ہو چکا ہے اور اتنا کچھ وقت کے ساتھ دُہرایا جا چکا ہے کہ کسی بھی بات میں نیا پن نہیں رہا خصوصاً آج کے دور میں جہاں منظر چٹکی بجاتے بدل جاتے ہیں پھر یہ کہانی جو تم سنا رہے ہو یہ تو صدیوں سے دہرائی جا رہی ہے۔ اس میں تو کسی نئی بات کے ہونے کا احساس ہی نہیں جاگتا۔'' اس نے اپنی بات مکمل کر کے حسن کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے اس کی بات کو کس حد تک سنا تھا مگر اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ یوں جیسے اس کی بات اسے اپنا موقف بدلنے پر مجبور نہ کر سکی ہو۔

''تم نے کبھی خواتین کے لیے چھپنے والے ڈائجسٹ پڑھے ہیں؟'' اس نے پین اٹھا کر اسے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے گھماتے ہوئے پوچھا۔ وہ خاموش رہا۔

''نہیں پڑھے نا!'' وہ کرسی کی پشت چھوڑ کر آگے ہوئی اور میز پر کہنیاں ٹکا کر بولی۔ ''میں نے پڑھے ہیں بے شمار پڑھے ہیں اور میں افسوس سے دعویٰ کر سکتی ہوں کہ ان ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تقریباً چالیس فیصد کہانیاں اسی قسم کے قصوں کے پس منظر میں لکھی جاتی ہیں۔ گدی نشین بزرگ، حویلیاں، زمینیں، جاگیرداریاں، زنان خانہ، زنان خانے کے اندر رونما ہونے والے کارنامے، عیاش مخدوم زادوں کے کرتوت، گاؤں کی لڑکیاں، عقیدت مندوں کی بیٹیاں، ظلم وستم، بے انصافیاں۔'' وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اس کا تصور کرتے ہوئے اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

''حسن کمال! یہ تو بہت پرانی داستان ہے۔ تمہارے لیے بھی اتنی ہی پرانی ہونی چاہیے جتنی یہ ہے مگر حیرت ہے کہ تم اپنے کسی مخدوم زادہ ٹائپ دوست کے ہاں مہمان رہنے کیا گئے، ایسی کہانی کا نظارہ کر کے یہ دعویٰ کرنے لگے کہ یہ اچھوتی کہانی ہے۔ اس میں نیا پن ہے۔'' اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر حسن کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں اب بھی ایسا کوئی تاثر نہیں جھلک رہا تھا کہ وہ اس کی بات سے متاثر ہو۔ اس صورتِ حال پر مہرین نے شانے اچکائے اور دوبارہ سے اپنے سامنے دھرے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''تم نہیں مانتیں.....؟'' چند سیکنڈز کے بعد اس کے کانوں میں حسن کی آواز آئی۔ اس نے ایک بار پھر سر اٹھایا۔ ''تو نہ سہی!'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ''تھوڑا وقت مجھے دو۔ میں تمہیں ثابت کر کے دکھاؤں گا کہ یہ قصہ نیا ہے اور میں جب ثابت کرنے کی پوزیشن میں آجاؤں گا نا مہرین نیازی تو پھر اسے چند سو کی سرکولیشن والے ''اون لکر'' میں نہیں چھپواؤں گا بلکہ اس کو شائع کروانے کے لیے میں سب سے زیادہ سرکولیٹ ہونے والے نیوز لیٹر کے پاس جاؤں گا تم دیکھنا۔'' اس کے چہرے پر قطعیت تھی۔ ''اور پھر تم بھی مانو گی کہ ہاں اس قصے میں کچھ نیا ہے۔ یہ باقی پرانے قصوں سے مختلف ہے۔'' مہرین اس کے لہجے کی درشتی اور چہرے کی قطعیت کو دیکھ کر بس اسے دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

.....

حسن کمال ماسٹرز سے اس کے ساتھ تھا۔ مہرین اتنے سالوں میں اسے بہت اچھی طرح جان چکی تھی۔ اسے افسوس ہوتا رہتا تھا۔ حسن کمال اتنی ذہانت، علم اور خوبیوں کا مالک ہونے کے باوجود اب تک زندگی میں مقام حاصل نہیں کر پایا تھا جو اس جیسے لڑکے کو ملنا چاہیے تھا۔ یونیورسٹی کے دنوں میں بھی ڈیپارٹمنٹ کے تمام اساتذہ کی مشترکہ رائے تھی کہ وہ اپنے شوق اور لگن کی وجہ سے اپنی فیلڈ میں اعلیٰ مقام پائے گا مگر عجیب قسمت تھی کہ ساتھ کے سب لڑکے ماسٹرز کرنے کے بعد اچھی جگہوں پر سیٹ ہو چکے تھے سوائے حسن رضا کے۔

ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز مہرین کا محض شوق تھا۔ وہ اچھے متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے نوکری کرنے کا بھی کوئی خاص شوق نہیں تھا مگر ''اون لکر'' کی بات اور تھی۔ یہ جنرل میگزین اس کے چچا ریاض احمد کیانی کے ذہن کی اختراع تھی۔ میگزین کا بجٹ زیادہ نہیں تھا۔ صفحات بھی کم تھے۔ لے آؤٹ اور پرنٹ کا کام بھی پورا پورا ہی تھا۔ چند صفحات کا یہ میگزین ایسے ہی پرچوں میں سے تھا جو کبھی کبھار ریلوے اور بس اسٹیشنز پر موجود بک اسٹالز پر لٹکے نظر آتے ہیں یا ایسے ہی سفر کے درمیان ہاکرز بیچتے نظر آتے تھے۔ اس کے ادارے میں گنتی کے چند لوگ تھے اور ان لوگوں کو بھی زیادہ تر مہرین خود اور حسن کمال چلاتے تھے۔ حسن کمال کی اس میگزین میں آمد بھی مہرین کی نیک فطرتی کا نتیجہ تھی۔ ادھر آتے ہی اس نے حسن کمال کی فارغ البالی کو دیکھتے ہوئے اسے بھی اپنے ساتھ بلا لیا تھا۔ اس وقت سے دونوں یہاں کام کر رہے تھے اور اکثر سوچتے رہتے تھے کہ کون سی ترکیبیں استعمال کر کے وہ ''اون لکر'' کو ایک لیڈنگ میگزین بنا سکتے ہیں۔

"سارا مسئلہ ہی لاہور کا ہے جی!" جہانگیر اکثر انہیں بتایا کرتا تھا۔ جہانگیر کمپوزنگ کا کام کرتا تھا اور ان دونوں سے زیادہ اسے یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ "اون لکر" کی سرکولیشن کیسے بڑھ سکتی ہے۔ ساری سوچ بچار کے بعد وہ یہ نکتہ نکال لاتا تھا۔

"یہ لاہور شہر ہے جی لاہور شہر۔ جیسے آج سے کئی سال پہلے سے ہی ہر چیز کی علیحدہ مارکیٹ کا رواج بن گیا تھا۔ کپڑے کی مارکیٹ، سونے کی مارکیٹ، اسپیئر پارٹس کی مارکیٹ، ہول سیل کی مارکیٹ ویسے ہی رسالوں وغیرہ کا بھی یہی چکر ہے۔ اس معاملے میں لاہور کچھ خاص قسمت والا شہر نہیں ہے۔ یہاں سے شائع ہونے والے رسالوں کی مارکیٹ ہمیشہ سے ماٹھی ہے۔ وہی چند سو کی سرکولیشن، اس دھندے کی مارکیٹ کراچی میں ہے۔ جیسے اُردو بک پبلشنگ کی مارکیٹ لاہور میں ہے، سو حساب ہے۔"

"یہ کوئی دلیل نہیں ہے جہانگیر!" مہرین اس کی بات پر ہمیشہ غور کرنے کے بعد یہی جواب دیتی۔ "سارا مسئلہ فنانس کا ہے۔ پیسہ ہو اور خوب ہو پھر یہ کام کرنا چاہیے۔"

"تو ہم تو پھر مذاق مذاق کھیل رہے ہیں نا!" حسن ایسے موقع پر ہمیشہ جذباتی ہو جاتا۔ "شام کے اخبار جیسی حالت ہے ہماری۔ یوں جیسے کرنے کو کچھ اور کام نہیں تو یہ کر لیا۔ تم لوگ غلط لائن پر سوچتے ہو۔ ہماری ناکامی کی وجہ نہ لاہور ہے نہ پیسہ۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کام کے لیے اپنا دماغ ہرگز استعمال نہیں کرتے بلکہ مارکیٹ میں ان جو ٹرینڈ ہے اس کو فالو کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ مرچ مسالے دار خبریں، ماڈل گرلز کے کلوز اپس سے مزین سینٹرا سپریڈز، دو ادھر کی چار اُدھر کی خبریں، بڑے لوگوں کے اوریجنل انٹرویوز کے بجائے کہیں اور شائع ہوئے انٹرویوز کے اقتباسات، ایک دو گھسے پٹے فیچرز، میگزین کیا بکے گا بھئی۔ کون پڑھے گا باسی چیزیں۔"

"تو پھر کیا کریں، کیا ہونا چاہیے؟" مہرین جھلا جاتی۔ "ہر کوئی خیالات کا اظہار ہی فرماتا رہتا ہے۔ یہ نہیں بتاتا کہ لائن آف ایکشن کیا ہونا چاہیے۔"

"ایسی باتیں جن میں نیا پن ہو۔ ایسے خیالات جو نئے اور اچھوتے ہوں۔" وہ سر اٹھا کر خلا میں گھورتے ہوئے جیسے کسی تصور کے تانے بانے بنتے ہوئے کہتا۔ "آیا تھا انقلاب صحافت کی دنیا میں کچھ سال پہلے۔" پھر وہ کوئی تاریخ سنانے لگ جاتا۔ "اخلاقیات اور روایات کا جنازہ نکال دینے کے بعد صحافیوں نے اور ان کے پیدا کردہ پرچوں نے قارئین کو ایک نئے مزاج، نئے انداز سے روشناس کروایا تھا مگر اب پڑھنے والا اس کا بھی عادی ہو چکا ہے۔ اب وہ کچھ نیا چاہتا ہے۔"

"پڑھنے والا کہاں حسن بھائی!" نعیم سلطان ادارے کا آفیشل فوٹو گرافر تھا، اپنی زکام زدہ آواز میں کہتا۔ "پڑھتا کون ہے۔ آدھے سے زیادہ قاری تو یہ ڈبا اٹھا کر لے گیا ہے۔" وہ جہانگیر کی ٹیبل پر دھرے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "جو بچے ہیں ان کی اس معاملے میں اپنی اپنی چوائس ملے ہے۔ وہ "اون لکر" کیوں خریدیں گے؟"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں۔" اتنی مایوس کن گفتگو سن کر مہرین کبھی کبھی گھبرا جاتی۔ "یہ دکان بڑھا ہی دیتے ہیں۔ اگر ہر طرف رکاوٹیں اور ناکامیاں ہی ہیں تو!"

"کیوں بڑھا دیں؟" اس بات پر حسن بگڑ کر کہتا۔

"میں نے کہا نا نئے پن کی سوچ، اچھوتی بات، اچھوتا رنگ و آہنگ پھر دیکھنا "اون لکر" چلتا ہے کہ بھاگتا ہے۔" اس کی اس بات پر مہرین کا دل پھر خوش فہم ہو جاتا۔ نہ جانے اسے کیوں یقین تھا کہ ایک روز حسن اپنی اس بات کو سچ کر دکھائے گا مگر اس روز حسن کی کہانی کو پرانا کہنے پر جب اس نے اس میں نیا پن ثابت کر دینے کا دعویٰ کیا تھا تو ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ گیا تھا کہ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس قصے کو "اون لکر" کی نہیں کسی لیڈنگ میگزین کی کہانی بنائے گا۔

.......•.......

"زندگی کو بے مقصد گزارنا بھی تو گناہ ہے نا چا میاں۔" کرن فاطمہ نے ایک گھنٹا بیس منٹ تک چا میاں کو دیوان غالب سے انتخاب سنانے کے بعد اچانک انتہائی بیزار لہجے میں کہا۔

"یہ بھی تو زندگی کا ایک اچھا مصرف ہے نا فاطمہ بی بی!" چا میاں ہمیشہ اس کو فاطمہ کے نام سے مخاطب کرتے تھے حالانکہ اس کا نام کرن فاطمہ انہوں نے ہی رکھا تھا۔ "زندگی کا ایک مصرف یہ بھی تو ہے نا بچے کہ تم مجھ آنکھوں سے محروم شخص کو دیوان غالب سنا رہی ہو۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کتاب اس سے لیتے ہوئے کہا اور بڑی نرمی اور پیار سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"کتنا پیار ہے انہیں اس کتاب سے۔" کرن فاطمہ کی سوچ ایک اور نقطے پر مبذول ہوئی۔ "مرقع چغتائی دیوان غالب۔" اس میں بنے نقش و نگار کو کتنی بار انہوں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہو گا اور کتنی مرتبہ اپنی ان آنکھوں سے پڑھا ہو گا اور اب جبکہ یہ نہ تو اس کو پڑھ سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں تو اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔" وہ کچھ دیر تک اسی نکتے پر سوچتی رہی اور پھر جیسے وہ ان کی کہی بات سے متفق بھی ہو گئی۔ "ہاں زندگی کا ایک مصرف یہ بھی ہے تو آپ کسی آنکھوں سے محروم شخص کی آنکھ بن جائیں۔"

"پھر بھی چاچامیاں! کچھ تو مصروفیت ہونی چاہیے۔ یوں گھر بیٹھے بیکار وقت گزارتے گزارتے میں نکمی اور بیکار ہو جاؤں گی۔" اس نے ذہن سے یہ بات جھٹک کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ارادے ہیں؟" چاچامیاں اس کی بات میں چھپی بات کو خوب سمجھتے تھے جبھی مسکرا کر بولے۔

"حمیرا ہے نا۔" ان کی بات پر باغ باغ ہوتے ہوئے وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گئی۔ "وہ جو یونیورسٹی میں میرے ساتھ تھی۔ آپ کو یاد ہے ایک بار میرے ساتھ آئی بھی تھی۔ وہ جب آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، تم آگے سناؤ۔"

"وہ بتا رہی تھی کہ ایک انگلش میگزین شائع ہوتا ہے یہاں لاہور سے "اون لکر" اس میں مجھے جاب مل سکتی ہے اگر میں اپلائی کروں تو۔"

"اون لکر!" چاچامیاں نے دہرایا۔ "بھئی میں نے تو اس میگزین کا نام آج تک نہیں سنا۔"

"تو کتنے میگزین اور اخبار ہیں جو پڑھتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے آج کل یہ فیلڈ کیسے ٹاپ پر جا رہی ہے۔ جتنا کام اس فیلڈ میں ہو رہا ہے کم ہی کہیں اور ہو رہا ہوگا۔ اخبارات اور میگزینز کی "مشروم گروتھ" کا زمانہ ہے آج کل، کسی بک اسٹال پر چلے جائیں جہاں پہلے بارہ کلپس پر بارہ رسالے لٹک رہے ہوتے تھے، اب تقریباً چالیس پچاس کلپس پر اتنے ہی میگزین اور ڈائجسٹ لٹک رہے ہوتے ہیں۔ سب کے سب ایک جیسے بھی ہوں تو لوگ خریدتے اور پڑھتے ہیں۔"

"اچھا بھئی ہوگا۔" چاچامیاں حسب عادت مسکرا کر بولے۔ "ہمیں تو اپنا ہی زمانہ یاد ہے جب چند اخبارات تھے گنے چنے اور نامور اور گنتی کے میگزین اور ڈائجسٹ شائع ہوتے تھے، انتہائی معیاری اور پڑھنے کے قابل۔"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ معیار اب خراب ہو گیا ہے۔" کرن نے چونک کر کہا۔

"اب تو میرے پیارے چاچامیاں، معیار کا بھی اپنا ایک خاص معیار بن چکا ہے جس کے پیمانے پر سب کچھ جانچا جاتا ہے۔ آپ کبھی ان میگزینز کا فائن پیپر، لے آؤٹ اور پرنٹ دیکھیں تو حیران ہو جائیں۔ ایسے ایسے کونوں کھدروں میں گھس کر خبریں ڈھونڈ کر لاتے ہیں ان کے رپورٹرز کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور زیب داستان کے لیے جو حکایات یہ لوگ بڑھاتے ہیں اس کا تو کوئی جواب

ہی نہیں۔ بس آپ ایسا کریں کہ امی اور عمیر سے مجھے اجازت دلوا دیں۔ میں ایک بار کوشش کرنا چاہتی ہوں۔ دراصل ان میگزینز کی شکل عقل مجھے بھی خاصی متاثر کرتی ہے۔" آخری بات اس نے قدرے نیچی آواز میں کہی تھی۔ چاچامیاں اس بات پر بے اختیار ہنس دیئے۔

"چال تمہاری کوئی بھی ہو فاطمہ بی بی، مہرہ تم مجھے ہی بناتی ہو۔ کبھی پٹ گیا نا یہ مہرہ تو آئندہ کے لیے تمہاری ساری چالوں کی خلاصی ہو جائے گی۔" چاچامیاں نے وہیل چیئر کے پہیوں کو گھما کر باہر کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ کرن نے اردگرد بکھری کتابیں سمیٹ کر اٹھتے ہوئے فوراً ان کی وہیل چیئر کو پشت سے پکڑ لیا۔

"میں لے کر چلتی ہوں، کہاں جانا ہے؟"

"بھئی کچن سے بڑی زوروں کی خوشبو آ رہی ہے۔ لگتا ہے تمہاری امی اور چچی آج کچھ خاص تڑکا لگا رہی ہیں کھانے کو۔ بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے تو سوچا چلو ایک چکر کچن ہی کا لگا لیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "چنانچہ معاملہ یہ ہے چاچامیاں کہ زندگی کا کوئی بھی مصرف اور مقصد ہو، پیٹ کی بھوک اس پر ہر صورت بھاری ہے لہٰذا ویسی کھانے اور ویسی تڑکے زندہ باد!"

"عمر عزیز کا تھوڑا عرصہ ہی باقی رہ گیا ہے بھتیجی، اب اس میں خدا کی نعمتوں کو دل بھر کر چکھنے دو۔ پہلے تو کمانے کے چکروں میں ان کی لذت کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔" انہوں نے وہیل چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے چاچامیاں، آپ ایسی باتیں صرف اپنا دل لگانے کے لیے کرتے ہیں ورنہ کہاں آپ اور کہاں کھانوں اور تڑکوں کی گفتگو۔ آپ تو صرف میر و غالب، صادقین، چغتائی، ٹالسٹائی و ڈکنس کی باتیں کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔" کرن کا دل خواہ مخواہ ہی بھر آیا اور اس کی آنکھ سے آنسو لڑھکنے لگے جنہیں ایک ہاتھ سے صاف کر کے دوسرے ہاتھ سے چاچامیاں کی وہیل چیئر دھکیلتی کچن کی طرف چل دی۔

Chitral a Travelogue

(چترال، ایک سفرنامہ) اس روز جب کہیں سے بالآخر اسے "اون لکر" کا ایک پرچہ مل ہی گیا تو اس میں سے ایک مضمون سناتے سناتے اس نے چاچامیاں کو سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ پوری توجہ سے سن رہے تھے۔

''کیسا لگ رہا ہے چاچا میاں؟'' اس نے رک کر پوچھا۔

''سناؤ سناؤ، میں پورا سننے کے بعد ہی کچھ کہوں گا۔'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سنانا جاری رکھنے کو کہا۔

''چلیے اب بتائیے۔'' سارا مضمون ختم کرنے کے بعد اس نے میگزین ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''سارے میگزین میں یہی ایک کام کی چیز ہے۔ باقی وہ جو تم مجھے ویمن لبریشن کا مضمون سنا رہی تھیں اور جو کلچرل سینز تھے، ایڈیٹر کی ڈاک، آسٹرولوجی سب کچھ اِدھر اُدھر سے نقل مار کر کام پورا کیا گیا ہے۔ ہاں اس Travelogue میں کچھ اور یکجہتی ضرور ہے۔ لگتا ہے لکھنے والا خود مشاہدہ کر کے آیا ہے۔'' انہوں نے بغیر لحاظ رکھے حسبِ عادت صاف صاف تبصرہ کیا۔

''توبہ ہے چاچا میاں! حد ہے آپ کی بھی اور آپ کی پسند ناپسند کی بھی۔ اب تو زمانہ جناب یونہی ہے۔ آپ کے تبصروں پر چلیں تو سمجھیں دنیا میں کوئی بھی کام اچھا ہو ہی نہیں رہا۔''

''نہیں۔'' وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ''ایسا بھی نہیں ہے۔ سب اچھا ہو رہا ہے۔ حالات کے تقاضے بدل گئے ہیں نا تو پھر ان کے مطابق تو سب اچھا ہی ہو رہا ہے۔''

''پھر آپ کریں نا بات امی اور عمیر بھائی سے۔'' کرن نے اکتا کر کہا۔

''دیکھو بچے! میں نے تمہارے اس پرچے کو دیکھا تو نہیں۔'' انہوں نے ''اون لکر'' کے صفحات پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مگر محسوس کر سکتا ہوں کہ اس کی شکل عقل کچھ ماٹھی سی ہے۔ دیکھو اس کے کاغذ کی سطح کتنی رف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کو شائع کرنے والے بس گزارہ ہی کر رہے ہیں۔ ایسے میں تم اگر وہاں جاؤ اور درخواست کرو نوکری کی تو کیا ان کے پاس گنجائش ہو گی۔''

''ہو گی نا جب ہی تو حمیرا نے مجھ سے کہا ہے۔ آپ ایک بار عمیر بھائی اور امی سے کہیں تو۔''

''چلو پھر کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' کرن نے گہرا سانس لیا۔ اسے کچھ اطمینان ہونے لگا تھا۔

.....o.....

وہ اندرون شہر کی تنگ اور پیچیدہ گلیوں میں سے ایک گلی میں بنا کئی منزلہ مکان تھا۔ یہ مکان پرانا تھا اور تنگ و تاریک بھی۔ ایک ایسا مکان تھا۔ جس کی نچلی منزل میں صبح کے وقت بھی ٹیوب

لائٹ جلا کر کام کرنا پڑتا تھا۔ یہ مکان تین بھائیوں کی مشترکہ ملکیت تھا۔ عابد حسن جو سب سے بڑے بھائی تھے درمیان والی منزل میں رہتے تھے۔ زاہد حسن جو منجھلے تھے اوپر کی منزل میں رہتے تھے اور شاہد حسن جو سب سے چھوٹے تھے سب سے نچلی منزل کے مکین تھے۔ اس مکان کے اندر کا ماحول علاقے کے مخصوص ماحول سے قطعی مختلف نہیں تھا۔ چھوٹے بڑے کئی بچے، گلے شکوے کرتی، لڑتی جھگڑتی دیورانیاں جٹھانیاں، صبح گھر سے نکلے شام کی پھیلی تاریکی میں گھر لوٹنے والے مرد، کم آمدن زیادہ اخراجات، وقت کے وقت چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا آنے والا سودا سلف، بجلی اور گیس کے مشترکہ بلوں کی ادائیگی اور تقسیم کے جھگڑے۔

حسن کمال اسی گھر میں ایک مہمان مکین کی طرح رہتا تھا۔ اس مکان کے تینوں مشترکہ مالک رشتے میں اس کے سگے ماموں تھے۔ اس کے اپنے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ نانا مرحوم کی وراثت اس مکان میں ایک کمرا جو نچلی سے درمیانی منزل کی طرف جاتی سیڑھیوں کے ایک سائیڈ پر بنا تھا اسے اس کی مرحومہ والدہ کے حصے کے طور پر رہنے کے لیے دیا گیا تھا۔ اس کی مفلوک الحالی میں یہ کمرا بھی اس کے لیے غنیمت تھا جس میں وہ رات گئے رات گزارنے کے لیے آتا تھا اور دن دس بجے کے بعد نکل جاتا تھا۔ اس کی چھوٹی ممانی کو اس کے سلسلے میں صرف ایک ہی تکلیف تھی اور وہ یہ کہ رات گئے اس کے گھر آنے پر انہیں یا ان کے کسی بچے کو اٹھ کر دروازہ کھولنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی تینوں ممانیوں کو اس سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ وہ کہاں سے کھاتا تھا، کب کھاتا تھا، کہاں سے لے کر پہنتا تھا، کہاں دھوتا تھا اور استری کرتا تھا یہ ان کی دردسری نہیں تھی۔ ہاں کبھی اگر کسی چھٹی کے دن وہ گھر پر ہوتا اور کسی ممانی کے ہاں گنجائش ہوتی تو وہ گھر کے لیے پکے میں سے ایک پلیٹ کسی بچے کے ہاتھ اسے ضروری بھجوا دیتیں۔

''چلو گھر کا پکا کھالے گا، یتیم بچہ ہے۔'' کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کی بھجوائی پلیٹ لے کر واپس آتا بچہ اطلاع دیتا۔

''حسن بھائی تو حلیم کھا رہے تھے لیموں نچوڑ کر سبز مرچوں کے ساتھ۔'' یا پھر۔ ''ان کے پاس تو ترس کھانے والی ممانی کے ماتھے پر ڈھیروں بل پڑ جاتے۔

''تجھے جھوٹے منہ بھی نہ کہا کم بخت نے کہ آ منے بیٹھ جا تو بھی کھالے۔''

''نہ۔'' بچے کا جواب اکثر یہی ہوتا تھا۔

''پیٹ پھٹے مردود کا۔ بدھی ہو جائے کم بخت کو، ہم ہیں کہ ترس کھاتے ہیں۔ وہ ایک سے

ایک بڑھیا کھانا ڈکار رہا ہوتا ہے۔ آئندہ میں بھی کبھی جو خیال کروں تو نام بدل دینا۔'' مگر وہ آئندہ کبھی نہ آتا۔ وہ اتنا بے ضرر لڑکا تھا کہ اس کے ہاتھوں کوئی تکلیف نہ پہنچنے پر پھر کسی چھٹی والے دن کسی نہ کسی کو ترس آ ہی جاتا۔

حسن کمال خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس گھر میں رہتے ہوئے اسے کوئی تکلیف تھی یا نہیں۔ اتنی مرتبہ کے اتفاق کے بعد بھی اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اسے چھٹی کے دن کسی ممانی کی طرف سے بھجوائی جانے والی پلیٹ کا انتظار کر لینا چاہیے۔ اسے اس قسم کے خیالات آ بھی نہیں سکتے تھے۔ اسے یتیم و مسکین ہوئے عرصہ ہوا تھا۔ وہ فرسٹ ایئر میں تھا جب اس کے ابو فوت ہو گئے اور سیکنڈ ایئر میں امی۔ ان دونوں کی زندگی میں بھی کرائے کے جس گھر میں وہ رہتے تھے، زندگی میں کوئی خاص نظم و ضبط نہیں تھا۔ اس کی امی دائمی مریضہ تھیں اور اکثر بیمار رہتی تھیں۔ اکثر و بیشتر پکا پکایا کھانا بازار سے آتا تھا۔ گھر میں کوئی ترتیب نہیں تھی۔ وہ اس کم عمری میں بھی صبح کا نکلا شام کو لوٹتا تھا۔ ان دونوں کے بعد بھی اسے کوئی خاص تبدیلی اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوئی تھی۔

بی اے اور ایم اے اس نے ڈیزرونگ اسٹوڈنٹ کی بنیاد پر کیا تھا۔ اس کا خرچ سراج صاحب جو سوشل ورکر ٹائپ شخص تھے، ادا کرتے تھے۔ یہ قرض حسنہ تھا جسے ادا کرنا اس کی ذمے داری تھی مگر ایم اے کرنے کے بعد بھی اسے ڈھنگ کی کوئی نوکری نہیں ملی جبکہ اس کے ساتھ کے لڑکے کہیں سے کہیں پہنچ گئے تھے۔ وہ یقیناً خودکشی کے مجوزہ طریقوں میں سے کسی ایک پر غور کرنے کی صورتِ حال کو پہنچ چکا ہوتا اگر مہرین نیازی اس کی مدد کو نہ پہنچ جاتی۔

مہرین نے اسے ذہنی تنہائی اور مایوسی کی انتہا سے نکالنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ اسے ''اون لکر'' میں لے گئی۔ جس کی سرکولیشن اگرچہ محدود تھی مگر اسے اس کا معاوضہ باقاعدگی سے ادا کر دیا جاتا تھا۔ تمام خرچے نکالنے کے بعد ناشر کے پاس بچتا کیا ہوگا جو یہ ادائیگی اسے ہو جاتی تھی۔ فی الحال اس بات پر غور نہ کرنے کا اس نے ارادہ کر رکھا تھا۔ مہینے کے مہینے اس کی جیب میں پیسے آ جاتے تھے جو اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ مہرین نیازی اسے اپنے بیچ کا سب سے ذہین طالب علم گردانتی تھی اور جب وہ میگزین کے صفحات بھرنے کے لیے ہر قسم کے موضوع پر مختلف چیزیں بنا سنوار کر وقت سے پہلے اس کے سامنے رکھ دیتا تو وہ اور بھی شدت سے اپنے موقف کا اظہار کرتی۔

''کوئی بھی میڈیا ذہانت کا شخص اتنے کم وقت میں اتنی مسالے دار چیزیں نہیں بنا سکتا۔ یہ

میرا دعویٰ ہے۔'' وہ کہتی ہے۔ ''مجھے تو لگتا ہے حسن کمال! تم یہاں صرف وقت ضائع کر رہے ہو۔ تمہیں تو کہیں اونچی جگہ پر ہونا چاہیے، بہت اونچی جگہ پر۔'' وہ کہتی۔

''ہاں ضرور۔'' وہ دانتوں سے ناخن کترتا۔ اس کی بات سننے کے بعد نوکر کے کترے ناخن ادھر اُدھر اڑاتا ہوا کہتا۔ ''ایک دن آئے گا جب یہ ''اون لکر'' ہی اونچی چیز بنے گا، بہت اونچی چیز۔''

وہ مہرین کا دل توڑنے کا بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ نہ ہی سوچنا چاہتا تھا لیکن اس روز اسے کیا ہوا تھا جو اسے کہہ آیا تھا کہ وہ اپنی مفرور رپورٹ کسی اونچے میگزین میں شائع کروائے گا جس کی سرکولیشن ''اون لکر'' سے کہیں زیادہ ہوگی۔ وہ یہ بات کہنے کے بعد کئی بار پچھتایا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ وہ مہرین سے جا کر معذرت کر لے گا مگر اب تک اپنی سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔ نہ جانے کیوں مہرین کے سامنے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ وہ غلط کہہ رہا تھا، اسے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

''چلو کبھی ہماری محنت ٹھکانے لگ گئی اور ''اون لکر'' کی سرکولیشن میں اضافہ ہو گیا تو مہرین سے کہوں گا کہ جب ''اون لکر'' ہی بڑا میگزین بن گیا ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کسی اور میگزین میں اپنی رپورٹ چھپوانے کی۔'' اس نے ایک روز خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا تھا۔

.....

وہ سمیعہ سلطانہ تھی۔ اس کی اماں نے یہ نام بڑے چاؤ سے رکھا تھا۔ یہ نام ان کی ملک شام میں کچھ عرصہ گزارنے والی سہیلی نے بتایا تھا۔ سمیعہ نام انہیں بھی بہت پسند آیا تھا اور سلطانہ ساتھ اس لیے رکھا گیا تھا کہ ان کے بقول اسلامی نام دو ناموں کو اکٹھا کرنے سے مکمل ہوتے تھے۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اس نے کئی بار اپنے خاندان کے لوگوں کو کہتے سنا تھا۔ ''بڑا ماڈرن نام رکھا ہے بہن رشیداں نے بیٹی کا۔'' اور یہ کہنا بنتا بھی تھا۔ اس کی بڑی دونوں بہنوں کے نام روایتی سے تھے۔

ہاجرہ جو ہاجراں کہلاتی تھی اور صابرہ جو بروزن ہاجراں، صابراں کہلاتی تھی۔ اپنی دونوں بڑی بہنوں سے وہ عمر میں بھی کہیں چھوٹی تھی۔ درمیان میں تین بھائی تھے۔ سب سے چھوٹا بھائی اس سے چار سال بڑا تھا۔

''پچھلی عمر کی اولاد پر بندہ ویسے ہی سارے چاؤ پورے کرتا ہے۔'' کئی لوگ اس کی اماں کو

اس کی فراک سیتے اور بالوں میں خوبصورت پونیاں پہناتے دیکھ کر کہتے۔ اس کی بڑی دونوں بہنوں کی شادیاں بھی. س کے بچپن میں ہی ہوگئی تھیں۔ اسے ذرا ذرا ہی یاد تھا کہ ان کی شادیوں پر کیا ہوا تھا۔ بھائیوں کی وہ لاڈلی تھی سو جیسے بڑی بہنوں کے اسکول کالج کی پڑھائی پر پابندیاں لگی تھیں، بھائیوں کے بڑے ہو جانے اور کماؤ ہو جانے پر اس پر نہیں لگیں۔ وہ اپنی مرضی سے پڑھتی رہی تھی اور پڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی اماں کو اس کا بی اے فورتھ ایئر میں پڑھنے تک کا عرصہ بڑا لمبا لگتا تھا۔

''بڑی ذبردست بڑی ڈاڈھی پڑھائیاں ہیں بابا۔'' وہ اپنے ملنے ملانے والیوں سے کہتی تھیں مگر دل ہی دل میں انہیں فخر بھی محسوس ہوتا تھا کہ ان کی سمیعہ سلطانہ اتنی لائق تھی کہ آج تک کبھی کسی امتحان میں فیل نہیں ہوئی تھی جبکہ اردگرد کی ساری لڑکیاں ایک ایک جماعت میں دو، دو سال لگاتی رہی تھیں۔

''میں تو ابھی ایم اے بھی کروں گی۔'' وہ اکثر اماں کے کانوں میں اپنے ارادے ڈالتی رہتی تھی۔

''زیادہ پڑھ کے سمیعہ سلطانہ بندہ باؤلا ہی ہو جاتا ہے۔'' اس کی بڑی بھابی اپنے بچوں کی فوج میں سے ایک کو کندھے سے لگائے پھکتے ہوئے کہتی۔

''وہ جو لڑکا ہے آپا ہاجراں کی نند کا لڑکا، وہ جو اُدھر رہتا ہے ان کے گھر کی سیڑھیوں والے کمرے میں۔ سنا ہے بڑا پڑھا لکھا ہے پر آئے ہائے اس کا حال دیکھا ہے کیسے باؤلوں جیسا ہے۔ بھلا جس طرح پامشتاق اور اس کے بھائی اسے رکھتے ہیں ایسے کوئی رہتا ہے۔ اس ڈربے میں نہ اسے گرمی کا احساس ہوتا ہے نہ سردی کا۔ جب بھی کمرے میں ہوتا ہے کتاب آنکھوں سے لگائے پڑھتا ہی رہتا ہے۔ جھلا ہو گیا ہے پڑھ پڑھ کر۔''

سمیعہ فاطمہ اپنی بھابھی کے تبصرے اور زیادہ پڑھنے والوں کے خوفناک انجام کی سنا دنی سنتی رہتی تھی مگر اس کا ذہن کہیں اور ہی بھٹکا ہوتا تھا۔ اب وہ اپنی بھابی کو کیا بتاتی کہ آپا ہاجراں کے گھر رہنے والا وہ باؤلا سا لڑکا ہی تو اس کا آئیڈیل تھا اور اسی کو دیکھ دیکھ کر تو وہ اور، اور پڑھنا چاہتی تھی۔ اسی سے متاثر ہو کر تو وہ نہ جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر وہ چند صفحات پر مشتمل خراب سی پرنٹنگ والا رسالہ منگواتی تھی اور پھر اپنی انگریزی کمزور ہونے کے باوجود پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک اسے پوری عقیدت سے چاٹ ڈالتی تھی۔ پڑھنے کے بعد کتنے احترام سے وہ اسے گتے کے

ایک بڑے سے ڈبے میں جہاں اسی میگزین کے پرانے شمارے ترتیب سے رکھے ہوتے تھے رکھ دیتی تھی۔ اسے گتے کا وہ ڈبا کتنا عزیز تھا کون جانتا تھا۔

''وہ کتنا لائق اور ذہین ہے تم کیا جانو۔'' وہ دل ہی دل میں اپنی بھابی کو مخاطب کر کے کہتی تھی اور تو وہ ایسی بات کسی سے کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے پڑھے لکھے ہونے، اچھی شکل وصورت اور بھائیوں کی کمائی کے بل پر بنے اس اونچے دو منزلہ پختہ مکان کی وجہ سے اس کے لیے ایک کے بعد ایک رشتہ تواتر سے چلا آتا تھا جنہیں وہ مذاق میں اڑا کر مسترد کرتی چلی جا رہی تھی۔

''لڑکے کی یہ بڑی دکان ہے اپنی سوہے بازار میں۔'' اس روز بھی رشتہ کرانے والی عورت کو اماں سے باتیں کرتے اس نے سن لیا تھا۔

''توبہ توبہ!'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی منجھلی بھابی قریب ہی بیٹھی تھیں۔ ''مغل بچہ ہو کر سناروں والے کام کرتا ہے۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے اسے شاہی قلعے یا شالامار باغ کے کسی تخت پر بیٹھ کر تالیاں بجا بجا کر خادمین کو بلانا چاہیے۔'' اس کی نکتہ چینی والی عادت پر منجھلی بھابی نے جل کر کہا۔ ''صاحبزادی کے مزاج ہی نہیں ملتے اور پڑھوں گی اور پڑھوں گی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بھائی ہیں کہ مارے لاڈ کے جو کہتی ہے، کیے چلے جاتے ہیں۔ نہ اس کی شادی ہونی ہے نہ ہمارا چولہا چوکا علیحدہ ہونا ہے۔ ساری عمر گزر جائے گی اتنے بڑے ٹبر کا کھانا پانی کرتے کرتے۔''

مگر سمیعہ فاطمہ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کی ذات کی وجہ سے کون کتنا خوش تھا اور کون کتنا ناراض تھا۔ اسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس نے اتنا پڑھنا ہے اور خود کو اس مقام پر لے جانا ہے جہاں آپا ہاجراں کے گھر والے حسن کمال کی نظر خود اس پر پڑے اور وہ چونک کر رہ جائے اور اسے احساس ہو کہ اس کی اس مامی کے میکے میں کیسا گوہر نایاب موجود تھا۔ وہ خود محسوس ہونا چاہتی تھی جب ہی آج تک اس نے حسن کمال کا سامنا ہونے پر بھی کبھی زیادہ باتیں بگھاری تھیں نہ ہی ادائیں دکھائی تھیں کیونکہ اتنا اسے معلوم تھا کہ وہ ان دونوں ہی چیزوں سے متاثر ہونے والا شخص نہیں تھا اس لیے وہ کچھ ایسا کرنا چاہتی تھی جس کے بعد حسن کمال اس سے خود پوچھے۔

''سمیعہ فاطمہ! تم اب تک کہاں چھپی ہوئی تھیں۔'' اور وہ یقیناً اپنے اس خواب کو تعبیر دینے

کی خاطر خوب محنت کر رہی تھی۔

.....

''میں کرن فاطمہ ہوں۔'' مہرین نے اس آواز پر کام کرتے کرتے سر اٹھایا۔ بائیس تئیس سال کی ایک خوش شکل لڑکی اس کی میز کے قریب کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور دفتر کے اس واحد کمرے میں جو بیک وقت ہر سیکشن کا کام دیتا تھا، کوئی دوسرا بندہ موجود نہیں تھا جب ہی لڑکی سیدھی اس کے پاس آ گئی تھی۔

''جی فرمایئے!'' اس نے قلم بند کر کے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں کرن فاطمہ ہوں۔'' اس نے اپنا نام دُہرایا۔ ''میں نے ایم ایس سی کیا ہے سائیکالوجی میں۔'' اس نے کچھ کاغذات اس کے سامنے رکھے۔ مہرین نے پہلا صفحہ پڑھنا شروع کیا جو ایک درخواست پر مشتمل تھا۔ اس کا مضمون بھی بڑا روایتی سا تھا۔ کسی باوثوق ذرائع سے درخواست گزار کو معلوم ہوا تھا کہ میگزین کو ایک محنتی، دیانتدار، کام کو سمجھنے والے ورکر کی ضرورت تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ ان تینوں شرائط پر پوری اترتی تھی۔

''یہ باوثوق ذریعہ کون سا ہے بائی دا وے؟'' مہرین نے درخواست پر سے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جبکہ ہم نے تو ایسا کوئی اشتہار نہیں دیا میرے خیال سے۔''

''اوہ!'' لڑکی کے ہونٹ گول دائرے کی شکل میں سکڑے۔ وہ جھجک سی گئی۔ ''دراصل مجھے درخواست کی صرف یہی شکل آتی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ درخواست ایسے ہی دی جاتی ہے۔''

''چلیں چھوڑیں خیر!'' مہرین نے کاغذات ایک طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتایئے کہ آپ کیسے آئیں؟''

''خیر!'' لڑکی نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ گود میں دھرے۔ ''اب یہ بتانے کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں۔''

''کیوں، اب کیا ہو گیا؟'' مہرین مسکرائی۔

''اب تو آپ نے بتا ہی دیا کہ آپ کو کسی بندے کی ضرورت ہے نہ آپ نے کوئی اشتہار دیا ہے۔'' لڑکی کے لہجے میں مایوسی رہ رہ کر چھلک رہی تھی۔

''دراصل یہ ایک چھوٹا سا پرچہ ہے کم سرکولیشن والا لہٰذا ہمیں زیادہ کام کرنے والوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔'' مہرین نے گھسا پٹا جملہ دہرایا۔ یہ شاہکار جملہ اس نے کئی ایسے آنے

والے لوگوں کے سامنے بولا تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' لڑکی نے اسی ہارے ہوئے انداز میں کہا۔ ''آپ کا ایڈیٹوریل فیچرز، فیشن پیجز، نیوز آف دی ورلڈ اور خاص طور سے شوبزنس کی خبریں، شارٹ اسٹوری، خطوط کے جوابات، آسٹرولوجی کے صفحات، انٹرویوز، آپ کی رپورٹس سب دو ہی لوگوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔''

''وہ دو لوگ کون ہیں؟'' مہرین نے قلم اٹھا کر دانتوں تلے دباتے ہوئے پوچھا۔ ایسا اس نے یقیناً اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے کیا تھا۔

''ایک آپ خود اور ایک حسن کمال۔'' اس نے کمال صاف گوئی سے کام لیا۔ ''اور.....'' پھر وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''اور کیا؟''

''اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ کا سارا میٹریل کسی خاص کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔''

''اچھا!'' مہرین نے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا جیسے اس کی معلومات کو سراہ رہی ہو۔ ''پھر یہ کیا ہوتا ہے؟''

''بس ادھر اُدھر کے چھاپے، انٹرنیٹ کی مہربانیاں اور چند لفظ اپنے قلم سے نکلتے ہیں۔''

''پھر تو ہم میں کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ نہ مجھ میں کوئی خوبی، نہ حسن کمال میں کوئی کمال پھر آپ کی یہاں آمد عجیب سی بات ہے۔''

''ہوں!'' لڑکی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''دراصل مجھے شوق ہے کچھ خاص کام کرنے کا۔ عام سے کام تو بہت لوگ کر رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنے خصوصی ٹیلنٹ کو استعمال کر کے ''اون لکر'' کو اس مخصوص انداز سے باہر نکالوں۔ میں اس کا امیج بہتر کرنا چاہتی ہوں۔''

''آپ کی سوچ بڑی مثبت ہے اور ہم اس کو سراہتے بھی ہیں مگر افسوس ہم اپنی ساری خامیوں اور کنویں کے مینڈکوں والے طرزِ عمل کے باوجود مالی طور پر اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ایک اور کام کرنے والا افورڈ کر سکیں اس لیے میں معذرت خواہ ہوں۔'' مہرین نے اس کی تلخ بات کا برا منائے بغیر انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

''ٹھیک کہتے تھے میرے چاچا میاں۔'' اس نے اپنے گھٹنے پر انگلیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں لوگ انسانوں کو تولا نہیں کرتے گنا کرتے ہیں۔'' پھر وہ بیگ کندھے پر ڈال کر اٹھی اور اپنی

درخواست اور کاغذات مہرین کے سامنے سے اٹھا لیے۔ ”ویسے۔“ جاتے جاتے وہ مڑی۔ ”میں کسی معاوضے کی خاطر نہیں، بلا معاوضہ کام کرنے کے خیال سے یہاں آئی تھی کیونکہ دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کا عملہ ہر لحاظ سے مکمل ہے اور آپ مالی طور پر کوئی نیا بندہ افورڈ نہیں کر سکتیں۔“

”والینٹئر!“ مہرین نے میز کی سطح پر ہاتھ مارا۔ ”یوں کہو نا شیک ہینڈز!“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔“

”بڑی مادیت پسند دنیا ہے بھئی۔“ وہ واپس آتے ہوئے بولی۔ ”میرے چامیاں یہی کہتے تھے کہ یوں کہو گی تو شاید بات بن جائے۔“

”کیا مطلب؟“ مہرین نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ بات تم نے صرف برائے بات کہی تھی۔“

”نہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میرے الفاظ سچے تھے اور میں خلوص دل سے آئی تھی۔“ وہ میز کی سطح پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

”مگر یہ تمہاری فیلڈ نہیں ہے۔ تم نے ماسٹرز کیا ہے......“ مہرین نے یاد کراتے ہوئے ایک بار پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”سائیکالوجی میں۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو فیلڈ انسان اپنانا چاہے وہ اس کی ہو جاتی ہے۔“

”آج کل سپیشلسٹس کا دور ہے۔ یہ اتنے سارے میدان، اتنے سارے ڈپارٹمنٹس، یہ اتنے سارے شعبے یوں ہی تو نہیں بن گئے۔“

”ہر برانچ کی ایک سب برانچ بھی تو ہوتی ہے۔“ وہ فوراً بولی۔ ”ماس کمیونیکیشن ایک ڈپارٹمنٹ ہے۔ اس میں بھی کئی شعبے مزید ہیں اور آپ دو لوگ سب شعبوں کو کور کر رہے ہیں۔ اگر یہ ہو سکتا ہے تو پھر میں جو سمجھتی ہوں کہ آپ کی فیلڈ سے متعلق نہ ہونے کے باوجود شاید آپ دونوں سے بہتر کام کر سکتی ہوں۔ مجھے کام دینے میں اتنا عذر کیوں ہے آپ کو؟“ مہرین اس کے لہجے کی مضبوطی، اعتماد اور اس کی صاف گوئی سے متاثر ہوئی۔

”آپ نے میرے مکمل کاغذات دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ میری تمام اسناد کی فوٹو کاپیز کے علاوہ ان میں ایک کاغذ ایسا بھی ہے جس میں، میں نے آپ کے ہاں چھپنے والے ایک آرٹیکل

Chitral, a Travelogue کے الفاظ اور جملوں کو درست کر کے دوبارہ سے لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس سے کہیں بہتر ہے جو آپ کے حسن کمال صاحب نے لاہور میں بیٹھے بیٹھے ادھر اُدھر کے چھاپے مار کر مکمل شکل دیتے ہوئے چترال کی سیر کرانے کی کوشش کی ہے۔“

”گریٹ!“ مہرین نے اس صفحے کی چند لائنیں پڑھ لینے کے بعد ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ لڑکی میں ٹیلنٹ تھا اور خصوصاً جب وہ بلا معاوضہ کام کرنے کو تیار تھی تو مگر اسے اپنا اور پرچے کا کچھ بھرم بھی رکھنا تھا۔

”آپ ایسا کریں اپنے کاغذات ادھر جمع کروا جائیں۔ یہ ہمارے ریکارڈ میں آ جائیں گے۔ ہم آپس میں بات کر کے پھر آپ کو آگاہ کر دیں گے۔ ساتھ میں یہ درستگیاں بھی چیک رکھ لیں گے۔“ اس نے بظاہر ایک ذمے دار ایڈیٹر کی طرح کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ اچھی طرح تسلی کر لیجیے۔ یہ آپ کا حق بھی ہے۔“ وہ ایک دفعہ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اور ایک بات۔“ اسے پھر کچھ یاد آ گیا۔ ”میں جانتی ہوں کہ میں لوگوں کے نفسیاتی مسائل کے حل آپ سے بہتر بتا سکتی ہوں۔“

”میں خالی دعووں پر یقین نہیں رکھتی۔“ مہرین کو یکدم احساس ہوا کہ وہ اس لڑکی کی ساری شیخیوں سے متاثر ہی ہوتی چلی جا رہی تھی اور اس کی اپنی شخصیت کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔

”بلکہ میں دعووں پر ہی سرے سے یقین نہیں کرتی۔ میرا خیال ہے کہ انسان اگر کچھ کر سکتا ہے تو بجائے دعوے کرنے کے اسے عملاً ثابت کرنا چاہیے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ دعویٰ کرے اور پھر اس کو سچا ثابت کر کے دکھائے۔“ وہ اسی اعتماد سے بولی۔

”ہمارے اسکول آف تھاٹ میں بنیادی اختلاف ہے۔“ مہرین نے فوراً بات گھڑی۔

”یہ اور بھی اچھا ہے۔ جہاں اختلاف رائے ہوتا ہے وہاں نتیجہ بہتر ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ باقی باتیں ہم اس وقت کریں گے جب ہماری دوبارہ ملاقات ہو گی۔“ اب کے مہرین نے اسے حتمی طور پر چلے جانے کا اشارہ دیا تھا۔

”یقیناً!“ وہ ہنسی۔ ”اور مجھے امید ہے کہ ایسا اس وقت ہو گا جب آپ کا بورڈ مکمل ہو گا جس میں ایک آپ ہوں گی، ایک حسن کمال۔ ویسے تو آپ کے میگزین کے پہلے صفحے پر ناموں اور

شعبوں کی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے جس میں کنسلٹنٹ ایڈیٹرز، کنٹری ہیڈ ایڈیٹرز سے لے کر فیشن کنسلٹنٹ، ایڈورٹائزنگ منیجرز اور آرٹ ایڈیٹرز وغیرہ وغیرہ کی مد میں مختلف نام درج ہوتے ہیں جو میں جانتی ہوں کہ سارے کے سارے فیک ہوتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ ہر مد میں یا اپنا نام لکھا کریں یا حسن کمال کا۔''

''آپ کے مشورے کا بہت شکریہ! آپ اب اس وقت تشریف لائیے گا جب ہم آپ کو بلائیں گے۔'' مہرین نے دل میں کڑھتے ہوئے بظاہر بہت خوش دلی سے کہا۔

''اور ایسا میرا خیال ہے کہ شاید ہی ہو۔ دراصل میں اپنے منہ پھٹ ہونے کی خراب عادت کی وجہ سے آپ کو اتنا ناراض کر چکی ہوں کہ آپ میرے والے Travelogue کو پسند کر لینے کے باوجود مجھے کبھی نہیں بلائیں گی۔ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیں گی کہ میں نے بلا معاوضہ کام کرنے کی پیشکش کی ہے۔'' وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

''یقیناً آج کا دن باقی دنوں سے مختلف ہے۔'' اس کے جانے کے بعد مہرین نے گہرا سانس لیتے ہوئے سوچا۔ ''لڑکی تھی کہ پٹاخہ، جو منہ میں آیا اس نے بک دیا۔ بھلا اگر تم سارے فیکلٹس سے آگاہ ہو تو کرنے کیا آئی ہو یہاں۔'' اس نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

''والنٹیئر!'' پھر اسے یاد آیا۔ ''بلا معاوضہ!'' اس نے دُہرایا۔ ''ہاں یہ البتہ قابل غور بات ہے۔'' اور پھر اس کے تمام کاغذات نکال کر ایک کے بعد ایک غور سے دیکھنے لگی۔ اس کا تعلیمی پس منظر اچھا تھا۔ وہ ہمیشہ اچھے نمبر لے کر پاس ہوتی رہی تھی۔ اس نے اچھے اداروں سے پڑھا تھا۔ اس کی لکھائی اچھی تھی اور انگریزی زبان پر عبور بھی حاصل تھا۔ حسن کمال کے سفرنامے کی درستگی بھی اس نے کمال کی کی تھی۔

''چلو کچھ اور نہ سہی حسن کو چڑانے کا خوب موقع ہاتھ آیا ہے۔'' اس نے سوچا اور وہ صفحہ الگ کر کے رکھ لیا۔

''چلو یہ تو تقریباً طے ہے کہ اس لڑکی کو ہم ایک دفعہ انٹرویو کے لیے ضرور بلائیں گے۔ حسن بھی ہوگا اور میں بھی، خوب ایڈونچر رہے گا۔ یہ آج بغیر اطلاع آئی اور مجھے زچ کرتی رہی۔ اب میں باقاعدہ تیاری کے ساتھ اس کو زچ کروں گی۔'' اس نے فیصلہ کیا اور لڑکی کی فائل اہم کاغذات کے ساتھ لاکر میں رکھ دی۔

دوسری طرف یہ دن کرن فاطمہ کے لیے بھی ایڈونچرس تھا۔ وہ میاں کو چیلنج کر کے اکیلی

''اون لکر'' کے دفتر گئی تھی۔ بلا خوف بولتی رہی اور واپسی پر اس یقین کے ساتھ اس نے گھر تک کا سفر طے کیا تھا کہ وہ اپنا اثر پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

.....

''انسان کی ترجیحات میں کیا کیا شامل ہو سکتا ہے؟'' سمیعہ سلطانہ نے خود اپنے آپ سے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ اسے معلوم تھا اس کے گھر میں اس کے ساتھ اس قسم کی باتیں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ ''بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک پڑھے لکھے ماڈرن انسان کی ترجیحات میں کیا کیا شامل ہو سکتا ہے۔'' اس نے آنکھیں میچ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اس کی اپنی دنیا ٹی وی کے ڈراموں، رسالوں، کالج لڑکیوں کی گپ شپ سے ملنے والی ادھر اُدھر کی معلومات پر مشتمل تھی۔ اپنے گھر کے ماحول اور لوگوں سے وہ ذہنی طور پر قطعی غیر متعلق تھی اور اسے ان کے مسائل اور خوشیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

''اچھا گھر، اچھا پہناوا، بہت سا پیسہ، دنیا بھر کی سیر۔'' اس نے دل میں گنا اور مسکرا دی۔

''اور سب سے پہلے ترجیح ہم مزاج من پسند ساتھی۔'' یہ بات سوچتے ہی اس کے پردۂ ذہن پر ایک شبیہہ ابھری۔

''اوہ اگر من پسند ساتھی کے ساتھ باقی ترجیحات نہ مل سکیں تو؟'' اس نے تصور کیا اور پھر جھرجھری لے کر ذہن سے یہ بات جھٹک دی۔

''ضروری ہے انسان تلخ باتیں ہی سوچے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ انسان کچھ دیر اپنی من پسند سوچ کے ساتھ آرزوؤں کی دنیا میں رہ لے۔'' وہ کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی نظر اپنی گود میں دھری انگلش کی کتاب پر پڑی جس کے ساتھ ہی وہ حقیقت کی دنیا میں آ گئی اور اسے یاد آ گیا کہ من پسند ساتھی کو پانے کے لیے پہلی بڑی شرط بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونا تھا جس پر پورا اترنے کے لیے اسے آنے والے امتحان میں نمایاں نمبر حاصل کرنا تھے۔ اس کے بعد ہی اسے کسی ڈھنگ کے مضمون میں ایم اے کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ وہ حقیقت کی دنیا میں پوری طرح آن موجود ہوئی اور زور شور سے نوٹس رٹنے لگی۔

.....

''اور تو کچھ نہیں۔ اس لڑکی کا میرٹ ہی یہ ہے کہ اس نے حسن کمال کے مضمون کی درستگی کر دی جب ہی میڈم اس کی اتنی طرف داری کر رہی ہیں۔'' جہانگیر جو کافی دیر سے کمپیوٹر پر بیٹھا بظاہر اپنے کام میں معروف تھا مگر حقیقت میں مہرین اور حسن کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا جو

دفتر میں آنے والی ایک لڑکی کی نوکری کے لیے درخواست کے متعلق تھی۔

''خوب!'' حسن نے اب کے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''چلو اس سے یہ تو پتا چلا کہ میرٹ کی سیڑھی کا ایک ڈنڈا میں بھی ہوں۔''

''اس کا ایک ڈنڈا تو آپا شمیم بھی ہے۔'' جہانگیر نے دانستہ طور پر دفتر کی صفائی کرنے والی خاتون کا نام لیا۔ ''اب اگر اس مد میں کوئی درخواست آنے لگی تو اسے آپا شمیم کے پیانے پر ہی ناپا جائے گا نا۔''

''سارے چریوں اور احمقوں کو یہی کام یاد رہ گیا کرنا۔ صحافت میں ٹانگ اڑالیں چاہے الف کا نام ب نہ آتا ہو صحافت۔'' حسن اس کے اس کمنٹ پر طیش میں آگیا۔

''جو بھی کہو حسن، لڑکی تھی کمال۔ اس میں پوٹینشل بھی بہت نظر آرہا تھا۔'' مہرین نے متانت سے کہا۔

''تو اسے جانے کیوں دیا۔ اسی وقت اس سیٹ پر بٹھا دیا ہوتا۔'' حسن نے اپنی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب دیکھو نا پرچے کے سارے ٹریڈ سیکرٹس تو پہلے سے ہی وہ جانتی ہے تو پھر اسے اپنے ساتھ ملا لینے میں۔'' مہرین اس کے طیش کو دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔

''مثلاً؟'' وہ حسب عادت ناخن کترنے لگا۔

''مثلاً یہ کہ میرے ساتھ جو ایک شخص اس بورڈ کا ہر کام کرتا ہے وہ موجود نہیں تھا۔ اس سے یہ معاملہ میں نے ڈسکس نہیں کیا تھا نہ ہی اس نے لڑکی کو دیکھا اور جانچا تھا پھر میں کیسے اسے نوازرکھ لیتی۔''

''وہ شخص تو اپنا میرٹ اسی وقت کھو بیٹھا تھا ایڈیٹر صاحبہ!'' حسن نے ایک بار پھر اپنے آرٹیکل کی تصحیح والا کاغذ پڑھنا شروع کیا۔ ''کیا محض الفاظ بدل دینے سے بات بدل جاتی ہے؟'' اس نے سوالیہ انداز میں مہرین کو دیکھا۔ ''انگریزی کی لغت میں خاتون ایک معنی والے کئی مرتبہ تو پچاسیوں الفاظ مل جاتے ہیں۔ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے جو مناسب سمجھو استعمال کرلو۔ صحیح نہیں ہے محض الفاظ کا ردوبدل ہے اگر تم غور کرو تو۔''

''چلو جیسے تم کہتے ہو وہی صحیح ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ ضرور اس لڑکی کو بلانا چاہیے۔'' مہرین نے اپنے دل کی بات کہی۔

''اس کا تو تم پہلے ہی فیصلہ کرچکی ہو۔ صلاح مشورہ تو محض کارروائی ہے۔'' حسن نے شانے

اچکا کر کہا اور اپنی سیٹ کی طرف چل دیا۔ جہانگیر نے مانیٹر سے نظریں اٹھا کر ذرا دیر کے لیے مہرین کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ اسے ان دونوں کی اس بحث میں سے کچھ بھی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آتا تھا۔

.....

''بس میں نے بھی اس دن کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ان خاتون ایڈیٹر کو زچ کرنے میں اسی لیے تو میری والنٹیری بھی کام نہیں آئی اور میرے لیے وہاں سے بلاوا نہیں آیا۔'' کرن فاطمہ نے لائف اسٹائلز آف سلیبرٹیز کی آخری لائنیں سنانے کے بعد چامیاں سے اپنے دل کی بات کی۔ یہ وہ بات تھی جو وہ پچھلے کئی دنوں سے دل میں کئی بار دہرا چکی تھی۔

''اپنی حماقت کا خود ہی اعتراف کرنے کے بعد بھی ابھی تک انتظار میں ہو۔'' چامیاں مسکرائے۔

''انتظار اور امید تو انسان کو کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔'' کرن نے پکڑے جانے پر انتظار کرنے کا بھی اعتراف کرلیا۔

''انتظار تو بڑی تکلیف دہ صورت حال ہوتی ہے بھتیجی! اس کی اذیت سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''میرا مسئلہ ہی یہ ہے کہ چامیاں کہ مجھے تکلیف دہ صورت حال سے گزرنے کی عادت ہو گئی۔'' کرن فاطمہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''جبھی تکلیف دہ صورت حال بار بار ہم ہی سے آکر ٹکراتی ہے۔'' چامیاں کی بے نور آنکھیں سامنے ٹکی ہوئی تھیں۔

یکدم کرن کو گزرے کئی سال یاد آنے لگے۔ بابا جان کی وفات، چامیاں کا ایکسیڈنٹ جس میں وہ اپنی آنکھیں اور ٹانگیں گنوا بیٹھے تھے۔ امی کی بیماری، عمیر بھائی کی کسی مقام تک پہنچنے کی لمبی اور سخت جدوجہد۔ ''اوہ'' اس نے جھرجھری لی۔ ''سچ ہے ایک عرصے کی تکلیف کے بعد راحت انسان کا مقدر ضرور بنتی ہے۔'' اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ آرام دہ، سجا سجایا کمرا، چھوٹا سا گھر تقریباً تمام آسائشات سے مزین تھا۔ کھانے، پہننے، اوڑھنے، ملنے ملانے سب کچھ کے لیے اچھا میسر تھا۔ ایک ٹھیک ٹھاک پرآسائش زندگی جو بے شمار صبر آزما اور تکلیف دہ لمحوں سے گزرنے کے بعد وجود میں آئی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ یہ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی جبھی اس نے گزرے وقت کو کبھی یاد نہیں کیا تھا مگر گزرا وقت اتنا ظالم تھا کہ قدم قدم پر خود ہی اسے اپنی یاد دلا

جاتا تھا خصوصاً جب وہ چامیاں کو کچھ سنا نے بیٹھی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جو میر و غالب کا رسیا تھا۔ شیکسپیئر اور ٹالسٹائی کا قاری اور دنیا بھر کی تمام زبانوں کے ادب اور تاریخ چاٹ ڈالنے کا عادی تھا۔ وہ سفر کرنے اور لوگوں سے ملنے ملانے کے کتنے رسیا تھے۔ انہوں نے ماؤنٹین ٹریکر کی حیثیت سے شمالی علاقہ جات کے جانے کون کون سے چپے اور چوٹیاں سر کر ڈالی تھیں۔ مہم جو اور تجسس پسند چامیاں کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی جو اونچی اونچی چوٹیاں سر کرنے والا ایک عام سی سڑک عبور کرتے کرتے لڑکھڑا کر ایک تیز رفتار ی گاڑی کا نشانہ بن گیا تھا۔ کیسا شدید اور خوفناک حادثہ تھا وہ جس میں ان کے بچنے کی بھی کوئی امید باقی نہیں تھی مگر شاید قدرت ان سے اپنی بیوی کے علاوہ بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجے بھتیجی کی سرپرستی کا کام لینا چاہتی تھی سو وہ زندہ بچ گئے۔

مگر یہ اور زندگی تھی جس میں محتاجی تھی اور سہارے کی حاجت۔ وہ لمحے بھی کیسے صبر آزما تھے مگر بہادر، پرعزم چامیاں اس سے بھی گزر گئے تھے اور اب تو وہ انگلیوں کے لمس اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے ہی چیزوں کی سطح اور چہروں کے تاثرات کو بھانپ جاتے تھے۔ باقی کی مدد ان کی پیدائشی تیز حسیات کر دیتی تھیں جو یوں اندھیروں کی دنیا میں رہتے رہتے اور بھی قوت پکڑ چکی تھی۔

''زندگی ابھی ختم نہیں ہوئی بھتیجی! زندگی یقیناً موجود ہے اور اپنے تسلسل سے گزر رہی ہے۔'' وہ اکثر کرن فاطمہ کو یاد دلاتے تھے۔

''مگر زندگی کا قرینہ، اس کے رنگ ڈھنگ بدل گئے ہیں۔ یہ وہ زندگی تو نہیں جو آپ گزارا کرتے تھے چامیاں۔'' وہ دل میں کہتی۔ ''زندگی بے شک ہے مگر اس کے تسلسل میں زمین آسمان کا فرق آ گیا ہے۔''

.....

''میرے ابا نے دو بندے قتل کیے ہیں دو، ایک گامانائی دوسرا بشیر اموچی۔ پہلے گامے نائی کو قتل کیا پستول کی گولی سے ٹھاہ کر کے پھر بشیرے موچی کو مارا کلاشن کوف چلا کر تڑ تڑ تڑ تڑ۔'' سلمان مقصود حسب عادت اپنی زبان پر آنے والی ایک ہی بات دہرائے چلا جا رہا تھا۔ اس کی خدمت اور حفاظت پر مامور ملازم رحمت نے شام کے اخبار میں چھپی تصویریں دیکھتے دیکھتے ایک لمحے کو سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر دوبارہ اخبار کی طرف توجہ کرنے لگا۔ ''وہ قتل!'' اب سلمان مقصود دو انگلیاں نچا کر بتا رہا تھا۔ ''میں نے خود دیکھا گامانائی کرتا ہے آئے ہائے، پیٹ پکڑ کر گر گیا، لال لال خون نکلا اتنا ڈھیر سارا، بہت خون۔'' وہ شاید کسی کی توجہ نہ پا

کر خود اپنے آپ کو سنا رہا تھا اس لیے اس نے خود اپنے ساتھ مل کر ہی رونا بھی شروع کر دیا تھا۔

''بشیرا موچی جو تھا نا!'' پھر اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''بڑا ہی کمزور تھا، اتنا سا صرف اتنا سا۔'' اس نے شہادت اور بڑی انگلی کو چھوٹے سے دائرے کی شکل میں جوڑتے ہوئے کہا۔ ''اس کا خون بھی تھوڑا سا نکلا تھا مگر وہ بڑا تڑپا تھا ایسے۔'' وہ فرش پر لیٹ کر تڑپنے لگا۔ ''ایسے۔'' اس نے اپنے جسم کو ایک فٹ اوپر اچھالا اور نیچے گر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''پھر وہ ایسے مر گیا۔''

''پھر پڑ گیا دورہ؟'' رحمت کا ساتھی شریف اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ادھر آیا تو سلمان کو دیکھ کر اس سے پوچھنے لگا۔

''بس جی۔'' رحمت نے سر جھٹکا۔ ''دن میں دس دفعہ پڑتا ہے یہ دورہ، دس دفعہ یہ کہانی سناتا ہے۔''

''ابے نے قتل کیے بھی ہیں تو بھی دھڑا تا پھرتا ہے اور یہ ہے کہ اسے قتل بھولتے ہی نہیں۔'' شریف نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے کندھے پر رکھے کپڑے کو اتار کر اپنے جوتے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''لاکھ دفعہ دھندائے باہر، یہ جو بدقسمتی ہے نا شریف اس سے بڑی بھی کوئی بدقسمتی ہے۔'' رحمت نے سلمان کی طرف اشارہ کیا جو شریف کو دیکھ کر کپڑے جھاڑتا ہوا فرش سے اٹھ رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

''تمہیں پتا ہے میرے ابے نے نا دو قتل کیے ہیں!'' اس نے شریف کو مخاطب کرتے ہوئے دو انگلیاں نچائیں۔ ''دو قتل ایک ٹھاہ کر کے، دوسرا تڑ تڑ تڑ کر کے۔ ایک کا اتنا خون نکلا۔'' اس نے دونوں بازو پھیلائے۔ ''ایک کا بس اتنا۔'' اب کے اس نے چٹکی بجائی۔ ''ایک پیٹ پکڑ کر گرا، دوسرا یہ والا سینہ پکڑ کر مگر میرے ابے کو کچھ نہیں ہوا۔'' وہ ہنسنے لگا اور اس کے خوفناک قہقہے کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

.....

''جی تو کرن فاطمہ! کیسی ہیں آپ؟'' مہرین نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کیسے۔'' اس نے کمرے کی چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ اس روز جب وہ پہلی مرتبہ یہاں آئی تھی تو کمرے میں صرف مہرین موجود تھی۔ آج دو لوگ

اور بھی تھے۔اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ان میں سے حسن کمال کون سا ہوسکتا تھا۔کمپیوٹر پر بیٹھا لڑکا یا دوسری ٹیبل پر بیٹھا وہ شخص جو قلم ہاتھ میں پکڑے بظاہر کچھ لکھتا ہوا نظر آرہا تھا۔

''ہم نے آپ کو شارٹ لسٹ کیا ہے ہی ویز کی اس بھرمار میں سے۔'' مہرین نے ایک طرف کورے کی طرح رکھے فائلوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ تو آپ کو کرنا ہی تھا۔میں نے بلا معاوضہ کام کرنے کی جو بات کی تھی۔'' کرن نے دل میں سوچا اور بظاہر مسکرادی۔

''مگر ہم پہلے یہ اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ آپ کون سے ایریاز میرا مطلب ہے کہ کس کام کو زیادہ بہتر طریقے سے کرسکیں گی۔''

''جی!'' وہ سیدھی ہوئی۔

''حسن پلیز! آپ یہاں آسکیں گے۔'' مہرین نے بغیر کسی طرف دیکھے کہا۔کرن فاطمہ کے دل نے گننا شروع کیا۔ایک دو، تین۔اس کو زیادہ لمبی گنتی نہیں گننا پڑی۔وہ شخص آڑھی ترچھی لائنیں کھینچتا ترک کر کے اٹھ کر ادھر آگیا۔کرن نے محض ایک نظر ہی اس پر ڈالی اور دل ہی دل میں مایوس ہوئی۔بکھرے بال، بڑھی ہوئی شیو، شکنوں سے بھرپور لباس۔''اُف! کتنا بے ترتیب ہے۔'' اس نے سوچا۔

''یہ حسن کمال ہے۔'' مہرین نے تعارف کروایا۔''آپ اس روز انہی کے آرٹیکل کی تصحیح کر کے لائی تھیں نا۔''

''تصحیح کیا تھی، وہ لفظوں کا ہیر پھیر تھا محض۔'' وہ فوراً بولا۔

''وہ کیسے؟'' کرن نے بے ساختہ پوچھا۔جواب میں اسے انگریزی لغت میں موجود ایک جیسے معنی رکھنے والے بہت سے الفاظ کی کہانی سننے کو ملی۔

''لکھنے والے کا کمال کیا ہے؟'' ساری کہانی سن کر کرن نے سوال کیا۔جواب میں مہرین اور حسن کمال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''اس کا کمال یہ ہے کہ جس سچویشن کو وہ بیان کررہا ہے اسے سب سے اچھے لفظوں میں کیسے بیان کرے۔الفاظ کا انتخاب ہی تو لکھنے والے کا اصل امتحان ہوتا ہے۔اسے لفظوں کا ہیر پھیر تو ہر گز نہیں کہا جاسکتا۔ہر شاعر غالب یا اقبال کیوں نہیں ہوتا؟'' اس کی طرف سے دوسرا سوال آیا۔

''کیونکہ ہر شاعر پر وہ خیال نہیں اترتا جو ان دونوں پر اترتا تھا پھر ہر شاعر شاید لفظوں کو وہ

روھم نہیں دے پاتا جیسے یہ دونوں دے سکتے تھے۔سو الفاظ تو یقیناً بہت سے ہیں مگر درست لفظ کا انتخاب ہی لکھنے والے کا نام بناتا ہے۔''

''فوہ!'' حسن کمال جو اس کی بات سننے کے ساتھ ساتھ ناخن بھی کتر رہا تھا بولا۔''محض الفاظ کی چک پھیریاں ہیں جو بندے کو بندے سے متاثر کرواتی ہیں۔''

''ایسا ہے کرن فاطمہ!'' مہرین نے ڈنگل کے آغاز سے قبل ہی بگل بجایا۔''ہم ایک لوسر کولیڈ پر چہ نکالتے ہیں۔ہمیں زیادہ کام کرنے والوں کی ضرورت اس لیے بھی نہیں ہے کہ ہمارا کام یونہی چل جاتا ہے۔یہ پرچہ کیا ہے محض شوق پورا کرنے کا بہانہ ہے جس پر اکثر پیسہ پلے سے لگتا ہے۔کبھی یہ خرچ پورا کرلیتا ہے کبھی نہیں لیکن آپ میں یقیناً ایسا کچھ ہے جس نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ آپ کی یہاں آمد یقیناً ثمر آور ثابت ہوگی اور پرچے کو ایک صحت مند رجحان ملے گا۔''

''آپ کی مثبت سوچ کا بہت شکریہ!'' کرن نے کن انکھیوں سے حسن کمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو یقیناً اس صورت حال سے خوش نہیں تھا۔پھر اس نے دل ہی دل میں مہرین کو بھی داد دی جو حسن کمال کے اتنے منفی رویے کے باوجود اس کا بھرم رکھتے ہوئے بات کرتے ہوئے مجھے کے بجائے ہمیں کا لفظ استعمال کررہی تھی۔

''جہاں تک بلا معاوضہ کام کرنے کا سوال ہے، آپ کی سوچ بہت اچھی سہی مگر ایسا ہوگا نہیں۔ہم یہاں بیٹھ کر جتنا کماتے ہیں، مل کر بانٹتے ہیں۔اس میں جتنا حصہ آپ کا بنادہ ضرور ملے گا۔'' مہرین نے کہا۔

''اس طرح تو کسی اور کا حصہ کم ہوجائے گا۔'' کرن نے ایک بار پھر حسن کمال کو کن انکھیوں سے دیکھا مگر اسے اندازہ ہوا کہ اس بات پر اس کا ردِعمل منفی نہیں تھا۔

''حسن! اب آپ کوئی بات کروگے؟'' مہرین نے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ شکاریات اور جرم وسزا کا شعبہ سنبھال لیں۔اس ماہ ان دو موضوعات پر کچھ لکھیے پھر ہی کنفرمیشن لیٹر آپ کو مل سکے گا۔''

''اپنے تئیں تم نے بہت مشکل کام مجھے سونپا ہے بچو! مگر تم نہیں جانتے کہ اس پر بھی میرے پاس کتنا مواد ہے۔'' کرن نے مسکرا کر سوچا اور اثبات میں سر ہلادیا۔

شازیہ پچھلے ایک سال سے ڈاکٹر عبدالصبور کے پاس ریسپشنسٹ کے طور پر کام کر رہی تھی۔ اس کے کام سے ڈاکٹر عبدالصبور سمیت ان کے پاس آنے والے کلائنٹس بھی خوش تھے۔ شروع شروع میں اس سے کئی غلطیاں ہو جاتی تھیں مگر ڈاکٹر عبدالصبور کی نیک فطری اور نرم دلی کے باعث اس کی روزی کا وسیلہ قائم رہا۔ ڈاکٹر عبدالصبور کا نام شہر کے ہی نہیں ملک کے چوٹی کے سائیکاٹرسٹ میں شمار ہوتا تھا اور ایک سال کے دوران شازیہ نے سمجھ لیا تھا کہ ایسا کیوں تھا۔ ڈاکٹر صبور اپنے کام کے معاملے میں بے حد ذمے دار اور ڈسپلنڈ تھے۔ اپنے کلائنٹس کے ساتھ ان کی ایسوسی ایشن بہت گہری ہوتی تھی۔ اپنے مریضوں کے ساتھ وہ جو بھی گفتگو کرتے تھے وہ ان کے اپنے کمرے اور دل میں رہتی تھی یا پھر ان ہی ڈیز پر جو ڈاکٹر صبور مریض کو فائل میں بند کر کے اپنے پرائیویٹ کیبنٹ میں رکھ دیتے تھے شازیہ کا خیال تھا کہ ان کے پچانوے فیصد کلائنٹس کی ذہنی صحت یابی میں پیشہ ورانہ مہارت کے علاوہ ان کی نرم گفتاری اور گفتگو کا سلیقہ بھی بہت اہم کردار ادا کرتا تھا۔ شازیہ کے سامنے خود اپنی مثال ہی تھی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ڈاکٹر صبور کے پاس کیسے آئی تھی۔ اس کا چچازاد سجاد جو قتل کے مقدمے میں گرفتار جیل کے اندر مجرموں کے سے دن گزار رہا تھا کی پیشی کی تاریخ تھی۔ لاہور سول کورٹس کے برآمدوں میں شازیہ کا آدھے سے زیادہ خاندان یہاں سے وہاں بکھرا پڑا تھا۔ وہ لوگ صبح سے ہی روٹی پانی ساتھ باندھے پیشی کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ سجاد نے اپنی تایا زاد بہن

کا قتل غیرت کے نام پر کیا تھا۔ اس کی تائی کے بھائیوں نے اس پر یہ مقدمہ کرایا تھا۔ سجاد آنکھوں دیکھا قاتل تھا، گواہ جو اس کے خلاف تھے خاصے مضبوط تھے اور اس کی بریت کی کوئی امید نہ تھی۔ ڈاکٹر عبدالصبور اس دن کورٹ میں کسی ایسے کیس کے سلسلے میں اپنا بیان ریکارڈ کروانے آئے ہوئے تھے جس میں نامزد ملزم ان کا کلائنٹ تھا۔

سجاد پیشی بھگت کر باہر نکلا تو اپنے خاندان کے سارے بزرگوں اور نوجوانوں کو دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔ ''بچا تو میں نے نہیں چاچا۔'' اس نے شازیہ کے باپ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''پر یہ سن لے کہ اس گھر کی ساری کڑیاں ہی بے حیا ہیں ایک لین (لائن) میں کھڑا کر کے گولیوں سے اڑا دے ان کو اور اس کو تو میں اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔'' اس نے شازیہ کی طرف دیکھا اور زمین پر تھوکتے ہوئے اپنے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھوں کی پروا نہ کرتے ہوئے پیچھے کھڑے کانسٹیبل کی رائفل چھین کر شازیہ پر تان لی۔

''مار دے اس کو بھی جنم جلیا..... جو تجھے اس سے ٹھنڈ پڑتی ہے تو مار دے اس کو بھی۔'' شازیہ کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر کانپتے ہوئے کہا۔ اردگرد پھیلی پولیس فورس حرکت میں آ گئی تھی۔ سجاد رائفل تانے کھڑا تھا اور اس کا خاندان اسے دم بخود دیکھ رہا تھا۔

''بھاگ جا شازیہ بھاگ جا۔'' اس کی ماں نے بلند آواز میں کہا مگر شازیہ کے پاؤں مارے خوف کے اس غیر متوقع صورت حال پر جیسے جکڑ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ سجاد گولی چلاتا پولیس کے کسی اہل کار نے اسے پیچھے سے دھکا دیا۔ وہ دو قدم آگے لڑکھڑا کر رکا۔ یہی موقع تھا جب شازیہ وہاں سے بھاگی تھی۔

''بے غیرتو، کتو، حرام کی اولادو! پکڑو اس کو۔'' سجاد کی گرجتی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی جو وہ اپنے دیگر کزنز کو للکارنے کی کوشش میں نکال رہا تھا۔ کورٹ کے احاطے سے باہر جو پہلی گاڑی شازیہ کے سامنے آئی تھی اس میں ڈاکٹر عبدالصبور بیٹھ رہے تھے۔ پیچھے بھگدڑ اور شور کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

''صاحب جی خدا کے واسطے صاحب جی، میری جان بچا لیں۔'' شازیہ کو علم تھا کہ سجاد نہ تو اس کے پیچھے بھاگ سکتا تھا نہ ہی اب وہ اس کا نشانہ بن سکتی تھی مگر چند لمحے پہلے اپنی جانب تنی رائفل اور موت کے خوف نے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔

''کیا بات ہے محترمہ، کیا مسئلہ ہے؟'' ڈاکٹر صبور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ مجھے گولی مار دے گا، اللہ کا واسطہ ہے صاحب جی۔'' شازیہ نے پیچھے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھیں۔'' ڈاکٹر عبدالصبور نے اس کی بات کی تصدیق کرنے کا بھی خیال نہیں کیا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ اسے لے کر سیدھے اپنے کلینک پر پہنچے۔ اسے انہوں نے اپنے حواس بحال کرنے کا پورا موقع دیا تھا۔

''مگر وہ تمہیں کیوں مارنا چاہتا تھا۔ تمہارا قصور کیا تھا؟'' انہوں نے اس کی بات سن لینے کے بعد کہا۔

''حمیرا میری بڑی گہری دوست تھی، جس لڑکے کے ساتھ انہوں نے اس کا تعلق جوڑا تھا وہ حمیرا کو پڑھنے کے لیے کتابیں لا کر دیتا تھا۔ وہ کتابیں میں بھی پڑھتی تھی اور اس سے بات بھی کر لیا کرتی تھی۔ وہ ہمارے ہمسایوں کا بیٹا تھا۔ سجاد حمیرا سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر حمیرا کسی طور بھی اس سے شادی پر راضی نہیں تھی..... وہ اس لڑکے سے..... ایسا کوئی تعلق قائم کرنے کی خواہش مند نہیں تھی۔ سجاد نے جھوٹی کہانی گھڑی اور اسے مار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ سب اس قتل کو ڈھک لیں گے مگر حمیرا کے ننھیال والوں نے اسے معاف نہیں کیا۔ اس ساری صورت حال کی جس کے نتیجے کے طور پر سجاد نے حمیرا کو قتل کیا میں واحد عینی شاہد اور گواہ ہوں۔ سجاد کو میرے اوپر..... یہی شک ہے کہ حمیرا کے ننھیال والوں کو میں نے ساری کہانی سنائی ہے..... جبھی وہ مجھے مارنے کے درپے ہوا۔'' شازیہ نے تفصیلی بات ڈاکٹر کو بتائی۔

''اب میں تمہارے والدین سے رابطہ کرتا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ۔ سجاد قید میں ہے اور تمام واقعات سن کر میرا تجربہ کہتا ہے کہ اسے پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکتا، وہ اب یقیناً تم پر ایسا حملہ کوئی نہیں کرے گا۔'' ڈاکٹر صاحب نے اسے تسلی دی پھر سجاد کے وکیل کے توسط سے اس کے والدین سے رابطہ کر کے اسے واپس بھیج دیا مگر پیچھے گاؤں میں اس کے تایاؤں اور چچاؤں نے اس کا اس کے والدین اور بہن بھائیوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ سجاد نے ان سب کو بتایا تھا کہ حمیرا کے ننھیال کو ساری کہانی سنا کر مقدمہ درج کروانے پر شازیہ نے اکسایا تھا۔

''وہ کرموں جلی تو مر ہی گئی تھی اسے کال کوٹھری میں پہنچانے کی ذمے دار شازیہ ہے۔'' سب برادری والوں کا فیصلہ یہی تھا شازیہ کے والدین کا موقف اس کے برعکس تھا، حمیرا کے ننھیال والوں نے بھی کئی لوگوں کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا کہ شازیہ سے ان کا کسی قسم کا رابطہ نہیں رہا مگر شازیہ اور

اس کے گھر والوں کو اتنا تنگ کیا کہ سجاد کے خلاف پھانسی کا فیصلہ ہونے پر ان لوگوں نے گاؤں چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت بھی ڈاکٹر عبدالصبور ان کے کام آئے جنہوں نے شازیہ کے والد کو زندگی میں کوئی کام پڑنے پر رابطے کی دعوت دے رکھی تھی۔ اس بڑے شہر میں وہ اپنی زمین، مال، مویشی فروخت کر کے آئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالصبور نے ان کے لیے رہائش کا بندوبست کروایا، شازیہ کے والد کو اپنے ایک دوست کے فارم ہاؤس پر سپروائزر لگوایا اور خود شازیہ کو اپنے ساتھ کلینک میں اپنی مدد کے لیے کام کرنے کی آفر کی تھی۔ ان سب کے نزدیک وہ فرشتہ صفت انسان تھے۔ شازیہ نے صرف میٹرک کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر صبور نے اسے اسپوکن انگلش اور پرسنیلٹی گرومنگ کے کورسز کروانے کے علاوہ مزید پڑھنے کے لیے بھی کہا اور یوں حادثاتی طور پر شازیہ کی زندگی کا ایک بالکل نیا باب شروع ہو گیا۔ وہ سب اس زندگی میں خوش اور مطمئن تھے اگرچہ انہیں پچھلی زندگی اور خاندان والوں کی یاد بہت ستاتی تھی۔

اس روز بھی شازیہ نے خود کو دیوار گیر آئینے میں دیکھتے ہوئے سوچا تھا کہ نیک ٹراؤزر اور شارٹ شرٹ پر گلے میں اسکارف ڈالے، اسٹیپس میں کٹے ہوئے بالوں اور نفاست سے کیے ہلکے میک اپ میں وہ اس لڑکی سے کتنی مختلف لگ رہی تھی جس پر ''سجاد'' نے رائفل تانی تھی۔ اس سے پہلے کی زندگی میں وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے ابا کے کھیتوں میں کام بھی کرواتی تھی۔ فصل بونے کے موقع پر دھان کی نپیری اگاتے ہوئے، گندم کی کٹائی کے موقع پر، جانوروں کے لیے چارا کاٹنے اور ان کا گوبر سمیٹنے، سبزیاں توڑتے اور انہیں ٹوکروں میں بھر کر منڈی بھجواتے ہوئے کبھی اس نے سوچا تھا کہ وہ ملک کے نامور سائیکاٹرسٹ کی ریسپشنسٹ بن جائے گی۔ وہ اپنی زندگی کی ہیئت کے یوں تبدیل ہونے پر حیران بھی تھی اور خدا کے حضور شکر گزار بھی۔ آئینے میں اپنا اچھی طرح جائزہ لے لینے کے بعد شازیہ واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے سامنے رکھی ڈائری دیکھی۔ اس روز کی تمام اپوائنٹمنٹس ڈاکٹر عبدالصبور بھگتا چکے تھے۔ اس وقت ان کا آخری کلائنٹ ان کے آفس میں بیٹھا تھا۔ شازیہ نے آخری شخص کے نام پر قلم پھیرا اور اس کے اگلے وزٹ کی تاریخ کے لیے تیر کا نشان بنایا۔ ''یہ باہر آئے گا اور پھر چھٹی۔'' اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔

اسی وقت کوئی تیزی سے بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا جس چیز پر شازیہ کی پہلی نظر

پڑی وہ آنے والے کے ہاتھ میں تھمی رائفل تھی۔ شازیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ''چاچا شریف کہاں گیا۔'' اس کا دھیان سیکورٹی پر متعین گارڈ کی طرف گیا پھر اس نے آنے والے کے پیچھے اندر داخل ہوتے تین چار مزید آدمیوں کو دیکھا ان میں سے ایک نے چاچا شریف کو کالر سے پکڑا ہوا تھا اور اسے آگے دھکیل رہا تھا۔ ''ڈاکو۔ ڈکیتی۔'' اس نے سوچا ''مگر یہاں تو کچھ بھی کیش کی صورت میں موجود نہیں ہے۔'' اسے دوسرا خیال آیا کہ ڈاکٹر صبور کے تمام مریض متمول اور اپر کلاس سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی فیس کی ادائیگی ڈاکٹر صبور کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جاتی تھی پھر یہ ڈاکو یہاں کیا لینے آئے تھے، شازیہ کو یہ سارا منظر دیکھ کر ایک بار پھر سجاد اور کچہری کا منظر یاد آ گیا۔

''کک، کیا بات ہے؟'' اسے یہ بھی یاد آیا کہ ڈاکٹر عبدالصبور نے اس مختصر عرصے میں اسے کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کی کیسی ٹریننگ دی تھی سو وہ خود پر قابو پا کر بولی۔

''ڈاکٹر سے ملنا ہے۔'' ان میں سے ایک نے رائفل کی نالی میں پھونک مارتے ہوئے کہا۔

''آج کے تمام اپائنٹمنٹس مکمل ہو چکی ہیں، آپ کسی اور روز کی اپوائنٹمنٹ لے لیں۔'' یہ سن کر کہ وہ ڈاکا ڈالنے کی نیت سے نہیں آئے تھے شازیہ کی جان میں جان آ گئی اور وہ اپنے پیشوارانہ انداز میں بولی۔

''اور یہ بات تو ہمیں اس لڑکے نے بھی بتائی تھی۔'' چاچا شریف کو کالر سے پکڑے آدمی نے اسی طرح کالر سے پکڑے پکڑے زمین سے دو انچ اوپر اٹھا کر کہا۔ ''یہ بھی تو دیکھیے کہ یہاں ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں۔'' شازیہ نے اپنی ذمے داری پوری کرنے کی کوشش کی۔ ''ویسے بھی ڈاکٹر صاحب بغیر اپائنٹمنٹ کے کسی سے نہیں ملتے۔''

''اصول وضوابط کی مامی۔'' رائفل والے آدمی نے آگے بڑھ کر دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''ہمارے لیے کوئی اصول ضابطہ نہیں ہوتا اور کیسے نہیں ملتا ڈاکٹر کسی سے، تو اسے بتا وہ آپ ہم سے ملے گا، نہیں ملے گا تو ہم خود اندر جانے کا راستہ ڈھونڈ لیں گے۔'' اس نے رائفل سیدھی شازیہ پر تان لی۔

''یا اللہ! اس گولی سے بچا لیا تھا اس گولی سے مروانے کے لیے۔'' شازیہ نے کانپتے ہوئے سوچا۔

''چل اسے بتا۔'' اب اس شخص نے انٹرکام کا ہینڈ سیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔

''ڈاکٹر صاحب، کچھ لوگ ہیں یہاں جو آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' شازیہ نے خود کو کہتے سنا۔ ڈاکٹر عبدالصبور اپنے کسی مریض کے ساتھ سیشن کے دوران ڈسٹرب کیے جانا قطعی پسند نہیں کرتے تھے۔ توقع کے مطابق وہ اس ڈسٹربنس پر ناراض ہوئے۔ شازیہ نے مختصر ترین الفاظ میں انہیں صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے، انہیں بٹھایئے، میں فارغ ہو کر انہیں مل لوں گا۔'' کچھ توقف کے بعد ڈاکٹر کی بھاری آواز ریسیور میں ابھری۔

''انتظار ہم کر لیتے ہیں۔'' اس کے جواب پر رائفل والے نے کہا اور سامنے رکھے آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے دوسروں کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

''ایئر کنڈیشن کی اسپیڈ تیز کر کڑیے۔'' اس نے شازیہ کو مخاطب کیا۔

''او فضل دین جا بھاگ کر باہر گاڑی سے سلمان باؤ کو نکال کے اندر لے آ، او کگڑ۔'' پھر اس نے چاچا شریف کی طرف دیکھا۔

''جا کوئی بوتلوں شوتلوں کا انتظام کر، ٹھنڈا شنڈا بو چھ ہم مہمان ہیں تمہارے۔'' چاچا شریف یہاں سے جان چھٹنے پر دل میں شکر کرتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔ ''یہاں آنے والوں کو اس طرح انٹر ٹین نہیں کیا جاتا۔'' شازیہ نے پھر کہنا چاہا مگر رائفل کی نالی دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر جانے والا شخص ایک نوجوان لڑکے کو لیے اندر داخل ہوا۔

''بسم اللہ، بسم اللہ، ادھر بیٹھو سلمان باؤ ادھر آرام سے۔'' رائفل والے نے اٹھ کر لڑکے کا استقبال کرتے ہوئے اپنے قریب والے صوفے کا کشن تھپتھپایا۔ نوجوان لڑکا خاصا کنفیوز لگ رہا تھا۔

''کون ہیں یہ؟'' اس نے شازیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''کہاں لائے ہو تم مجھے؟''

''یہ اپنے لوگ ہیں سلمان باؤ، تم سے پیار کرنے والے، دوست ہیں۔'' رائفل والے نے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' لڑکے نے کہا اور پھر کچھ سوچا۔ ''دوست ہیں، ٹھیک ہے، پھر ٹھیک ہے۔'' وہ ذرا پرسکون ہوا۔ اسی اثنا میں چاچا شریف سیون اپ کی بوتلیں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ان سب کو بوتلیں پیش کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں واضح لرزش نظر آ رہی تھی۔ شازیہ نے نظر اٹھا کر آنے والے لڑکے کا جائزہ لیا۔ اس نے آف وائٹ پینٹ اور گرین پلین شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے

بال نفاست سے برش کیے گئے تھے اور اس نے اعلیٰ کوالٹی کے لیدر شوز پہن رکھے تھے۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال کے قریب لگ رہی تھی۔ وہ یقیناً ایک خوش شکل لڑکا تھا۔

"اوئے کتنی دیر لگائے گا یہ ڈاکٹر؟" دو تین گھونٹ میں بوتل حلق سے اتارنے کے بعد رائفل والے نے رائفل کی نال شازیہ کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

شازیہ کا دل ایک مرتبہ پھر خوف سے کانپا۔

"تھوڑی دیر بس۔" اس نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ لڑکے کی نظر رائفل کی نالی سے ہوتی ہوئی شازیہ پر پڑی اور پھر گویا اسے کرنٹ سا لگ گیا۔

"اوئے چھوڑ وا سے، چاچا طیفا اس کو قتل کرنے لگا ہے اوئے رحمت، اوئے سعادت، چاچے طیفے کو پکڑو، یہ لڑکی کو مارنے لگا ہے جیسے ابے نے مارا تھا دو بندوں کو، دو کو۔" اس نے انگلی کے اشارے سے بتایا اور رائفل والے سے رائفل چھیننے لگا، ایک عجیب قسم کا ہنگامہ اور کھینچا تانی شروع ہو گئی تھی۔ لڑکے کا شور، چھینا جھپٹی اور اس کے ساتھ آنے والوں کے سمجھانے بجھانے کی آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں۔ اسی دوران ان میں سے نہ جانے کس کے ہاتھ سے رائفل کا ٹریگر دب گیا اور شازیہ کے کانوں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ وہ وہیں خوف کے مارے ڈھے گئی۔

......⚬......

کرن فاطمہ کو "اون لکر" میں کام کرتے تقریباً ایک مہینہ ہو چلا تھا اور اس عرصہ میں اس نے حسن کمال کی تقریباً ہر فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ جرم و سزا، شکاریات اسے پہلا ٹارگٹ ملا تھا۔ اس نے دونوں موضوعات پر اچھے خاصے مضمون لکھ کر دیے۔ مہرین کیانی کو دونوں مضمون پسند آئے تھے مگر حسن کمال نے ان کی تصحیح کی خاطر انہیں اپنے پاس رکھ لیا تھا پھر اسے ڈاک کے نام پر آئے چند گنے چنے خطوط دیے گئے اور چند ای میلز پڑھنے کے لیے بھی کہا گیا۔ اس نے تمام کے جواب لکھ کر دیے۔ حسن کمال نے ان پر بھی بحث شروع کر دی۔

"آپ اس طرح کے جواب لکھیں گی تو بڑھ چکی پرچے کی سرکولیشن۔" اس نے ایک جواب کو سرخ نشان لگاتے ہوئے کہا۔

"پرچے کا ہر شعبہ مارکیٹنگ کے لیے استعمال ہونا چاہیے مس کرن فاطمہ آپ کی مارکیٹنگ کرنے کے لیے کوئی آسمان سے نہیں اترتے گا۔ یہی وہ گر ہیں جو صحافت پڑھنے والوں کو بتائے جاتے ہیں...... جبھی تو فیلڈ اسپیشلسٹ کو ترجیح دی جاتی ہے۔" کرن فاطمہ نے بڑے تحمل سے تنقید

اپنے حلق سے اتار لی۔ اسے اگلا کام اِدھر اُدھر کی خبروں کی چھانٹی کا دیا گیا۔ اس نے اس کام کو پورا کرنے کے لیے انٹرنیٹ استعمال کیا اور جدید ترین خبریں نکال کر لائی۔

"اپنے معاشرتی سیٹ اپ کو دیکھیے مس کرن فاطمہ، کیا ہمارے قارئین ایسی خبریں ہضم کر لیں گے۔" حسن کمال نے ٹام کروز کے بارے میں ایک خبر کے گرد حلقہ کھینچے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کا ارادہ مجھے سخت ٹائم دینے کا ہے تو یقین جانیے کہ میں اس سے نہیں گھبراؤں گی اور اگر یہ اس Tavelouge والی بات کا جواب ہے تو میں متاثر ہو رہی ہوں یہ ایک اچھا جواب ہے۔ ویسے اتنا میں بتا دوں کہ میرے کام کو مسترد کرنے اور اس پر تنقید کرنے کے چکر میں آپ اپنے کام سے لیٹ ہو رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ میرا کام تیار ہو، نہ آپ کا اور اس دفعہ کا پرچہ لیٹ ہو جائے۔" کرن نے اب...... بھی تحمل سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"یہ تو ہے حسن، میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ضرورت سے زیادہ محتاط ہو رہے ہو۔ کرن کے کام کو اس دفعہ کے پرچے میں شامل کرتے ہیں اس کا رسپانس اگلی مرتبہ آجائے گا پھر ہم بہتر فیصلہ کر سکیں گے کہ کرن کو کہاں اصلاح کرنی چاہیے اور کہاں کام جاری رکھنا چاہیے۔" مہرین نے بھی اس مرتبہ دخل اندازی کی۔

"ٹھیک ہے۔" حسن کمال نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ مہرین کے سامنے دھرتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہارا ارادہ اس پرچے کو گنی پگ بنانے کا ہی ہے تو تمہاری مرضی، جتنے دل چاہے تجربے کر لو۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور دفتر سے باہر نکل گیا۔ مہرین نے مسکرا کر کرن کی طرف دیکھا۔

"حسن تھوڑا جذباتی ہے اور پرفیکشنسٹ بھی ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرنا تھوڑا مشکل ہوتا ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب تک جو یہ "اون لکر" چلتا آ رہا ہے نا اس میں حسن کی محبت اور ثابت قدمی کا حد سے زیادہ دخل ہے ورنہ میں تو کئی بار مایوس ہو کر اسے بند کر دینے کا ارادہ کر چکی ہوں۔"

"وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ کرنا بنتا ہے میم۔" کرن نے اپنے صفحات اٹھاتے ہوئے کہا۔ "جب بھی کسی سیٹ اپ میں کوئی تبدیلی آتی ہے۔ کچھ نیا انٹرو یوڈیوس ہوتا ہے تو اس کے ساتھ مانوس ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ حسن کمال اپنے ذہن کے مطابق چلنے کے عادی ہیں کیونکہ ان کا اپنا ایک مائنڈ سیٹ اپ ہے۔ وہ اس سے باہر نکل کر ابھی نہیں سوچیں گے، مگر یقیناً کچھ عرصے کے بعد ضرور سوچیں گے کبھی کبھار تبدیلی کی خوشگواریت فوری طور پر محسوس نہیں ہوتی

لیکن آہستہ آہستہ یہ لطیف محسوس ہونے لگتی ہے اور قابلِ قبول بھی۔''

''تم خاصی مستقل مزاج لڑکی ہو۔'' مہرین نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''مگر یاد رکھو حسن کی تنقید سے گھبرا کر مایوس مت ہونا، جلد ہی وہ وقت بھی آئے گا جب وہ تمہاری اور تمہارے کام کی افادیت کا خود اقرار کرے گا۔''

''چلیں امید رکھتے ہیں۔'' کرن نے کرسی سے اٹھ کر اپنی سیٹ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے میرے نزدیک حسن صاحب سے زیادہ آپ کی رائے کی اہمیت ہے۔ فیلڈ اسپیشلسٹ تو آپ بھی ہیں۔'' مہرین اس کے جواب پر زیرِ لب مسکرائی تھی۔

......o......

''دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے''

ستارے کے مدہم سروں کے ساتھ ماہ پارہ بیگم ہولے سے گنگنائیں۔

''ارے مرزا صاحب کسی زمانے میں آپ تو وہ سنا کرتے تھے۔'' پھر انہوں نے رک کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھے مرزا صاحب کی طرف دیکھا۔

''بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا''

انہوں نے ستار کے تار دوبارہ چھیڑے۔

''ارے کسی زمانے کی کیا بات کرتی ہیں آپ مہ پارہ بیگم۔'' مرزا صاحب نے پائپ منہ سے نکال کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''کسی زمانے میں تو ہم نہ جانے کیا کیا اور کس کس کو سنا کرتے تھے، کیسی کیسی محفلیں ہوا کرتی تھیں، شعر و شاعری، رقص و ترنم، لذت کام و دہن سب کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ اب تو ہو کا عالم ہے ہر طرف، یوں لگتا ہے کہ اس اندر سبھا کے سب بنجارے لاد گئے اپنی اپنی لاٹھیاں ٹیکتے اور ہم ایک شہرِ خموشاں میں تنہا بیٹھے ہیں۔''

''یہ کیا ہے؟'' مہ پارہ بیگم نے اپنی چاندی کے پاندان کو کھول کر چھالیا پھانکتے ہوئے کہا۔

''یہ ہنگام تو شہرِ خموشاں میں صدیوں سے دفن مردوں کے بھی کام پھاڑ دے اور وہ الامان والحفیظ کرتے اپنی اپنی آخری آرام گاہیں چھوڑ کر روزِ حشر روزِ حشر کرتے بھاگ نکلیں، ان کے متعلق کیا خیال ہے۔''

''رہنے بھی دیجیے مہ پارہ بیگم!'' مرزا صاحب نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے خاموش ہو جانے کو کہا۔ ''مت مذاق اُڑائیے ہماری بے بسی اور اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوششوں کا۔ برق رفتار گاڑیوں کے دھوئیں اور آوازیں ہماری سماعتوں پر کیسے گراں گزرتی ہیں۔ سب مسخرے اچھل کود کرتے ہوئے جو بڑبڑاتے ہیں جنہیں لوگ موسیقی اور نغمے کا نام دیتے ہیں۔ ہمارے کانوں میں کیسے کیسے بکرے کٹتے ہیں انہیں سن کر اور وہ عطام سرائیں جو لذت کام و دہن کے اہتمام کے نام پر دیس دیس کی غذاؤں کے دستر خوان سجائے بیٹھی ہوئی ہیں ان کا موازنہ جب ہم سلیم پری رخ طباق کے بنائے شاہجہانی قور۔ اور جہانگیری یخنی پلاؤ، مغلئی نرگسی کباب دکوفتے سے کرتے ہیں تو زبان کیسی کڑوی ہو جاتی ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں، ہا، آ۔'' پھر انہوں نے سر کو تکیے سے پیچھے دیوار کے ساتھ ٹیکتے ہوئے کہا۔

''یہ تو آپ کا دم غنیمت ہے ماہ پارہ بیگم کہ آپ نے ان روایات اور تمدن کو اب تک اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر زندہ رکھا ہوا ہے انہیں گھڑی بھر کو سامنے پا کر ہم اپنے زندہ رہنے کا سامان کر لیتے ہیں ورنہ اس شہرِ خموشاں میں گھومتے پھرتے تو ہمیں خود پر بھی مصری ممی کا گمان ہونے لگتا ہے۔''

''بس مسئلہ یہ ہے مرزا صاحب۔'' مہ پارہ بیگم نے پان لگا کر انہیں سلیقے سے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ آپ ہم جیسے چند اور لوگ ایسے رہ گئے ہیں جو ماضی میں جینے کو ترجیح دیتے ہیں ورنہ اکثر تو دورِ جدید کے تمام رنگوں میں رنگ گئے۔ گزشتہ پیر کو رشید صاحب کی بیٹی کے ولیمے پر میں نے آغا سلطان قزلباش کو مدتوں بعد دیکھا، کیا وضعدار آدمی تھے، کھڑے پائجامہ اور براق کرتے پر سیاہ شیروانی پہنے، سلیم شاہی جوتوں میں جب کبھی اپنی سیاہ بیوک یا کریسلر پر نکلتے تھے تو اسی شہر لاہور کی سڑکوں پر گھومتے لوگ اپنے اپنے کاموں سے رک کر بطورِ خاص انہیں دیکھا کرتے تھے۔ ایسی وضعداری کہ جب سیاہ فون کی جگہ رنگ برنگے فون بٹنوں والے ٹیلی فون کمپنی نے نکالے تو لینے سے انکار کر دیا، ایک عرصے تک وہی پرانے ماڈل کا سیاہ فون استعمال کرتے رہے۔ ہماری تمہاری محفلوں میں کھلے دل سے شرکت کرتے تھے، اچھا شعر، اچھا سر، اچھا رقص، عمدہ کھانا ان کی کمزوری ہوا کرتا تھا۔ کیسے کیسے کل پاکستان مشاعرے ان کی پہلی کوٹھی میں منعقد ہوئے اور کیا کیا محافل موسیقی ملکۂ موسیقی، روشن آرا بیگم کی ٹھمریوں اور اختر ہائی فیض آبادی کی غزلوں کے زبردست مداح تھے مگر اس روز رشید صاحب کی سمدھی نے جو محفل موسیقی کے نام پر رنگ جمانے کی

بھونڈی کوشش کر رکھی تھی اس پر اوروں کی تو خیر مگر آغا صاحب کو سر دھنتے دیکھ کر میں غریب تو ششدر رہ گئی۔ دائیں بائیں کوٹ کی دونوں جیبوں میں علیحدہ علیحدہ نمبروں کے موبائل فون رکھے بیٹھے تھے۔ جن سے زمانے بھر کے لچر اور بے ہودہ گانوں کی موسیقی کی آواز وقفے وقفے بعد گونجتی تھی، توبہ توبہ۔'' انہوں نے دونوں کانوں کو باری باری ہاتھ لگایا۔'' اور آغا صاحب کے خاندان کی بچیاں، کہیں سے بھی اس وضعدار آن بان والے شخص کی نسل میں سے نہیں لگ رہی تھیں۔ کیا کہوں مرزا صاحب آغا صاحب کی اس ہیئت کذائی پر میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی پھر جب کھانے کے بعد ملاقات ہوئی تو اس بدذائقہ سمندری مچھلی کی شان میں جو گھٹیا قسم کے تیل میں تلی گئی تھی جی جان سے رطب اللسان پائے گئے۔'' مجھے دیکھ کر بولے۔''

''ارے مہ پارہ جی، آپ ابھی تک اسی لبادے میں ملبوس ہیں اور وہی رہن سہن ہے۔ چھوڑیئے بیگم صاحب اب پرانے زمانے کی باتیں، ان جدید سہولتوں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کیجئے۔ زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے اس کا فائدہ اٹھایئے۔''

''میری پیشانی پر شاید غصے کے یا پھر حیرت کے بل دیکھ کر اس نام نہاد گلوکارہ یا پھر شاید میراثن کہنا زیادہ مناسب ہوگا کو قریب بلا کر بولے۔'' یہ دیکھ وضع داریوں کا خوبصورت انجام۔ یہ مہ پارہ بیگم ہیں اپنے زمانے کی مشہور مغنیہ، ریڈیو کے پروگرام خوشی سے کیا کرتی تھیں، نجی محفلوں میں بھی اپنے خوش گلو ہونے کا مظاہرہ شان سے کیا کرتی تھیں مگر ٹی وی کا رخ نہیں کیا۔ بہتیرے ان لوگوں نے ترلے کیے مگر ان کو نہ سیٹ پسند آتا تھا نہ سیٹ اپ، اب دیکھو یہ عالم ہے کہ اب بھی ان جیسی خوش گلو موسیقی کے تمام رموز کو سمجھنے والی شاید ہی ملے مگر ان کو کون اور کتنے جانتے ہیں، مکمل گمنامی کی زندگی گزار رہی ہیں، اتنی سی بھی پی آر نہیں ہے کہ یہ جوز مین کھود کر لیجنڈز نکالنے والے پرائیوٹ چینلز ہیں یہی کہیں کسی پروگرام میں انٹرویو کے لیے بلا لیں یا کوئی تاریخ ان سے سن لیں۔'' پھر اس چھوکری کو نصیحت کرنے لگے۔'' مقام عورت ہے اس لیے تمہیں خصوصی طور پر بلا کر دکھایا اور ملایا ہے، کچھ حاصل نہیں ہوتا اصولوں اور وضعداریوں سے زمانے کی چال کو دیکھ کر اور سمجھ کر چلنے والے ہی سمجھدار اور کامیاب ہوتے ہیں۔''

''ارے مرزا صاحب، ایسی کایا کلپ۔'' انہوں نے ایک مرتبہ پھر تو یہ تلا کی۔'' ایسی کایا کلپ کبھی دیکھی نہ سنی کسی کی، میرے سامنے جدید وضع کی گاڑی میں بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔''

''کل یگ ہے مہ پارہ بیگم کل یگ، تو اپنی سی جدید وضع میں ڈھل گئے ہیں ایک اہم ہیں اور

بنے بھیا اور اچھن بھائی صاحب اپنی اپنی اولادوں کے ہاتھوں مجبور ہیں جدید لبادے اوڑھنے پر، کبھی کبھار تو آئینہ دیکھنے پر خود اپنا چہرہ بھی پہچانا نہیں جاتا.....''

''اچھا آپ تشریف رکھیے میں آپ کے لیے خاصے کا اہتمام کرواتی ہوں۔'' مہ پارہ بیگم اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولیں اور باہر کی طرف چلیں چلتے ہوئے ان کی بانہوں میں پڑے موٹے طلائی کنگن بج اٹھے۔ تنہائی پاتے ہی مرزا صاحب نے دوبارہ گاؤ تکیے سے سر ٹیک کر سامنے کی دیوار پر سجے ماہ پارہ بیگم کے پورٹریٹ کو دیکھا اور سوچا خاتون کی وضع قطع میں اتنے سال گزر جانے کے باوجود بھی ذرا فرق نہیں آیا۔ ناک میں پڑی ہیرے کی لونگ، گلے میں کالے ڈور ے میں ڈلا طلائی کنٹھا، کھڑ کھڑاتے کلف زردہ پائجامے کرتے میں ملبوس، کھڑ کھڑاتے بڑے بڑے دوپٹے سے سر ڈھانپے وہ اپنی غلافی آنکھوں، سفید و سرخ کشمیری سیبوں جیسی رنگ، ستواں ناک ہیروں کی انگوٹھیوں سے مزین نازک انگلیوں والے ہاتھوں سمیت سرتاپا اب بھی ویسی ہی تھیں۔ ہاں ایک فرق یہ آیا تھا کہ اس پارٹریٹ میں جو اس زمانے کے مشہور مصور ''بشیر سوز'' نے جو اُن کے فن کا مداح تھا اپنی عقیدت کی نشانی کے طور پر بنایا تھا۔ وہ رنگین لباس میں ملبوس تھیں جب کہ اب اکثر ان کا لباس سفید ہوتا تھا کبھی کبھی سفید پائجامے دوپٹے کے ساتھ ہلکے رنگوں کے کرتے پہن لیا کرتی تھیں۔

دوسرا فرق یہ تھا کہ پورٹریٹ اس وقت کا تھا جب ان کے بال سیاہ تھے جب کہ اب ان کے بالوں کی اکثریت چاندی کے رنگ کی سی تھی جن کو وہ لمبی چٹیا کی شکل میں گوندھ لیا کرتی تھیں۔ پاؤں میں تلے کے کام کا کھسا پہنتی تھیں اور ان کا نازک انگلیاں اب بھی جب کبھی ستارے کے تاروں کو چھوتی تھیں تو ان میں سے ایسے مدھم سر نکلتے تھے جنہیں سن کر اب بھی سننے والے پر وہی مدہوشی اور بے کیفی چھا جاتی تھی۔ جس میں کھو جانے کی خواہش اس زمانے میں موسیقی کے بڑے بڑے دلدادہ انسانوں کو ان کی دہلیز پر کھینچ لاتی تھی۔

مہ پارہ بیگم لکھنؤ کی مشہور مغنیہ جہاں آرا بیگم کی نواسی اور شاہ پارہ بیگم کی بیٹی تھیں۔ تقسیم ہند..... کے وقت جہاں آرا بیگم اپنی بیٹی شہ پارہ سمیت اپنے فن کی سجی سجائی دنیا چھوڑ کر پاکستان آ گئی تھیں۔ شہ پارہ کے ساتھ اس کی آٹھ سالہ بچی مہ پارہ ولد بیت نامعلوم بھی یہاں آئی تھی۔ دونوں ماں بیٹیوں نے اس نومولود ملک میں آ کر موسیقی کے شعبے کی باگ ڈور سنبھالنے کی اولین کوشش کی۔ جہاں آرا بیگم متحدہ ہندوستان کا ایک مشہور نام تھا اس کے گراموفون ریکارڈ ہاتھوں

ہاتھ بکتے تھے۔شہ پارہ کواس کی بیٹی ہونے کا اضافی اعزاز حاصل تھا۔سو دونوں ماں بیٹی اس نئے ملک میں بھی نام بنانے میں کامیاب ہوئیں۔شروع شروع میں دونوں کا قیام مشہورِ زمانہ فلیٹیز ہوٹل میں رہا پھر شہ پارہ کے ایک مداح نے انہیں ٹمپل روڈ پر ایک بہت اچھی رہائش گاہ بطور تحفہ پیش کی۔

جہاں آرا بیگم یہاں آنے کے بعد چند سال ہی جی پائیں اور جلد ہی بعارضہ فالج وفات پائی۔اب گدی مکمل طور پر شہ پارہ کے ہاتھ میں تھی شہ پارہ باذوق،ادب پرست،خوش شکل وخوش گلو خاتون تھی جس کی تربیت میں لکھنوکی تہذیب کا عنصر نمایاں تھا۔انتہائی خوشگفتار،برجستہ گفتگو کی ماہر،شعر کہنے میں ملکہ حاصل تھا۔ستار اور ہارمونیم بجانے میں ماہر تھی۔اس کے مداحوں میں اس دور کے بڑے بڑے اعلیٰ افسر،شاعر،ادیب،وزراء،مشیر سب شامل تھے۔ٹمپل روڈ والی رہائش گاہ پر اعلیٰ درجے کی محفلیں سجا کرتی تھیں اور رات رات بھر شہ پارہ بیگم اپنے فن کا مظاہرہ ٹھمری اور غزل کے انداز میں کیا کرتی تھی۔پھر اچانک گلے کے کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا۔اس کے قریبی مصاحبین کا کہنا تھا کہ اسے کسی حسد نے سیندور کھلا دیا......کوئی کہتا تھا کہ اس پر خاص تعویذ کروائے گئے تھے تاکہ وہ فن کی دنیا سے رخصت ہو جائے جو بھی تھا شہ پارہ بیگم کچھ عرصہ اس اذیت ناک بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد چٹ پٹ ہوگئی۔

اب اس دنیا میں مہ پارہ بیگم جو اس وقت ایک نوخیز کلی میں ڈھل چکی تھی کا کوئی والی وارث نہیں رہا تھا۔مرحومہ ماں خوش ذوق وشاہ خرچ تھی۔لکھ لٹ والا حساب تھا،لاکھوں کماتی اور لاکھوں لٹاتی تھی،مہمانداری میں خوش رہتی تھی۔دسیوں مہمان تینوں وقت اس کے دسترخوان پر موجود رہتے تھے۔مرسیڈیز کار سوار کے طور پر رکھی ہوئی تھی،خانساماں،درزی،مشاطہ،دھوبی،سازندے سب کے سب شاگرد ڈیرے جمائے رہتے تھے۔ہزاروں کے حساب سے ان کی تنخواہیں جاتی تھیں اس کے دنیا سے رخصت ہونے پر علم ہوا کہ اس حساب سے قرض اس کے ذمے واجب الادا ہے کہ ٹمپل روڈ والی رہائش اور مرسیڈیز کار بیچنے کے بعد بھی شاید کچھ قرض دار باقی رہ جائیں۔مہ پارہ بیگم کو ماں نے بڑے شوق سے تعلیم دلوانے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔خصوصی استاد گھر پر آکر پڑھاتے تھے۔ریاضی،انگریزی،اردو،دینیات وہ سب مضمون پڑھتی تھی اور ماں کی وفات کے وقت حساب سے گیارھویں یا بارھویں درجے کی کتابیں پڑھ رہی تھی۔ساتھ میں خاندانی فن کی تعلیم بھی جاری تھی۔صبح وشام ریاض کرتی تھی۔قدرتی سرِ خدا تعالیٰ نے عطا کر رکھا تھا،مگر دنیاداری

میں بالکل صفر تھی۔ایسے میں مرحومہ ماں کی دیرینہ سہیلی مہرو جان کام آئی۔تمام مالی معاملات نبٹا کر اپنے ساتھ سمن آباد لے گئیں۔

"مہرو خالہ! خدا جنت نصیب کرے۔" مہ پارہ بیگم کہا کرتی تھیں "ایسی ہشمین بی بی تھیں۔ میں دکھیا تو پھر سہیلی کی اولاد تھی،ورنہ کون سا ایسا سوالی محتاج تھا جو اُن کے در پر آکر سوال کرتا اور مایوس لوٹتا،یہ زمانے بھر کے شرفا کیا نیک کاموں کے لیے لوگوں کی فلاح کے لیے چندہ دیتے ہوں گے جو مہرو خالہ اور ان کی کئی ہم عصر فنکاراؤں نے دے چھوڑا،کوئی توڑ نہیں ہے اُن لوگوں کے پاس ان کی فیاضی اور دریادلی کا...... کچھ بن نہ پڑنے پر فتویٰ لگا دیتے ہیں رنڈی کا پیسا نیک کام میں نہیں لگتا،لگ جائے تو اس کا ثواب رنڈی کو نہیں پہنچ سکتا۔ارے میں کہتی ہوں زمانے کے خداوؤ،جو کرتوت تم لوگوں کے یہ رنڈی دیکھتی ہے وہ تمہارے اردگرد کی دنیا دیکھ لے تو مار جوتے تمہیں جہنم رسید کردے۔"غرض دلی والی مہرو جان مرحومہ کے لیے مہ پارہ بیگم کے پاس احترام،ستائش،احسان مندی اور محبت ہی محبت تھی۔انہی مہرو جان نے مہ پارہ بیگم کو اپنے ہاں لے آنے کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرایا۔

"بیٹی،آگا پیچھا تمہارا کوئی نہیں ہے،ماں تمہاری سدا کی لکھ لٹ تمہارے لیے ٹکا چھوڑ کر نہیں گئی۔رہنے کو تو میرا یہ ٹھکانا جم جم حاضر ہے مگر تم جانو کہ میں خود اکثر ٹھیک نہیں رہتی۔جوڑوں کے درد اور سینے کی گھٹن کے عارضے کا شکار ہوں،ڈاکٹروں،طبیبوں نے سختی سے منع کر دیا ہے گلے پر زور دینے سے پھر بھی اس پاپی پیٹ کی خاطر کبھی کبھار ریڈیو،ٹیلی وژن کی کسی کلاسیکی موسیقی کی محفل میں شرکت کر لیتی ہوں چھمو نگوڑی میرا جمع جتھا ہتھیا اڑنچھو ہوگئی۔(مہرو خالہ کی اکلوتی بیٹی) لے دے کہ ایک یہ بن میاں (طبلہ نواز) اور کالے خان پڑے رہ گئے میری ڈیوڑھی میں۔یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جینے کا آسرا کرنا اب خود تمہارا کام ہے اور یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ ہم جیسوں کے لیے جینے کا سامان یہ کتابیں اور ان کا علم نہیں بلکہ خدا نے جو ایک وصف پیڑھی در پیڑھی نوازا ہے وہی ہمارے جینے کا سامان کرتا رہے گا۔"

مہ پارہ بیگم کو عقلِ سلیم سے خدا تعالیٰ نے کمال فیاضی سے نوازا تھا زندگی کی ان حقیقتوں کو ایک ہی نشست میں سمجھ گئیں کچھ ماں کی دائمی جدائی بے جھلتی دنیا میں ننگے سر لا کھڑا کیا تھا،تمام کتابیں سمیٹ کر مقفل کر دیں اور ہارمونیم سامنے رکھ کر صبح شام ریاض میں مصروف ہوئیں۔اس زمانے میں کلاسیکی موسیقی میں روشن آرا بیگم،فریدہ خانم،نجن بیگم،اور ملکہ پکھراج کا طوطی بولتا تھا،

پاپولر میوزک پر نور جہاں اور مالا جیسے بڑے ناموں کا رواج تھا۔ ایسے میں مہرو خالہ کے ذاتی تعلقات بڑے کام آئے۔ گومہ پارہ بیگم اپنی ماں اور نانی کے زیر سایہ لکھنو کی تہذیب کا نمونہ تھیں اور مہرو خالہ خالص دلی والی تھیں تہذیبوں کے اس ٹکراؤ نے مجبوری اور ضرورت کے ہاتھوں شکست کھائی اور مہ پارہ بیگم نے اپنے طور طریقے بدلنے کی کوشش شروع کر دی۔

ریڈیو پاکستان، اس زمانے میں علم وفنون کا گہوارہ تھا، اس جہانِ فن میں بھی ان کی انٹری مہرو خالہ کی وجہ سے ممکن ہو سکی پھر شرفا و امرا کی نجی محفلیں تھیں۔ دو چار فلموں کے گیت بھی گائے۔ مہرو خالہ کے اپنے گھر میں شامِ موسیقی اور شب موسیقی ہوا کرتی تھی۔ یوں چند ماہ کے اندر اندر مہ پارہ بیگم کا نام قابلِ ذکر فنکاراؤں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ مداحین اور آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ والدہ مرحومہ کے زمانے کے اللے تللے افورڈ کرنے کے دن پھر آنے لگے مگر تاریخ سے سبق سیکھنے والی خاتون تھیں جو کمایا سلیقے سے خرچ کیا گو اپنی وضعداری اور آن بان پر حرف نہیں آنے دیا۔ لاہور، ملتان، سندھ، وفاقی دارالحکومت نہ جانے کہاں کہاں سے امرا، وڈیرے، زمین دار خود چل کر مہ پارہ بیگم کی آواز سننے کے لیے ان محافل میں شامل ہوتے تھے جہاں وہ موجود ہوتی تھیں۔ انہی رؤسا کی نجی محفلوں کی سائی پکڑنے کا کام کالے خان مرحوم کرتے تھے جو مہرو خالہ کی بیماری کے باعث بیکار ڈیوڑھی میں پڑے رہتے تھے۔ استاد بچن کے علاوہ ایک اور استاد غریب سلطان بھی تنخواہ پر ملازم رکھ لیے گئے۔ اسی زمانے میں لاہور کے ایک مشہور نواب خاندان کے معزز رکن جو کہ مہ پارہ بیگم کی آواز کے علاوہ شکل وصورت اور وضع قطع پر بھی بری طرح فریفتہ تھے ایک محفل میں ان کی سنائی غالب کی ایک غزل کے اس شعر

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کی تحسین کے طور پر اپنے خاندان کی مشہور حویلی واقع اندرون موچی گیٹ ان کے نام کر دی۔ گو اس واقعے پر بعد میں ان کے نامور خاندان کی طرف سے بڑی لے دے ہوئی مگر خاندانی نواب تھے اپنی کہی بات سے ایک حرف نہیں ہٹے یوں مہرو خالہ کے شکستہ، فریب الخاتمہ مکان واقع سمن آباد سے مہ پارہ بیگم اپنے سازندگان اور خادموں کی چھوٹی سی فوج سمیت اس شاندار حویلی میں منتقل ہو گئیں۔

مہرو خالہ بینائی سے محروم ہو چکی تھیں۔ اس آخری عمر میں قدرت کی طرف سے عطا ہونے

والے اس عیش وآرام کے شکرانے کے طور پر سارا سارا دن بستر پر پڑی اشاروں سے نفل پڑھا کرتی تھیں۔ اس شاندار حویلی میں جس میں اب تک مہ پارہ بیگم مقیم تھیں آنے کے بعد ان کے وقار، رعب ودبدبہ، وضعداری اور شان میں مزید اضافہ ہوا اور ان کا فن مزید نکھرنے لگا۔ لوگ کہتے تھے کہ ٹھمری، غزل اور گیت کی گائیکی میں وہ اپنی ہم عصر فنکاراؤں سے قطعی کم نہ تھیں مگر ان کے مزاج اور تربیت نے انہیں ایک خاص سطح سے اوپر جانے نہیں دیا۔ زندگی میں دو اصول ہمیشہ ان کے ساتھ رہے ایک کسی کا احسان مت لو دوسرے چور دروازوں سے کسی بھی جگہ اندر داخل مت ہو۔ یہ دونوں اصول ہی ان کی ہر دل عزیزی کا باعث تھے یہی دو اصول تھے جنہوں نے انہیں ملکہ غزل اور ملکہ سنگیت جیسے القابات سے محروم رکھا۔ اب جب کہ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھیں۔ چند ایک نوجوان لڑکیوں کو جن کے اندر قدرتی طور پر موسیقی کو سمجھنے کے جراثیم موجود تھے تربیت دیتی تھیں۔ عمر بھر خوب کمایا تھا اور محفوظ بھی کیا تھا، اکیلی جان تھیں ہر قسم کی فکر وغم سے آزاد۔ مہرو جان، کالے خان اور بچن خان کے جنازے انہی کی حویلی سے اٹھے تھے۔ استاد غریب سلطان اب تک ان کے ساتھ تھے گو ضعیفی کے باعث ساز پر ان کے ہاتھ اس طرح نہیں چل پاتے تھے مگر ایک ایک قدم پر ان کے مشورے لینا ضروری سمجھتی تھیں۔

خانساماں، دھوبی، آیا، ڈرائیور ذاتی تھے اور سب اپنے اپنے گھروں سمیت حویلی میں ہی مقیم تھے۔ اچھی خاصی رونق رہتی تھی۔ پرانے مداح، اہل قلم اور موسیقی کے شوقین اب بھی اکثر ان کے ہاں آن موجود ہوا کرتے تھے۔ کرنٹ افیئرز، سیاست، شاعری، تاریخ، فقہ، مذہب، زبان ہر موضوع پر گفتگو میں طاق تھیں۔ لوگ ان کے پاس آنا اور ان سے گفتگو کرنا پسند کرتے تھے۔

.....✿.....

وہ ویلنٹائن ڈے تھا۔ اس نئے دور میں بھی سمعیہ سلطانہ جس ماحول میں رہ رہی تھی۔ وہاں کے کینوں کو ویلنٹائن ڈے کے بارے میں کچھ بھی معلومات نہ تھیں وہ خود اپنے طور پر ایک دو روز پہلے سے ہی اپنی بھابیوں اور ماں کو اس تاریخ دن کی اہمیت کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''ساری شرم حیا مر گئی ہے آج کل کے لڑکے لڑکیوں کی۔'' اس کی بڑی بھابی نے اپنے بیٹے کے کپڑے اتار کر اسے واش روم میں لے جاتے ہوئے کہا۔ ''جو باتیں کبھی سوچنے پر بھی پابندی تھی اب یہ کھلم کھلا ان کا عملی مظاہرہ کرنے لگے ہیں۔ ناس پیٹے شریفوں کی لڑکیاں بھی ساتھ میں ورغلائیں گے، خراب کریں گے۔''

''کوئی یونہی خراب نہیں ہوجاتا ہے۔'' سمعیہ سلطانہ نے اپنے ہاتھوں کے سرخ پالش لگے لمبے لمبے ناخنوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو اپنی اپنی مرضی ہے چاہے اس رسم پر عمل کرو چاہے نہ کرو۔''

''لے ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ محبت کرنے والے اس روز ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں، سرخ گلاب اور دوسرے پھول اور تحفے تحائف کے علیحدہ پورشن بنے ہوتے ہیں دکانوں میں۔''

''ناں تو یہ میں نے کب کہا کہ جو کسی سے محبت نہیں کرتا وہ بھی ضرور تحفہ دے کسی کو، یہ تو مرضی ہے، ویسے بھی کونسا ساری دنیا واقف ہے اس رسم سے۔''

''ایک سے ایک بے ہودہ رسم چل پڑی اس ملک میں'' سمیعہ کی اماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''پہلے بسنت منانے لگے، وہ بے ہودگی وہ بے ہودگی کہ توبہ، پھر نئے سال منائے گئے اب یہ محبت کا دن آ گیا ہے۔ اللہ جانے اب یہ سلسلے کہاں جا کر رکیں گے۔ میری بات سن سمعیہ سلطانہ۔'' پھر انہیں اچانک خیال آیا۔ ''تو ہرگز ایسی لڑکیوں کے پیچھے نہ لگیو، وہ لڑکیاں نہیں شیطان کی اولادیں ہیں شیطان کی اولادیں!''

''توبہ کرو میں آتی ہوں بھلا کسی کی بات میں، دن منانے کے بارے میں تو آپ لوگوں کو میں نے محض اس لیے بتا دیا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے کچھ آپ کو بھی خبر ہو۔'' سمیعہ سلطانہ گفتگو کا رخ خطرناک موڑ کی طرف مڑتے دیکھ کر اپنی بات بدلنے پر مجبور ہوگئی مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس دور کی لڑکی ہوتے ہوئے کالج کے ماحول میں جا کر اپنے سے بہتر ماحول میں رہنے والی ماڈرن طور طریقوں والی سہیلیوں کا رنگ پکڑنے میں ناکام رہتی۔ ویلنٹائن ڈے کو..... ہی جی بھر کر اس دن کو منانے کی تیاریاں ڈسکس ہوئیں، کون کس کو کیا تحفہ دے گا اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا گیا۔

اس روز سمعیہ سلطانہ کو اچھی طرح یقین ہوگیا کہ ہر عورت کے لیے ایک مرد خدا نے ضرور پیدا کر رکھا ہے۔ اب اپنے اس جنس مخالف کے ساتھی کو ڈھونڈ نکالنا ہی تو اصل کام ہے۔ سمعیہ سلطانہ حیران ہوئی کہ اس کی اکثر سہیلیاں صنف مخالف کے ساتھی ڈھونڈ چکی تھیں۔

''ارے سمعیہ، حیرت ہے تمہیں اپنے خوابوں کا شہزادہ ابھی تک نہیں ملا۔'' اس روز اس کی کئی سہیلیوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ سمعیہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئی مگر جب وہ سب کلاسز بنک کر کے چور راستے سے ویلنٹائن ڈے کی شاپنگ کے لیے باہر نکل رہی تھیں تو دھڑکتے دل کے ساتھ

سمعیہ سلطانہ بھی ان کے ساتھ تھی۔

''تم تو بڑی ہوشیار نکلیں۔'' راستے بھر اس کی ساتھی لڑکیاں اسے چھیڑتی رہیں۔

''بڑی گھنی ہو، بتاؤ تو وہ کون ہے جو تمہارے دل کا شہزادہ ہے۔'' سمعیہ کی نظروں کے سامنے اپنی آپا کے گھر کی سیڑھیوں میں بناوہ چھوٹا سا کمرا اور اس کا مکین گھوم گیا جس کو براہ راست مخاطب کرنے کی جرأت اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

''ہے کوئی۔'' اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ وہ کیسا ہے، کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے؟'' سمعیہ سلطانہ ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر تھی۔ اس کے دل کا مکین ایک ایسا انسان تھا جسے شاید کچھ لوگ ہی جانتے تھے۔ وہ یکطرفہ محبت کا شکار تھی وہ کیسے اس کا نام پتا بتا سکتی تھی۔

''ہے ایک، میرا کزن ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا مگر جب وہ اس مشہور ڈپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوئیں تو سمعیہ کو یاد آیا کہ پچھلی دفعہ اپنی آمد پر ماموں جان جو دو ہزار روپے دے گئے تھے اس کے علاوہ بھائی جان سے فیس اور کتابوں کی مد میں لیے گئے پیسے بھی اس کے بیگ میں موجود تھے اس کے دل میں ایک نئے خیال نے سر اٹھایا اور اسی خیال کے تحت اس نے ایک عدد مردانہ پینٹ، شرٹ (سائز اندازے سے لیا) خرید لی۔ اس مشہور چین اسٹور کے بیگ میں پیک دونوں چیزوں کے ڈبے اور اسٹور سے باہر ہاتھوں ہاتھ بکتے تازہ پھولوں کے بوکے میں سے خریدا ایک بوکے اس کے ہاتھ میں تھا جب وہ ویگن سے اسٹاپ پر اتری۔ اس نے بیگ کے اندر سے لائبریری سے اڑایا اخبار نکالا تھیلے کے گرد لپیٹا اور اس کے آگے پیچھے فائلیں سجا کر وہ اپنی آپا کے گھر کو جانے والی گلی کی طرف مڑی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر چونکہ وہ اس سائیڈ پر بہت کم آئی تھی اس لیے کسی نے بھی اسے نہیں پہچانا۔ وہ آپا کے گھر کی تنگ و تاریک ڈیوڑھی میں کھلے دروازے سے داخل ہوئی۔ دن کے وقت بیرونی دروازے کو کوئی بھی اندر سے مقفل نہیں کرتا تھا۔ ڈیوڑھی کے نیم اندھیرے سے اژدہا ہونے پر اسے معلوم ہوا کہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ بغیر کسی سے ملے سیڑھیوں کی طرف لپکی اتفاق سے سیڑھیوں میں بھی کوئی موجود نہ تھا۔ بچوں کی فوج غالباً اسکولوں سے واپس نہیں آئی تھی جبھی خاموشی اور امن کا راج تھا۔ سیڑھیوں والا کمرا کھلا تھا اور خالی تھا۔ ''لو بھئی یہ تو تالا بھی نہیں لگاتا۔'' اس نے دل میں سوچا مگر کمرے میں داخل ہونے کے بعد اسے خیال آیا کہ اندر کوئی چیز بھی اس قابل موجود نہیں تھی جسے چرایا جاتا۔ اس نے پھرتی سے ہاتھ میں پکڑا

سامان چارپائی پر رکھا۔ ایک نظر کمرے کی بے ترتیبی اور دہشت پر ڈالی اور تیزی سے باہر آ گئی۔ سیڑھیوں اور ڈیوڑھی میں ابھی بھی کوئی نہیں تھا۔ اسے آتے جاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا اور آپا سے ملنے کا ارادہ کسی اور دن پر ملتوی کرتے ہوئے اسی طرح گھر سے باہر نکل آئی۔

واپسی پر ویگن میں بیٹھے بیٹھے اسے اپنی جرأت اور اعتماد پر حیرت ہو رہی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچ کر محظوظ ہو رہی تھی کہ اس عمل کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس کے متوقع نتائج کیا ہو سکتے تھے مگر گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ ہر خدشے اور وہم سے آزاد ہو کر پرسکون اور نارمل ہو چکی تھی۔

.....

''زندگی میں سیکھنے کا عمل ہر دم جاری رہتا ہے شازیہ بی بی، ذرا ذرا سی غیر متوقع صورت حال پر یوں اپنے حواس کھو دینے والے زندگی کی تلخیوں کا سامنا کیسے کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر عبدالصبور نرم لہجے میں شازیہ سے گفتگو کر رہے تھے۔

''لیکن سر وہ غنڈے تھے اور بدمعاش بھی، انہوں نے ہنگامہ آرائی کی گولی چلائی، شکر ہے وہ گولی کسی کو نہیں لگی مگر ایسی صورت حال میں اپنے حواسوں میں کوئی کیسے رہ سکتا ہے۔'' شازیہ اپنے موقف پر قائم تھی۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ غنڈے اور بدمعاش تھے یا نہیں اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے، ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ شاید ان کا انداز ان کا طور طریقہ یہی ہو۔ دنیا میں سارے ہی لوگ تو مہذب اور سمجھ دار نہیں ہوتے، دوسری بات یہ ہے کہ ہنگامہ آرائی انہوں نے نہیں ان کے ساتھ آئے اس نوجوان نے کی جو ذہنی طور پر بیمار ہے۔ اس لحاظ سے وہ ہمارا پیشنٹ ہوا اور ہمارے پاس آنے والے مریضوں کی ذہنی صحت کے بارے میں ہم کوئی اچھا مثبت گمان تو کر ہی نہیں سکتے، وہ تو کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ انہی کو میلپ آؤٹ کرنے کے لیے تو ہم یہاں بیٹھے ہیں، اور روز ہم سے بھی ان کے ساتھ کچھ زیادتی ہوئی مانتی ہیں نا آپ!''

''وہ تو ٹھیک ہے سر، مگر ہمارے یہاں پہلے اس طرح دھونس جما کر کبھی کوئی آیا جو نہیں پریشانی تو لازمی تھی اور بغیر اپائنٹمنٹ کے آپ سے ملنے کا کوئی اصول بھی نہیں، میں دو طرح کی صورت حال میں پھنس چکی تھی آپ کی ناراضگی اور ان کی دھمکیاں، میں کتنی اپ سیٹ تھی آپ کیا

جانیں۔''

یہی تو کہہ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر صبور مسکرائے۔ ''ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کا پتا ہونا چاہیے۔ اپنا حوصلہ بڑھائیں اور وژن بھی، آج سے یہ پریکٹس شروع کر دیں۔ ایک بار یہ صورت حال پیش آئی پھر کبھی بھی آ سکتی ہے۔ ہمیں زندگی میں ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'' ڈاکٹر صبور شازیہ کو سمجھانے کے لیے دس پندرہ منٹ اس کے پاس بیٹھنے کے بعد اپنے آفس میں چلے گئے اور شازیہ کی نظروں کے سامنے اس خوفناک دن کے مناظر ایک مرتبہ پھر گھومنے لگے۔ کیسے وہ لڑکا اچھل اچھل کر رائفل والے سے الجھ رہا تھا کیسے گولی چلی اور سیدھی سامنے کی دیوار میں جا لگی اور پھر اس لڑکے نے واویلا شروع کر دیا۔

''مار دیا تم نے بھی بندہ مار دیا۔ بندے نے کہا ہے نا ہائے لال لال خون نکلا ہے نا اس کے اندر سے، دیکھو وہ ہائے ہائے کر رہا ہے زمین پر پڑا۔'' وہ زمین پر گرے کسی فرضی بندے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''میرے ابے کو تو پولیس نے نہیں پکڑا نا تمہیں پکڑ لے گی ضرور پکڑ لے گی۔ میں بتاؤں گا پولیس کو میں۔'' وہ اپنی چھاتی ٹھونک رہا تھا۔ اس کے ساتھ آئے سارے لوگ اسے قابو کرنے کی کوشش میں دہرے ہو رہے تھے اور وہ ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ گولی کی آواز سن کر ڈاکٹر عبدالصبور اور اس روز کا آخری مریض بھی باہر نکل آئے تھے۔ ڈاکٹر صبور نے ایک نظر شازیہ اور چاچا شریف کے زرد پڑے چہروں پر ڈالی اور پھر آگے بڑھ کے معاملے کو ہینڈل کرنے لگے۔

اس وقت تک شازیہ نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ اسے فرسٹ ایڈ بھی ڈاکٹر صبور نے ہی دی اور اسے اپنی گاڑی میں گھر بھی وہ خود ہی چھوڑ کر گئے تھے۔ مارے دہشت کے شازیہ کو اگلے کئی روز تک نیند نہیں آئی تھی اور نہ ہی وہ کام پر آنے کے قابل ہو سکی تھی پھر ڈاکٹر صبور خود اس کو لینے کے لیے گھر آئے اور شازیہ کے والدین ڈاکٹر صبور کو نہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کلینک پر واپس آ کر پندرہ منٹ تک ڈاکٹر صبور کی کونسلنگ کی زد میں رہی تھی اور اب ان کے آفس میں چلے جانے کے بعد اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا..... اس روز گولی سے دیوار کا پلستر جہاں سے اکھڑا ہوگا اس کی مرمت کرا دی گئی تھی کمرے کا ڈیکور بھی بدل دیا گیا۔ وال پیسٹنگ بھی لکڑی سے کر دی گئی تھی۔ شازیہ کا ٹیبل اور ریک بھی بدل دیا گیا تھا، دیواروں کے پینٹ کو بھی بدل دیا گیا تھا۔ اب دیواروں کا اوپری حصہ ایپل گرین کلر میں پینٹ کیا گیا تھا۔ چھت پر کنسیلڈ لائٹس فکس کرا دی گئی تھیں۔ حتیٰ

کہ شازیہ کا ٹیبل مانیٹر بھی بدل دیا گیا تھا۔ یہ ایل سی ڈی اسکرین والا فلیٹ مانیٹر تھا۔

شازیہ بخوبی جانتی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں ڈاکٹر صبور نے ایسا کیوں کیا تھا۔ وہ یونہی تو نامور سائیکاٹرسٹ کے طور پر مشہور نہیں تھے۔

انہیں معلوم تھا کہ شازیہ اور چاچا شریف کے علاوہ ان کے اس آخری کلائنٹ کے ذہن میں بھی اس کمرے کا وہی نقشہ باقی رہ جائے گا جو اس نے اس روز دیکھا تھا۔ اس ناخوشگوار واقعے کی ہریاوا اس کمرے سے مٹا دینے کے لیے ہی اس کے انٹیریئر پر اتنا پیسا انہوں نے خرچ کیا تھا اور یہ سچ تھا کہ شازیہ جو ادھر آنے سے پہلے تک اس سب کچھ جو اب یہاں موجود نہیں تھا کہ تصور سے ہی ہول رہی تھی مگر یہاں آنے کے بعد اسے اب وہ منظر قطعی یاد نہیں آ رہا تھا وہ اس نئی سجاوٹ اور اس کی نفاست میں کھو گئی تھی۔

اسی شام روٹین کے ایسے پیشینٹس کے علاوہ جن کی اپائنٹمنٹس کنفرم تھیں ایک نوجوان لڑکا بغیر اپائنٹمنٹ کے ڈاکٹر صبور سے ملنے آیا۔ چاچا شریف اس کے اندر چلے آنے پر مزاحمت کر رہا تھا مگر وہ اندر گھس آیا تھا۔

''کوئی بات نہیں چاچا شریف آپ جایئے۔'' شازیہ اس روز والے واقعے اور ڈاکٹر صبور کے لیکچر سے سبق سیکھ چکی تھی یہ اطمینان بھی اسی لیے تھا کہ یہ لڑکا بے ضرر دکھائی دے رہا تھا اور اس کے پاس کوئی خطرناک اسلحہ بھی نہیں تھا۔

''میرا نام فیضان مقصود ہے۔'' اس نے شازیہ کی کرنسی سے متاثر ہوتے ہوئے کہا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے نام کے ساتھ دو تین ڈگریز بھی کارڈ پر درج تھیں، ایم بی اے فنانس، ایم بی اے مارکیٹنگ اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ کسی فرم میں ہیومن ریسورس منیجر کے عہدے پر فائز تھا۔ شازیہ نے ایک دفعہ نظر اٹھا کر اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ ''بڑی ڈیشنگ پرسنالٹی ہے بھئی۔'' اس نے اپنے حساب سے سوچا۔ ''مگر یہ چہرہ کہیں دیکھا دیکھا کیوں لگ رہا ہے۔''

''چند روز پہلے ڈاکٹر صبور کے پاس ایک مریض لایا گیا تھا اس کا نام سلمان مقصود تھا۔'' شازیہ کے کان کھڑے ہو گئے اور دل پتے کی طرح لرزا۔

''اس روز ہمارے آدمیوں نے یہاں آپ لوگوں کے ساتھ مس بی ہیو کیا اور ہنگامہ آرائی بھی کی۔ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس معذرت کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔'' شازیہ نے چونک کر

اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

''دراصل گزشتہ دو ہفتوں سے میں سنگاپور اپنے کام کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ میری عدم موجودگی میں ہی سلمان کو یہاں لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ فیصلہ تو ٹھیک تھا مگر اس پر جس بھونڈے طریقے سے عمل کیا گیا اس نے میرا سر شرم سے جھکا دیا۔ مہذب اور شریف لوگوں کے ساتھ ایسا غیر مہذبانہ اور تھرڈ کلاس سلوک ناقابل معافی جرم ہے یہ تو ڈاکٹر صاحب کی شرافت ہے ورنہ وہ چاہتے تو اس احمقانہ فعل کے جواب میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میں معذرت خواہ ہوں مس کہ آپ کا ٹائم لے رہا ہوں۔'' پھر اس نے دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی غلط ہے کہ میں بغیر ملاقات کا وقت طے کیے ادھر آ گیا۔ دراصل مجھے معلوم ہوا تھا کہ کل سے ڈاکٹر صاحب کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے ملائشیا جا رہے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کسی طرح سے سہی میں آج ان سے ملاقات کر ہی لوں۔ کیا میں صرف چند منٹ کے لیے ان سے مل سکتا ہوں۔'' کلائنٹس ان ویٹنگ کی نشستوں پر تین لوگ بیٹھے تھے اور وہ شازیہ کی ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ان تین لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ بہت آہستگی سے بول رہا تھا۔ شازیہ اس روز آنے والوں سے پہلے ہی ڈری ہوئی تھی اسے اس نوجوان کی آمد بھی پراسرار لگی۔

''ٹھیک ہے، میں ڈاکٹر صاحب سے بات کرتی ہوں، ویسے وہ بغیر اپائنٹمنٹ کے کسی سے ملتے نہیں ہیں۔'' اس نے رٹا رٹایا جملہ دہرایا اور اندر موجود کلائنٹ کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

رابطہ ہونے پر حسب توقع ڈاکٹر صاحب نے آنے والے سے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ یوں وہ تقریباً تین گھنٹے بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنے والے اکثر لوگ اپنے مقررہ وقت پر آتے تھے اور اپائنٹمنٹ مکمل ہوتے ہی لوٹ جاتے تھے۔ ان لوگوں کو زیادہ تر تعداد معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایسے لوگ جو اپنے ذہنی تفکرات، ڈپریشن، مسائل کسی کے سامنے کھولنا نہیں چاہتے تھے نہ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی کو ان کی ڈاکٹر صبور کے پاس آمد کا علم ہو سو اکثر تنہا ہی آتے تھے۔ جتنا ٹائم وہ یہاں رہتے تھے اس کا بیشتر حصہ ڈاکٹر صبور کے دفتر میں گزرتا تھا۔ سو شازیہ کی اکثر سے شناسائی صرف ان کے ناموں اور رسمی ہیلو ہیلو تک ہی محدود تھی۔ اس سلسلے میں بھی ڈاکٹر صبور کی طرف سے اسے سختی سے ہدایت تھی کہ وہ باہر کسی کے سامنے کسی کا نام نہیں لے گی اور شازیہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں اور ان کی حساسیت کو اچھی طرح سمجھتی تھی مگر یہ ملاقاتی جسے

تقریباً تین گھنٹے انتظار کرنا تھا، اسے وقت گزاری کے لیے صرف دیواریں اور فرش ہی نہیں دیکھنا تھا۔ اس نے اس دوران شازیہ سے اس کا نام، تعلیم اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھی تھیں اور پھر اپنے بارے میں بھی بتایا تھا۔

''سلمان میرا چھوٹا بھائی ہے، اس روز جو یہاں آیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''میرے ابے کی طرح اس نے بھی بندہ مار دیا۔'' شازیہ کے ذہن میں اس روز کا منظر اور اس لڑکے کی اچھل کود اور بے ربط گفتگو گھوم گئی۔

''اسے وہم ہو گیا ہے کہ ہمارے والد صاحب نے دو بندوں کا قتل کر دیا ہے۔'' نوجوان نے مزید بتایا۔ ''ہمارے والد صاحب اپنے علاقے کے معززین میں شمار ہوتے ہیں۔ ہماری لمبی چوڑی زمین داری ہے۔ اللہ کے فضل سے کسی چیز کی کمی نہیں پھر بھی نہ جانے کیوں سلمان کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ دو قتل انہوں نے کیے ہیں، وہ اچھا خاصا او کاڑہ کے ایک اسٹینڈرڈ اسکول میں او لیول کر رہا تھا۔ اس کا شمار انتہائی اچھے اسٹوڈنٹس میں ہوتا تھا مگر جب سے یہ فٹس اسے پڑنے لگے ہیں وہ کسی کام کا نہیں رہا پڑھائی چھوٹی، دوست یار چھوٹے اس کے دوروں میں شدت آنے لگی اور جب بھی اس قسم کا شدید دورہ پڑتا ہے مجبوراً اسے ایک کمرے میں بند کرنا پڑتا ہے۔'' شازیہ نے دیکھا یہ حالات سناتے ہوئے اس نوجوان کے چہرے پر عجیب سی اذیت تھی۔

''ہم دو بھائی ہی ہیں۔'' پھر اس نے اپنے ہاتھ کے ناخنوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بی ایس سی کرنے کے بعد انگلینڈ چلا گیا۔ کچھ دن آسٹریلیا میں بھی رہا کچھ عرصے پہلے ہی واپس لوٹا ہوں۔ ہمارے والدہ حیات نہیں ہیں میری عدم موجودگی ہی میں سلمان کے ذہنی بحران کا سلسلہ شروع ہوا۔ اباجی کو ڈاکٹر عبدالصبور کے بارے میں کسی نے بتایا تھا۔ انہوں نے اپنے آدمیوں کے ساتھ سلمان کو ادھر بھیج دیا۔ خود وہ علاقائی سیاست کے کسی جھگڑے میں الجھے ہوئے تھے۔ ان کے یا میرے ساتھ موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہی اس روز والی صورت حال پیش آئی۔ ہمارے یہ ملازم صرف شاہ کے وفادار ہوتے ہیں اور دھونس دھمکی سے کام نکلوانا ان کا شیوہ ہے۔ ان کے مزاج بدلنے کے لیے کافی عرصہ درکار ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں کی روایات کچھ بدلیں مگر یہ اتنی جلدی ممکن نہیں۔'' وہ ساری توجیہات اور معذرتیں شازیہ کے سامنے پیش کیے چلے جا رہا تھا۔ اب کیا وہ ڈاکٹر صبور کو بھی یہی باتیں سنائے گا۔ شازیہ نے سوچا۔

''وہاں مغرب میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں حکومت ایسے ذہنی مریضوں کو اپنی ذمے داری سمجھتی

ہے اور انتہائی منظم اور اچھے طریقے سے ان کا علاج کیا جاتا ہے۔ ذہنی صحت وہاں پہلی ترجیح سمجھی جاتی ہے۔'' پھر اس نے بتایا۔ ''مگر یہاں آپ دیکھیں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ آپ نے کبھی یہاں کے مینٹل ہاسپٹلز نہیں دیکھے ہیں۔ وہاں مریضوں سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ اس ماحول میں جو وہاں ہے شاید ہی کوئی مریض صحت یاب ہو بلکہ مجھے تو امید ہے کہ اگر وہاں پہنچ جانے والا مریض نوے فیصد بیمار ہوگا تو وہاں جا کر سو فی صد بلکہ ایک سو دس فی صد ذہنی تنزلی کے اسٹینڈرڈ پر پہنچ جاتا ہوگا۔ پھر یہ ڈاکٹر عبدالصبور جیسے ڈاکٹرز ہیں۔'' پھر اس نے ڈاکٹر کے آفس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ کتنے لوگوں کی پہنچ میں ہیں۔ ان کی فیسز، ان تک پہنچنے کا سامان کون اور کتنے کر سکتے ہیں۔ بس ہر طرف اندھیر نگری ہے۔'' وہ بولا۔

''ڈاکٹر عبدالصبور سنا ہے کہ اپنے پاس آنے والوں کی کیس ہسٹری کسی سے ڈسکس نہیں کرتے۔'' اس کے سامنے بیٹھے شخص نے دوبارہ گفتگو شروع کی۔

''یقیناً۔'' شازیہ نے سر ہلایا۔

''بس یہی ایک چیز ہے جو ہمیں ڈاکٹر صاحب تک لے آئی ہے۔'' اس نے میز کی سطح پر انگلیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ''دراصل ہمارا سیٹ اپ، والد صاحب کی سیاسی پوزیشن، علاقے کی چوہدراہٹ سب کچھ اس طرح کا ہے کہ وہاں یا یہاں کہیں بھی سلمان کی ذہنی صحت کے بارے میں کسی کو پتا نہیں لگنا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ خاموشی کے ساتھ وہ علاج کے مختلف اسٹیجز سے گزرتا صحت یاب ہو جائے۔ ہم نے علاقے میں بھی یہ بتایا ہوا ہے کہ سلمان پڑھنے کے لیے باہر گیا ہوا ہے۔'' اس کی اس بات پر شازیہ چونکی۔

''کیا کیا مجبوریاں ہوتی ہیں ان بڑے لوگوں کی بھی۔'' اس نے سوچا اور ڈاکٹر صاحب کے کال کرنے پر اس نوجوان کو اندر بھیج کر وہ اسی موضوع پر سوچتی رہی۔ ''یقیناً وہ سیٹ اپ اور چوہدراہٹ جس پر ناز کرتے ہوئے یہ شخص اس کا حوالہ دے رہا ہے اس بیچارے لڑکے کی ذہنی عدم توازن کی بنیادی وجہ بنا ہوگا۔''

''اسے وہم ہو گیا ہے کہ والد صاحب نے دو قتل کیے ہیں۔'' ''ہونہہ'' اس نے نخوت سے سوچا۔ ''وہم نہیں یقین ہوگا اسے بلکہ وہ تو کہیں غلطی سے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہوں گے۔ اصل میں تو ابا جان کے ہاتھ نہ جانے کتنے لوگوں کے خون سے رنگے ہوں گے۔'' اسے اپنا علاقہ اور وہاں کا نظام یاد آ رہا تھا۔ اسے ایک مرتبہ پھر یاد آ رہا تھا کہ کتنا بے دھڑک ہو کر سجاد نے

حمیرا کو قتل کیا تھا۔ اس شہ پر کہ باپ اور تایا چچا اسے غیرت کے اس اظہار پر شاباش دیں گے اور وہ برادری کا ہیرو بن جائے گا، جب چاہے کسی بھی لڑکی کو غیرت کے نام پر قتل کرنے کا لائسنس اسے مل جائے گا۔ اس کا حلق کڑوا ہونے لگا اور اس کے اندر تلخی بھر گئی۔

وہ دن حسن کمال کے لیے یقیناً سرپرائز لے کر آیا تھا۔ اس کے غریبانہ کمرے کی اسپرنگ ٹوٹی چارپائی پر بچھے پرشکن بستر پر ایک نفیس پیکٹ رکھا تھا اور اس کے ساتھ رکھے پھولوں کے بو کے کی خوشبو سے وہ تنگ و تاریک کمرا مہک رہا تھا۔ اس نے پیکٹ اور پھول اٹھا کر کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی جیسے کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ رہا ہو جو یہ چیزیں یہاں رکھنے کے بعد کہیں چھپ کر بیٹھا ہو مگر اسے وہاں کون نظر آ سکتا تھا۔ اس نے بیگ پر پرعذ اس مہنگے ترین اسٹور کا نام پڑھا اور مزید حیران ہوا پھر اس نے اس کے اندر رکھے پیکٹ کو باہر نکالا۔ اس پیکٹ پر ویلنٹائن ڈے کی مبارکباد کا پیغام دیتا سرخ پھولوں سے مزین خوبصورت ریپنگ پیپر چڑھا تھا۔ اس نے احتیاط سے اس ریپنگ پیپر کو اتارا اور اندر موجود وہ پینٹ اور شرٹ نکالی جس کو خود خریدنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شرٹ کی سامنے کی جیب پر کامن پن سے چپکا ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ بھی تھا جس پر خوبصورت لکھائی میں ایک پیغام تحریر تھا۔

"حسن کمال، اگر آپ اپنے لباس کے معاملے میں اتنے بے پروا نہ ہوں تو یقین جانیے اس سے کہیں زیادہ اچھے لگیں جیسے آپ اس طرح لگتے ہیں۔"

زندگی میں پہلی مرتبہ ایک لطیف سی کیفیت اس کے ذہن و دل پر چھا گئی۔ اس نے کچھ دیر اس پیغام کو بار بار پڑھنے میں لگائی پھر پیکٹ اور بیگ اور پھولوں پر چڑھے ریپر کو الٹ پلٹ کر دیکھا شاید دینے والے کا کوئی نام پتا درج ہو مگر اس میں اسے ناکامی ہوئی پھر اس نے کمرے کی ہر چیز ٹٹولی شاید کہیں سے کوئی نشان مل جائے مگر کہیں کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی پھر اس نے کمرے میں موجود واحد زنگ آلود کرسی پر بیٹھ کر ان تمام چیزوں کا بغور جائزہ لیا۔ کون تھا جسے پینٹ اور شرٹ سے متعلق اس کے سائز کا اتنا اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہ حیران ہوتا رہا پھر اس نے وہ چیزیں وہیں چھوڑیں اور ایک ایک کر کے اپنی تینوں ممانیوں کے پاس گیا۔

"اس روز گھر میں کون کون آیا تھا۔ کس کا کون مہمان آیا تھا، کیا صرف حسن کمال سے ملنے کے لیے کوئی آیا تھا۔" اسے ہر سوال کا جواب نفی میں ملا۔ اس نے گھر میں موجود تمام بچوں سے بھی

تفتیش کر کے دیکھ لی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

اس کارروائی کے بعد وہ دوبارہ اپنے اس اجڑے کمرے میں لوٹ آیا جس میں ایک نشاط آمیز احساس اس کا منتظر تھا۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس کے ذہن و دل کے سلگتے احساسات پر جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑنے لگے۔ اسے بچپن میں پڑھی پریوں کی کہانیاں یاد آئیں جن میں محروم بچوں کو خاص دنوں پر کوئی بونا، کوئی پری، کوئی نرم دل جن اس قسم کے تحائف دے جاتا تھا۔ اسے سانتا کلاز سے متعلق پڑھی کہانیاں بھی یاد آئیں جو کرسمس کے موقع پر بچوں کو تحائف دیتا ہے۔ اس کی ساری دانشوری، تعقل اور مباحث کہیں ہوا ہو گئی جو بھی جب بھی جیسے بھی یہاں رکھ گیا حسن کمال اس انوکھی بات کی خوشگواریت کو کچھ دیر محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس روز رات گئے تک وہ سوچ میں پڑا رہا۔ کون تھا جس نے اسے یہ اہمیت دی تھی یقیناً جو بھی تھا اس نے اس کا مذاق اڑانے کی خاطر ایسا کیا ہوگا مگر مذاق اڑانے کے لیے خاص یہ دن کیوں چنا گیا۔

ویلنٹائن ڈے، محبت کرنے والوں کا دن، رات بھر حسن کمال کے کانوں میں گھنٹیاں بجتی رہیں اور اچھلتے کودتے دل اس کی نظروں کے سامنے گھومتے رہے۔ اس کا ویران اجاڑ کمرا پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور اس کے سرہانے ویلنٹائن ڈے کا گریٹنگ کارڈ دھرا تھا جس پر شفاف کانچ کے ڈبے میں بند سرخ رنگ کا دل بنا تھا۔ وہ دنیا بھر سے بڑے بڑے موضوعات پر بحث کرنے والا، عالمی حالات پر تبصرے لکھنے والا، اپنے حلقے میں سب سے زیادہ ذہین اور دانشور کہلایا جانے والا اندر سے کتنی محرومیوں اور تلخیوں کا شکار تھا کہ کسی انجان کی یہ چھوٹی سی ادا اسے لطیف خوشگوار کیفیات میں بری طرح مبتلا کر گئی تھی۔

اگلی صبح اس گھر کے تمام مکینوں نے بڑی حیرت اور دلچسپی کے ساتھ حسن کمال کو دیکھا تھا جب وہ تیار ہو کر دفتر جانے کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ نکڑ والے حمام پر صبح صبح جا کر وہ اپنے بالوں کی کٹنگ اور شیو کروا کر آیا۔ نہا دھو کر اس نے دھوبی سے استری کرائی وہ نئی پینٹ اور شرٹ زیب تن کر رکھی تھی جو اس سے پہلے اسے کسی نے پہنے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سلیقے سے کنگھی کیے بال اور پالش شدہ جوتوں میں وہ کہیں سے بھی وہ حسن کمال نہیں لگ رہا تھا جو اپنے لباس اور حلیے کے معاملے میں بری طرح بے پرواہ تھا۔

"ہا...... ہائے۔" اس کی منجھلی ممانی جو سب سے نیچے والی منزل میں رہتی تھی ان کے ہاتھ سے تو باقاعدہ برتن چھوٹ کر نیچے جا گرے تھے۔ وہ اپنا دوپٹا منہ پر رکھے کھڑی کی کھڑی رہ گئیں

حسن کمال گھر سے باہر نکل گیا۔ گلی میں کھیلتے بچے، باہر بازار میں آتے جاتے رکشے، دکانیں، دکاندار، دودھ، دہی، لسی بیچتا گاما پہلوان، پیڑے کو دو چپت لگا کر پوریاں بنا کر بڑی سی کڑاہی میں ڈالتا رشید حلوائی کا لڑکا۔ یہ سب روز کے دیکھے ہوئے منظر حسن کمال کو آج نئے نئے اور دھلے دھلے لگ رہے تھے۔ اس کے ذہن و دل پر چھائی ساری کیفیات ہی بدل گئی تھیں۔ آج تو اس کے قدم بھی نئے انداز میں اٹھ رہے تھے۔

ماہنامہ ''اون لکر'' کا تازہ شمارہ شائع ہوا۔ پہلے صفحے پر مہرین کیانی اور حسن کمال کے علاوہ کرن فاطمہ کا نام بھی درج تھا۔ دو تین کالمز پر بھی اس کا نام موجود تھا۔ محدود سے قارئین نے یہ تبدیلی محسوس کی تھی اور تعریف و تنقید کے فون، خطوط اور ای میلز موصول ہونے لگی تھیں۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ زیادہ تر لوگوں نے کرن فاطمہ کی آمد کو پسند کیا تھا۔

کرن فاطمہ خود بھی بے حد ایکسائیٹڈ تھی۔ اس نے سب گھر والوں کو اس خوشی میں آئس کریم کیک کھلایا تھا اور اپنے ملنے ملانے والوں کو ''اون لکر'' کی ایک ایک کاپی بھجوائی تھی۔ اسے بھی مختلف لوگوں کی طرف سے مبارکباد کے مضمون موصول ہوئے تھے مگر اس کے لیے سب سے اہم تبصرہ اس کے چامیاں کا تھا۔ جرم و سزا کے موضوع پر لکھا اس کا واقعہ انہیں پسند آیا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ اسے سر آرتھر کونن ڈائل اگر زندہ ہوتے تو اپنی شاگردی کا شرف ضرور بخشتے۔ شکاریات والا آرٹیکل ان کا خیال تھا، زیادہ تر سرقہ تھا ادھر اُدھر کے ادب سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہوا، البتہ نفسیاتی مسائل پر اس کے جوابات کی انہوں نے بھرپور تعریف کی تھی۔

''جس کا کام اسی کو ساجھے، شاید اسی کو کہتے ہیں فاطمہ بی بی۔'' انہوں نے تفصیل سے پہلے فاطمہ کی کاوشوں کو سننے کے بعد کہا۔

''حسن کمال البتہ تمہارے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا ہے، میں اس کے لیے یا وہ میرے لیے۔''

''دونوں ایک دوسرے کے لیے۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا، ویسے اس ایشو کا مثبت اثر پڑے گا اس کے ذہن پر اور آہستہ آہستہ وہ عادی ہو جائے گا تمہاری موجودگی کا۔ ویسے وہ لڑکی مہرین اس کا کیا خیال ہے تمہارے بارے میں؟'' چامیان نے اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو بہت اچھی ہیں اور مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں، انہیں میرا کیا ہوا کام پسند آتا ہے اور

وہ اس کی تعریف بھی کرتی ہیں۔''

''تو بس پھر گھبرانے کی کیا بات ہے، اصل میں تو ایڈیٹر وہ ہی ہے نا، اور میرا خیال ہے کہ یہ لڑکا حسن کمال بھانپ چکا ہے کہ تم میں ٹیلنٹ بھی ہے اور پوٹینشل بھی۔''

''یہ بات بھی ہو سکتی ہے۔'' کرن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''مگر چامیاں یہ بھی حقیقت ہے کہ حسن کمال بہت ٹیلنٹڈ لڑکا ہے۔ اس کا وژن بہت وسیع ہے۔ وہ چیزوں، لوگوں اور واقعات کا جس طرح تجزیہ کرتا ہے ایسے بہت کم لوگ کر سکتے ہیں۔ اسے اپنی گفتگو اور کام پر پوری کمانڈ حاصل ہوتی ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''تو بس اس کو گرو مان کر اس سے سیکھنا شروع کر لو، اپنے پتے میز پر رکھو اور اسے کہو تم جیتے میں ہاری۔''

''مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ میں کسی سے کم تو نہیں، میرا ابھی تو پہلا پہلا تجربہ ہے آگے آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔'' کرن ہار ماننے پر قطعی تیار نہ تھی۔ ''اور میں ہار مانوں بھی تو کس سے۔'' اس نے سوچا اور اس کے تصور میں بکھرے اُلجھے بالوں، پر شکن لباس، بڑھی ہوئی شیو بغیر پالش کے جوتوں والی وہ شخصیت آ گئی جس کی صلاحیتوں کی بہر حال وہ دل سے معترف تھی۔ ''چلو، کل دفتر جاؤں گی تو اس سے کہوں گی کہ بھائی حسن کمال میں نے سمجھ لیا ہے کہ کچھ میدان ایسے ہیں جنہیں مارنے کے لیے مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس نے فیصلہ کیا۔

مگر اگلے روز جب وہ دفتر پہنچی تو جہانگیر، نعیم اور مہرین تینوں کے چہرے پر ایک عجیب پر اسرار سی مسکراہٹ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

''کیوں' کیا بات ہے، کیا میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہیں جو تم مجھے دیکھ دیکھ کر یوں مسکرا رہے ہو؟'' اس نے نعیم سے پوچھا۔

''نہیں۔'' نعیم نے دائیں سے بائیں سر مارتے ہوئے کہا۔ ''سینگ تمہارے سر پر نہیں کہیں اور اگے ہیں اس لیے مسکرا رہا ہوں۔'' کرن نے تیزی سے پورے کمرے کا جائزہ لیا مگر اسے کوئی نئی انہونی، انوکھی بات نظر نہیں آئی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے مہرین سے پوچھا۔

''ابھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔'' مہرین نے کچھ لکھتے لکھتے جواب دیا اور تقریباً دس منٹ کے بعد حسن کمال کی اس آفس میں آمد کے ساتھ ہی اسے ان ذو معنی مسکراہٹوں کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ حسن

کمال اس روز پہچانا نہیں جا رہا تھا اس کی شخصیت کا سارا انتشار کہیں کھو گیا تھا اور وہ ایک نہایت نفیس اور سلجھا ہوا نوجوان نظر آ رہا تھا۔

''ذرا سے بھی اسکا لر نہیں لگ رہے اس طرح تم۔'' کرن نے اپنا چونکنا چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔

''لوگ جینلس ہو رہے ہیں جہانگیر یار، کمرے میں کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے۔'' حسن کمال نے اس کی تنقید کا قطعی نوٹس نہ لیتے ہوئے کہا۔

''آج ویلنٹائن ڈے ہے کرن فاطمہ، حسن بھی کسی کو چارم کرنے جا رہا ہوگا۔'' مہرین نے بدستور لکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''او..... ویلنٹائن ڈے۔'' کرن کو یاد آیا۔ ''نعیم تمہیں یاد ہے آج ہم مختلف اسٹورز سے ویلنٹائن ڈے کارڈز کے فوٹو زلینے جا رہے ہیں۔''

''ہاں، ہاں، گاڑی نیچے کھڑی ہے تم لوگ ضرور اور جلدی نکلو۔'' مہرین نے پہلی مرتبہ سر اٹھایا۔

''سب سے پہلے حسن بھائی کے خیالات پوچھ لیں ویلنٹائن ڈے کے بارے میں پھر شاپنگ کرنے والوں سے پوچھیے گا۔'' جہانگیر کا حسن کا نیا روپ کچھ زیادہ ہی مزہ دے رہا تھا۔

''دراصل پہلے تو ''اون لکر'' کی ساری کی ساری ڈے داری مجھ غریب پر عائد ہوتی تھی اس لیے خود اپنے آپ کو دیکھنے اور مین ٹین کرنے کا خیال نہیں آتا تھا بس جب کہ آدھی سے زیادہ ڈے داری کرن بی بی نے سنبھال لی ہے تو سوچا اب اپنی طرف بھی توجہ دے لوں۔ ویسے جہانگیر میاں میں اصل میں ایسا ہی ہوں۔'' حسن یہاں بھی فقرے بازی کرنے سے نہیں چوکا تھا۔

''فکر نہیں کیجیے، اس ماہ کے بعد آپ کو اتنی فرصت مل جائے گی کہ اگر آپ ہر قسم کی ڈے داری سے آزادی ہو کر جنگلوں، ویرانوں میں کوئی چلہ کاٹنے کا پروگرام بنائیں تو بغیر کسی رکاوٹ کے پورا ہو سکتا ہے۔'' کرن جو صلح کے موڈ میں دفتر آئی تھی بھڑک کر بولی۔ ساتھ ہی اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈال لیا۔

''چلیں نعیم، مہرین آپی اور ہدایت۔'' چلتے چلتے اس نے پوچھا اور مہرین کے نفی میں سر ہلانے پر نعیم کے ساتھ باہر نکل گئی۔

''کچھ نہیں بننے کا حسن بھائی۔'' جہانگیر نے اس کے جانے کے بعد کمرے کے وسط میں

کھڑے حسن سے کہا۔ ''آپ کا ''ڈوئل'' سخت حریف سے پڑا ہے اس بار۔''

''نہیں یار، یہ ڈوئل نہیں ہے۔'' حسن مسکرایا۔ ''ایسے ہی مذاق ہے اور کچھ نہیں۔''

''حسن بھائی کی کایا کلپ ہوگئی آج تو، حلیہ بھی بڑا بدل گیا اور موڈ بھی۔ نعیم ذرا پتا تو لگواؤ خیر تو ہے کہیں منگنی شنگنی تو نہیں ہوگئی حسن بھائی کی، یہ کپڑے بھی اُدھر سے ہی آئے ہوں۔'' اب جہانگیر ذرا سنجیدہ ہو کر بولا۔

''مجھ سے منگنی، شادی کروانے سے تو بہتر ہے کہ لڑکی کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دے۔ بھائی، کیوں مذاق کرتے ہو۔'' حسن نے اس کی سیٹ پر بیٹھ کر کمپیوٹر آن کرتے ہوئے کہا۔

''افسوس، کنوئیں عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے آج کل۔'' جہانگیر نے افسردگی سے کہا۔ ''لڑکی کو کوئی اور طریقہ اپنانا پڑے گا آپ سے جان چھڑوانے کے لیے۔''

''بس بھئی باتیں ختم کرو، آج تو یہ طے ہے کہ حسن اس ''حلیہ بدل'' دن کو منانے کے لیے ہمیں لنچ کھلا رہا ہے۔ کیوں حسن۔'' مہرین نے اپنا کام ختم کر کے کہا۔

.....

''لو پھر بسنت آئی
پھولوں کے رنگ لائی''

مہ پارہ بیگم، رباب سے گیت سن رہی تھیں اور اس کی آواز کے زیر و بم اور سانس پر کنٹرول دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اس لڑکی میں وہ خاصیت نظر آ رہی تھی جو ان لوگوں میں ہوتی ہے جو شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

''آج تمہارا تسلسل نہیں ٹوٹا۔'' رباب نے گیت ختم کیا تو مہ پارہ بیگم نے گلوری منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ بڑی خوش آئند بات ہے، ایک بات پلے سے باندھ لو، صبح منہ اندھیرے اٹھ کر وضو، نماز کے بعد ایک تسبیح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکرانے کی پڑھنے کے بعد ریاض شروع کیا جائے تو آواز کی لوچ اور رسیلے پن میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ تم دیکھو جو تنہائی صبح کے اس سہانے وقت پرندوں کی چہچہاہٹ میں ہوتی ہے وہ باقی سارا دن محسوس نہیں ہوتی، یہی حال انسان کی آواز کا ہے۔''

رباب نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بڑے غور سے ان کی بات سنی۔

''آپ جانیں میڈم، میں کیوں صبح صبح آپ کے پاس آتی ہوں۔'' اس نے متانت سے

کہا۔ ''صبح کا یہ منظر جو آپ کی اس حویلی میں نظر آتا ہے، اور یہ فضا، پرندوں کی یہ چہچہاہٹ شہر میں کہاں دیکھنے اور سننے کو ملتی ہے آپ ان پرندوں کا اتنا خیال رکھتی ہیں، دانے اور پانی کی سلوریاں جو چھت پر پڑی رہتی ہیں کبھی خالی نہیں ہوتیں۔ جبھی یہ بڑی تعداد میں یہاں آتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی حمد وثناوہ یہاں آکر کرتے ہیں شاید ہی شہر میں کہیں اور کرتے ہوں۔''

''شہر تو جب میں جاؤں اور کہیں ایک دن صبح سے شام تک رہوں تو سوچتی رہتی ہوں خدایا، کہیں پرندوں کی آواز سنائی کیوں نہیں دیتی۔ وہ معصوم بیچارے اس شور اور ہنگامے سے ڈر کر معلوم ہوتا ہے کہیں شہر سے باہر نکل جاتے ہیں یا پھر کہیں دبکے رہتے ہیں۔'' مہ پارہ بیگم نے چھالیا کی ایک اور چٹکی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا اور رباب اپنے اردگرد کے منظر میں کھو گئی۔ جالی دار منڈیروں کی جھریوں سے طلوع ہوتے سورج کی کرنیں چھن کر اندر آرہی تھیں، صحن میں لگے پودوں کو انتری نے ابھی ابھی پانی لگایا تھا۔ ان کے پتے پانی کے قطرے ٹپکا رہے تھے۔ موتیا کے پودوں کے نیچے اور جوہی کے پودوں تلے کلیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مولسری کے درخت کے نیچے بھی ننھے ننھے پھول بکھرے پڑے تھے۔

''کتنا خوبصورت تمدن۔'' اس نے آنکھیں میچ کر سوچا۔

''بی بی جی، بی بی جی۔'' اسی اثنا میں اسے فتح خان کی آواز آئی جو مہ پارہ بیگم کے پرانے ملازم کالے خان کا بیٹا تھا اس نے آنکھیں کھولیں وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ ''وہ والے شمی جی آئے ہیں جی وہ جو کسی گاؤں سے آتے ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''باہر کھڑے ہیں۔''

''ارے جاکم بخت، ان کو باہر کیوں کھڑا کر چھوڑا، جلدی جا مہمان خانہ کھول کر انہیں بٹھا۔'' مہ پارہ بیگم بھی گھبرا کر تخت سے اتر کر اپنی جوتی ڈھونڈنے لگیں۔

''اری انتری، او شمو جلدی سے کھانے پینے کا اعلیٰ انتظام کرو۔'' رباب نے اپنی میڈم کو اتنا گھبراتے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''ایک زمانے میں ایک نامور مغنیہ ہوا کرتی تھی مہ پارہ بیگم۔'' اس روز چامیاں نے موسیقی کے بارے میں بات کرتے ہوئے کرن کو بتایا۔ ''گو وہ اتنی ناموری حاصل نہ کر سکیں جو اُن کے دور کی دوسری گلوکاراؤں کو حاصل ہوئی مگر قدرت نے ان کو کمال کی آواز عطا کر رکھی تھی۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا چامیاں؟'' کرن نے چائے کا مگ ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ ''قدرت نے کمال کی آواز بھی عطا کی اور لوگوں نے ان کو سنا بھی مگر وہ ناموری حاصل نہ کر پائیں، ایسا کیوں ہوا؟''

''ایسا اس لیے ہوا بھتیجی کہ اس زمانے میں آج کل کی طرح اپنا پیسا لگا کر شہرت حاصل کرنے کا رواج نہیں تھا۔ جن لوگوں کو خدا نے حقیقت میں ہنر عطا کر رکھا تھا ان کو اتنی ہی وضعداری بھی عطا کر دی تھی۔ وہ لوگ ایسے تھے کہ شہرت حاصل کرنے کی خاطر میرے تیرے کی خوشامدیوں، چاپلوسیوں اور شہرت عطا کرنے والوں کے سامنے بچھ بچھ جانے کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ مہ پارہ بیگم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھیں۔ ان کی وضع داری لکھنو اور دلی کی تہذیب کا حسین امتزاج تھی۔ اچھی خاصے نامور گائیک گھرانے سے تعلق تھا ان کا۔ ان کی والدہ شہ پارہ بیگم اور نانی جہاں آرا بیگم بھی اپنے اپنے ادوار کی مشہور گلوکارائیں رہ چکی تھیں۔''

''آپ نے ان کے گانے سنے'' کرن نے اس نئی اطلاع میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''جب ہم بہت چھوٹے تھے تو ہمارے ایک ماموں جان جو موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے۔

ان کے پاس بڑا گراموفون ہوا کرتا تھا۔ وہ جس پر کالے توے جیسے ریکارڈ چلتے تھے۔'' چامیاں نے کہا۔

''وہی جو سوئے رکھنے پر گھومتے تھے۔'' کرن نے کہا۔

''بالکل، بالکل۔'' چامیاں ہنسے۔ ''ان میں سے اکثر ریکارڈ شہ پارہ بیگم کی غزل گائیکی کی کلیکشن ہوا کرتے تھے۔ ماموں جان سنا کرتے تھے ہم بھی بڑے اشتیاق سے ان کے ساتھ بیٹھتے تھے بلکہ مجھے یاد ہے میں تو گھومتے ہوئے ریکارڈ کے ساتھ بھاگتے بھاگتے اس پر پرنٹ ہوئے گیتوں اور غزلوں کی فہرستیں اور گلوکاروں کے نام پڑھا کرتا تھا۔ بڑا مزہ آتا تھا مجھے اس ایکٹویٹی میں۔'' چامیاں اپنے بچپن میں جا کھوئے۔

''اور جہاں آرا بیگم کے توے آپ نے نہیں سنے۔'' یہ سوال عمیر بھائی نے کیا تھا جو اپنا چائے کا کپ لیے نہ جانے کب ادھر آ کر بیٹھے تھے اور یہ باتیں سن رہے تھے۔

''جہاں آرا بیگم کو گلے کا کینسر ہو گیا تھا۔ سنا تھا کہ ایک روز اچھی بھلی کوئی میوزک کانفرنس اٹینڈ کر کے سوئیں صبح اٹھیں اور حسب معمول ریاض کرنے لگیں تو عجیب پھنسی پھنسی آواز گلے سے نکلی سوچا شاید گلا خراب ہو گیا ہو۔ بہتیرے علاج کروائے مگر مرض بڑھتا گیا۔ آواز جانو بالکل گم ہو کر رہ گئی۔ اس زمانے میں چھپنے والے اکا دکا رسائل میں یہ خبر نمایاں انداز میں شائع ہوتی تھی ہماری شوقین مزاج ماموں نے ایسی خبروں کی بڑی کمنگو سنبھال کر رکھی ہوتی تھیں۔ ان کو فائلز میں لگاتے تھے۔ یہ جہاں آرا بیگم والی خبریں بھی ہماری پیدائش سے پہلے کی تھیں۔ اپنی چچی سے پوچھنا کہیں شاید پڑی ہوں وہ فائلز اور توے بھی جو ماموں جان اپنے ترکے میں مجھے عطا کر گئے تھے۔ ان کی نشانیاں سمجھ کر ایک عرصے تک میں نے بڑی سنبھال کر رکھیں مگر اس حادثے کے بعد مجھے بھی کچھ خبر نہیں کہ وہ ساری چیزیں کہاں گئیں۔''

''چامیاں'' کرن کو اس گفتگو میں اپنے لیے امید کی کوئی کرن نظر آ رہی تھی سو اپنی جگہ سے اٹھ کر عین چامیاں کے قدموں میں فلور کشن پر آ بیٹھی۔ ''تینوں گلوکارائیں پاکستانی تھیں کیا؟''

''ارے کرن فاطمہ، کیا احمقانہ سوال کیا تم نے۔'' عمیر بھائی نے حسب معمول اس کا مذاق اڑایا۔ ''بتا تو رہے ہیں چامیاں لکھنو اور دلی کی تہذیب کے بارے میں پھر یہ لوگ پاکستانی کیسے ہوئیں؟''

''مہ پارہ بیگم تو پاکستان ریڈیو پر ہی گایا کرتی تھی۔'' امی اور چچی جان بھی اپنے کام ختم کر

کے ادھر ہی آ گئی تھیں اور اس گفتگو میں حصہ لینے لگی تھیں۔'' اس کی ماں اور نانی کا پتا نہیں۔'' یہ بات کرن کی امی نے کہی تھی۔

''وہ کیا گایا کرتی تھی بھابی۔'' چچی جان نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''تیری یاد ستائے تو جب جب خواب میں آئے میرے ساجن پیارے۔''

''نہیں، یہ مہ پارہ بیگم نے نہیں گایا تھا۔ یہ شہ پارہ کی گائیکی تھی۔'' چامیاں نے تصحیح کی۔ ''مہ پارہ بیگم غالب اور فیفق کو گایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی سودا اور میر کا کلام بھی گاتی تھی۔ گیت بھی گاتی تھی میراجی کی ٹھمری کی بھی ماہر تھی۔''

''اور ان کی نانی جان کے متعلق کچھ نہیں بتا رہے آپ۔'' کرن نے بے چینی سے کہا۔

''لو بھئی اس کی سوئی اب نانی جان پر اٹک گئی۔'' عمیر بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔ کسی کو کچھ منگوانا ہو تو بتائے۔''

''آپ سی ڈیز کی دکان سے پتا کیجیے گا ہو سکتا ہے مہ پارہ بیگم کی غزلوں، گیتوں کی کوئی سی ڈی مل جائے۔'' کرن کو فوراً ہی نئی سوجھی۔ ''لو.....'' عمیر بھائی نے مذاق اڑانے کے سے انداز میں کہا۔ ''وہ محترمہ اپنے زمانے میں اتنی مشہور نہیں تھیں تو اب ان کی سی ڈی کون بنائے گا۔''

''چیک کر لینے میں کیا حرج ہے۔ آپ پتا تو کیجیے گا۔'' کرن نے اصرار کیا۔

''ٹھیک ہے دیکھ لوں گا۔'' عمیر بھائی سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''چامیاں۔'' کرن نے پھر اسی لائن پر سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو خاتون ہیں مہ پارہ بیگم ان کا تعلق اس بازار سے تو نہیں تھا جہاں سے اکثر ااس زمانے کی مشہور گلوکارائیں برآمد ہوا کرتی تھیں۔''

''اس کے بارے میں کچھ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی نانی کے بیک گراؤنڈ کا کچھ علم نہیں ہے۔ ہاں البتہ مہ پارہ بیگم نے جن دنوں گلوکاری کا آغاز کیا تھا اس وقت اس کی سرپرست مہرو جان تھی جو یقیناً اس بازار کی پروڈکٹ تھی گو وہ بھی خوب ہی آواز رکھتی تھی۔''

''مہرو جان کا گانا سننے تو آپ جناب بھی ہمراہ اپنے دوستوں کے کشاں کشاں جایا کرتے تھے ریڈیو پاکستان کی محفل موسیقی میں۔'' چچی جان نے یاد دلایا۔

''اور اکثر ہماری یعنی میری اور تمہاری ان چچی جان کی آپ کی لڑائیوں کی وجہ بھی یہی مہرو جان کی محافل موسیقی بنا کرتی تھی کیوں بھابی جان یاد ہے آپ کو۔'' چچا میاں ہنستے ہوئے بولے۔

''بہت اچھی طرح یاد ہے۔'' امی نے افسردگی سے کہا۔ ''تمہارے بھائی جان اللہ جنت نصیب کرے، صبح دفتر کے لیے تیار ہوتے ہوئے ریڈیو آن کر کے چھوڑتے تھے۔ اکثر ناشتا تیار کرتے انہی مہ پارہ بیگم کی وہ غزل سنتے کوئی تھی۔

بوئے گل، نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پھر رات گئے تک صاحب کی زبان پر یہی شعر چڑھا رہتا تھا۔ گنگنائے ہی چلے جاتے تھے۔ میں کہتی آخر..... یہ منحوس ہے کون جو سب کو پریشان کیے رکھتی ہے ہی کیوں کہا رکھتا بھی تو ہو سکتا ہے۔ میں کہتی یہ رکھتی ہی ہے۔ کیونکہ ایک مرزا غالب کو اور دوسرے ان کے سب مداحین کو پریشان کوئی خاتون ہی کر سکتی ہے مرد نہیں۔''

ایمزنگ۔'' کرن نے امی کی بات سن کر کہا۔ ''اس ملک کی تاریخ کا ایک اتنا دلچسپ باب آپ سب کے سینوں میں دفن ہے اور مجھے علم ہی نہیں۔ چا میاں، اس نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا۔ ''جھاڑیے کل ہی پورے گھر کو، میں اس خاندان موسیقی پر اچھی طرح ریسرچ کرنے کے بعد ایک آفت قسم کا سلسلہ مضامین لکھنا چاہوں گی تاریک کی گرد میں اٹے ان لوگوں پر اگر وہ موسیقی کے اسرار و رموز سے اتنی اچھی واقفیت رکھنے والے لوگ تھے تو پھر اپنے دور کی بات ان کی سرد دی تھی ہم کیوں ان کو گمنامی میں رہنے دیں۔''

''آئیڈیا برا نہیں۔'' چا میاں کے چہرے پر بھی مسرت جھلکی۔ ''اچھا خاصا مواد مل سکتا ہے اس موضوع پر۔''

''تو پھر شروع کرتے ہیں اس پر کام۔'' اون لکر'' کو آخر کار ایک اچھوتا موضوع مل ہی جائے گا جو نہ کاپی ہوگا نہ سرقہ بلکہ انتہائی اوریجنل چیز ہوگی۔ کرن نے جوش میں آتے ہوئے کہا۔ وہ اس نئے خیال پر بہت خوش تھی اور اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اون لکر کا مستقبل چمکتا نظر آ رہا تھا۔

.....o.....

سمعیہ سلطانہ جوں جوں کالج کی زندگی میں مزید کھب رہی تھی توں توں اس کے خیالات اور نظریات میں بھی نکھار آتا جا رہا تھا۔ اپنے پرانے محلے کا ماحول اسے برا لگنے لگا تھا۔ اپنا نو تعمیر شدہ گھر جو پرانے گھر کو گرا کر دوبارہ جدید خطوط پر بنایا گیا تھا کا ڈیزائن اسے ذہر لگنے لگا تھا۔ کم رقبے

پر بنا گھر منزل در منزل اونچا ہی اونچا ماتھے پر آرائشی ٹائلیں اور ابرق جیسی چمک ڈال کر تیار شدہ روغن سے آراستہ تھا۔ بیرون ٹائلوں کے بیچوں بیچ کالے ٹائلز پر سنہرے رنگ میں ماشاء اللہ اور حذا من فضل ربی کے الفاظ بھی جڑوائے گئے تھے۔ وہ گھر اس گلی کا سب سے نیا اور اچھا گھر تو بن گیا تھا مگر سمعیہ سلطانہ صرف ابتدائی چند ماہ ہی اس کی آرائش و زیبائش پر جوش ہو سکی تھی پھر اس کی نظریں کالج کے راستے میں آنے والے گھروں اور اپنی دوستوں کی کوٹھیوں پر پڑنے لگیں۔ کھلا اور اچھا ماحول ملے تو انسان کی سوچ اور گفتگو بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ ''یہ کہا کہ اس محلے میں جہاں سب ماجھے گامے، نتھو خیرے رہتے ہوں اس میں نیا گھر بنا لیا جائے اور گھر کا ماحول وہی کا وہی رہے۔''

''شکر کرنا چاہیے سمعیہ سلطانہ، اللہ تعالیٰ نے اپنی چھت عطا کی ہے۔ کرائے کے گھروں سے بچایا ہوا ہے۔ مرضی کا کھاتے ہیں، مرضی کا پہنتے ہیں کسی کی محتاج نہیں ہے۔ چین کی نیند سوتے ہیں۔'' اس کی امی نے کئی بار آہستہ آواز میں اسے سمجھایا تھا۔ امی کو ڈر تھا کہ اس کی بھابیاں اس کے نادر خیالات نہ سن لیں۔

''آپ کے لیے تو یہی کافی ہے۔'' سمعیہ ناک چڑھا کر کہتی۔ ''کیونکہ آ کی دنیا بھی یہاں تک ہی محدود ہے۔ یہاں سے نکلے تو ایک بیٹی کے گھر مستی گیٹ چلے گئے، وہاں سے نکلے تو دوسری کے گھر موچی دروازے چلے گئے۔ بہوئیں لائیں تو بھی یہیں سے۔ بھائی، دیور، نندیں سارے کے سارے انہی محلوں کے کمین سدا کے آپ کو باہر بڑے علاقوں اور ان کی رہائش گاہوں کی کیا خبر۔''

''شاید تو ٹھیک کہتی ہے۔'' اس کی اماں نے اس کے پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے اپنی کم علمی کا کھلے دل سے اعتراف کر لیا ''پر اب یہ تو مجبوری ہے۔ ابا تمہارے دائمی مریض ہیں۔ عمر بھر کی کمائی یہ چند مرلوں کا مکان ہے۔ اس میں بھی تین تمہارے بھائی حصہ دار ہیں۔ اس کو بیچیں اور نیا گھر بنانے کا سوچیں تو سوچیں کیسے۔''

''بھائی سارے اپنی کمائی کماتے ہیں۔ انہیں کہیں کہ اپنا کمائیں اور اپنے لیے ٹھکانے خود بنائیں۔ اس گھر کو اپنے اور ابا کے لیے رکھیں۔'' سمعیہ نے اپنے تئیں بڑا آسان سا حل پیش کیا مسئلے کا۔

''شاباش ہے۔'' اماں نے خفا ہو کر کہا۔ ''صدیوں کا دستور ہے۔ زمانے کے وارث بیٹے۔

ہم اس دستور سے بغاوت کر لیں، واہ بیٹی واہ۔'' انہوں نے افسوس کا اظہار کیا۔'' دوسرے یہ گھر کیا سدا سے ایسا تھا۔ ابا تمہارے بمشکل دیواریں کھڑی کر کے چار کمرے ہی ڈال سکے تھے۔ یہ سارے رنگ وروغن، چپس والے پکے فرش یہ آرائشی بتیاں اور رنگ برنگے پنکھے، سجاوٹ کا سارا سامان تمہارے باپ نے تو نہیں بنایا اس پر تیرے بھائیوں کی کمائیاں لگی ہوئی ہیں اور اب بھی جو ہم کھاتے پیتے ہیں نا اور دوسری ضرورتیں پوری کر رہے ہیں سمیت تمہاری تعلیم کے تو یہ سب تمہارے بھائیوں کی محنت کا نتیجہ ہی ہے۔ باپ پر ہی رہتیں تو یہ عیاشیاں اور مزے کہاں سے لوٹتیں۔

''بس آپ اپنے بیٹوں اور بہوؤں کی تعریفیں کر لیں۔ آپ کو تو موقع ملنا چاہیے۔'' سمعیہ نے منہ پھلا کر کہا۔

''تعریفیں نہ کروں تو اور کیا کروں۔'' اماں نے سرد آہ بھری۔ ''اب جتنی زندگی ہماری لکھی ہے ان بیٹوں کے سر پر ہی تو گزرنی ہے۔ ابھی تو بڑی ذمے داریاں، بڑے کام پڑے ہیں۔ تیری پڑھائی لکھائی ختم ہو تو بھائی تیرا گھر بسانے کی فکر کریں۔ تجھے اچھی جگہ پر اچھے طریقے سے بیاہنے کے لیے بھی تو پیسا چاہیے۔ چھوٹے والے کی شادی کا کام وہ اکیلا تو کر نہیں سکے گا۔ بڑے دونوں کی مدد کی ضرورت تب بھی پڑے گی۔ میں تو یہی دعا کر سکتی ہوں اب کہ اللہ تجھے ایسا بر نصیب کرے کہ تیری قسمت کھل جائے۔ تجھے بڑے علاقوں کی کوٹھیاں نصیب ہوں۔ کمانے والا شوہر ملے جس کے پاس بڑا گھر بار اور بڑی سی گاڑی ہو۔ تجھے شہزادیوں کی طرح رکھے۔ اللہ سوہنا تجھے کل جہاں کی نعمتیں عطا کرے۔'' انہوں نے چادر پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دعا مانگی۔

''میری پڑھائی جلد ختم ہونے والی نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں ایم اے کروں گی اور اس کے بعد نوکری بھی کروں گی۔ میں خود کماؤں گی اور اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ لوں گی۔ آپ مجھے کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہونے والے خواب نہ دکھائیں جیسے عمدہ گھر آپ نے بڑی دو بیٹیوں کے لیے ڈھونڈ لیے تھے ویسا ہی میرے لیے بھی تلاش کر لیں گی۔ مجھے ایسی راشن کی زندگی اور راشن کی خوشیاں نہیں چاہئیں۔ میں اپنا راستہ خود بنا لوں گی۔'' سمعیہ نے تنک کر جواب دیا اس کی اماں اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

''نوکری کرے گی تو تیرے بھائی اماں بابا سمیت گھر سے نکال باہر کریں گے تجھے۔ ایسا سوچو بھی نا۔'' انہوں نے تنبیہہ کی۔

''تو نکال دیں، بڑا احسان کر رہے ہیں آپ دونوں پر۔ ابا بیچارے ڈیوڑھی میں پڑے رہتے ہیں۔ دن رات، بہوئیں سارا دن کسی نہ کسی کام سے بھگائے رکھتی ہیں۔ اباجی دہی لا دیں۔ اباجی سبزی لا دیں۔ اباجی تندور سے نان تو پکڑ لائیں اباجی رکشے پر بٹھا دیں اور آپ کی کیا اوقات ہے خوب جانتی ہوں۔ کپڑے سارے ٹبر کے دھوئیں آپ سبزی بنائیں آپ۔ صفائی والی کے پیچھے پیچھے وائپر پکڑ کر پھریں آپ۔ سارا سارا دن ان کے کپڑوں سے میچنگ دھاگے، لیسس، فیتے، بٹن ڈھونڈنے کے لیے خوار ہوں آپ۔ یہ آپ دونوں میاں بیوی پر احسان کر رہے ہیں بیٹے آپ کے جو میرے نوکری کرنے پر میرے ساتھ آپ کی ذمے داریاں پوری کر لوں گی۔''

اماں بیچاری سمعیہ کے منہ سے یہ زہر نکلتا دیکھ کر ششدر رہ گئیں یہ وہ بہن بول رہی تھی جس کو بھائیوں نے ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا ہوا تھا۔ ان کی بیویوں کی مجال نہیں تھی اس کے سامنے چوں چرا کر جائیں۔ مہینے کے مہینے تینوں بھائی سمعیہ کا جیب خرچ گھر کے کل خرچ کے علاوہ دیتے تھے۔ آگے پیچھے بھی وہ اپنی مختلف ضرورتوں کے لیے مانگتی ہی رہتی تھی اور وہ تینوں ہنس کر اس کے مانگنے سے دگنا دے دیتے تھے۔ ایسی محبت اور چاؤ چونچلے وہ اپنی بیویوں اور اولادوں کے بھی نہیں کرتے تھے۔ گرمی سردی ہر موسم میں سمعیہ کے لیے کئی کئی جوڑے آنے لازمی تھے۔ چاہے کوئی اور گھر میں بنائے نہ بنائے۔ اس کے جوتے، اس کی جیولری، چوڑیاں، کلپس ایک ایک چیز کپڑوں سے میچ کرتی تھی پھر بھی وہ انہی بھائیوں سے بغاوت کو سوچے بیٹھی تھی۔

''دیکھ سمعیہ، تیرے بھائیوں جیسے ہیروں کی تو لوگ دعا کرتے ہیں۔ تجھے تو بھائی چھپر چھاؤں بن کر دکھا رہے ہیں ان کی لمبی عمر اور صحت کی دعا کیا کر بے وقوف انہی بھائیوں کے سر پر تیری ساری بادشاہی قائم ہے۔'' انہوں نے رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر سمعیہ کے دماغ پر ان کے سمجھانے کا اچھا اثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ رباب مراد اس کی کلاس فیلو اور بہترین دوست تھی۔ جب اس نے سمعیہ کو بتایا کہ اسے گلوکاری کا شوق تھا اور اس کو پورا کرنے کے لیے وہ باقاعدہ تربیت بھی لے رہی تھی تو وہ اس کی قسمت پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''تمہارے امی ابو اور بھائیوں نے تمہیں تربیت حاصل کرنے کی اجازت دے دی؟'' اس نے رباب سے پوچھا تھا۔

''تو اور کیا میں ان سے چوری چھپے جاتی ہوں۔'' رباب برا مان کر بولی۔ ''میرے امی ابو کو میرے شوق کے متعلق علم ہے اور وہ بھی چاہتے ہیں کہ میں اس میدان میں نام بناؤں جن سے میں

تربیت حاصل کررہی ہوں وہ تو آسانی سے کسی کو سکھانے پر تیاری ہی نہیں ہوتیں وہ تو میرے دادا ابوان کے پرانے شناساتھے جب ابو نے جا کران کو دادا ابو کا حوالہ دیا تو وہ مجھے سکھانے پر تیار ہو گئیں ویسے سکھانے سے پہلے انہوں نے میرا باقاعدہ ٹیسٹ لیا تھا آیا میرے گلے میں سر موجود ہے کہ نہیں۔''

''ہائے۔ سمعیہ کو اس تصویر پر ہی رشک آرہا تھا کہ رباب کو ایسی آزادی میسر تھی۔ ''تمہیں تو بڑا مزہ آتا ہوگا۔''

''تو اور کیا۔'' رباب فخر سے بولی۔ ''میں تو ایک ٹی وی چینل کے ٹیلنٹ ہنٹ پروگرام میں بھی شرکت کرنے والی تھی۔ وہ تو میڈم نے مجھے روک دیا کہ ابھی تمہاری تیاری مکمل نہیں کچھ عرصہ مزید سیکھ لو پھر جانا۔''

''ٹی وی چینل، میڈم تیاری۔'' سمعیہ کے لیے تو یہ الفاظ ہی بڑے پرکشش تھے۔

''تم روزانہ جاتی ہو سیکھنے ویسے یہ میڈم ہیں کون۔'' اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں میں روزانہ جاتی ہوں۔ صبح سویرے میڈم کا کہنا ہے کہ صبح کا وقت ریاض کے لیے بہترین ہوتا ہے۔ جو اس وقت ریاض کرتا ہے اس کی آواز میں ایک خاص قسم کا نکھار آجاتا ہے اور یہ جو میڈم ہیں نا یہ ہیں تو بڑے سر دائی مگر بہت زیادہ لوگ ان کا نام نہیں جانتے۔ سنا ہے کہ اپنے وقت میں بڑی مشہور تھیں۔ مہ پارہ بیگم نام ہے ان کا۔''

''رباب۔'' سمعیہ کو خیال آیا۔ ''تم کسی دن مجھے بھی لے چلو وہاں، اس اکیڈمی میں۔ ویسے میرے گھر سے تو بہت دور ہے تمہارا گھر اقبال ٹاؤن میں..... اگر میں کسی طرح پہنچ جاؤں صبح صبح تو۔''

''ارے پگلی اکیڈمی وکیڈمی نہیں ہے ان کی۔'' رباب ہنس کر بولی۔ ''اور میرے گھر کے قریب تھوڑی رہتی ہیں وہ۔ ان کی حویلی تو ادھر تمہاری طرف ہی ہے پرانے شہر میں۔ کبھی تم وہ حویلی دیکھ لو تو حیران رہ جاؤ۔ وہاں جا کر تو ایسا لگتا ہے جیسے انسان کسی پرانے زمانے میں چلا گیا ہو۔ ایک سے ایک نامور شخصیت آتی ہے ان سے ملنے کے لیے۔ جب میں شام کو جاتی تھی نا اس وقت میں نے بڑے لوگوں کو وہاں دیکھا تھا۔ ٹی وی کے اداکار، پروڈیوسر، شاعر، ادیب بڑا مزہ آتا تھا۔ اب میڈم نے صبح آنے کے لیے کہہ دیا تو اب صبح کے ٹائم تو..... کم ہی کوئی نظر آتا ہے۔''

سمعیہ کے دل میں ہلچل مچ گئی یہ ساری باتیں سن کر اور وہ بضد ہوگئی کہ کسی روز رباب اسے

اپنے ساتھ مہ پارہ بیگم کے پاس لے چلے..... یہ سن کر کہ وہ ادھر ہی کہیں رہتی تھیں وہ اور بھی ایکسائٹڈ ہوگئی۔ ''یعنی صبح صبح کہیں جانے کے لیے بہانے بھی نہیں بنانے پڑیں گے۔ کہہ دوں گی اماں اور بھائیوں سے کہ اکیڈمی والے سر نے کہا ہے کہ امتحان کے پیش نظر صبح کالج جانے سے پہلے بھی کبھی کبھی ایک گھنٹے کی کلاس ہوا کرے گی۔'' اس نے فوراً ہی اپنے دل میں بہانہ بھی گھڑ لیا اور رباب سے وعدہ لے کر ہی ٹلی کہ وہ اسے اپنے ساتھ کسی روز لے چلے گی۔

.....

''آپ کا مشاہدہ تو خاصا تیز ہو چکا ہوگا مس شازیہ اس ٹیٹ پر بیٹھنے کے بعد۔'' وہ فیضان مقصود تھا جو اس روز ڈاکٹر عبدالصبور سے کسی انکوائری کے سلسلے میں اپائنٹمنٹ لے کر آیا تھا۔ اسے یہ انکوائری اپنے بھائی کی پروگریس کے بارے میں کرنی تھی۔ اور اس کے بقول سلمان کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کو بھی اس سے کچھ پوچھنا تھا۔ ڈاکٹر عبدالصبور کے پاس آنے والے ان چند کلائنٹس میں سے دو ایک تھے جو اپنی باری آنے کے انتظار کے دوران اس سے گفتگو کر لیا کرتے تھے۔ ورنہ ان کے اکثر کلائنٹس اکڑی گردن اور سفید کالر طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کو ریسپشنسٹ سے بات کرنا اپنی توہین محسوس ہوتا ہوگا۔ فیضان مقصود اس سے صرف رسمی سی گفتگو نہیں کرتا تھا جو موسم حال اور طبیعت پوچھنے تک محدود ہوتی ہے۔ وہ اس سے کئی ایسی باتیں بھی کر لیتا تھا جو عموماً اچھی بے تکلفی والے لوگ ہی آپس میں کیا کرتے ہیں۔ اس روز بھی وہ اس کے سامنے بیٹھا اس سے اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا۔

''کیا مطلب مشاہدہ تیز ہو گیا؟'' شازیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ادھر جو مریض آتے ہیں وہ جسمانی عوارض میں مبتلا ہوتے نہیں وہ کسی ذہنی بحران کا شکار ہی ہوتے ہیں اور جن کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کے متعلق یہاں سے باہر لوگ گمان ہی نہیں کر سکتے کہ ان کے ذہنوں میں کوئی فالٹ موجود ہے۔ اب اس قسم کے لوگوں سے جس انسان کا روزانہ واسطہ پڑتا ہے۔ وہ تو رفتہ رفتہ خود بھی اچھا سائیکاٹرسٹ بن جاتا ہو گا۔ اسے یہاں سے باہر بھی کسی کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہوگا کہ اس کی ذہنی کیفیت کیسی ہے۔''

''میں دراصل اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔'' شازیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میرا کام انتہائی ذمے داری کا متقاضی ہے۔ کس کو کب آنا ہے۔ کون آخری مرتبہ کب آیا تھا۔ ٹیسٹ رزلٹ کا ریکارڈ۔ صحت یاب ہو جانے والوں کے ناموں کا الگ ریکارڈ پھر آنے والوں کے ساتھ پیشہ ورانہ

خوش اخلاقی کا مظاہرہ، رٹے رٹائے جملوں کی خوبصورت ادائیگی یہ سب کرتے ہوئے میں اتنی کانشس ہوتی ہوں کہ مجھے مشاہدے وغیرہ کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔''

''اچھا۔'' فیضان نے اس کی بات پر حیرت کا اظہار کیا۔ ''اچھا تو پھر ڈاکٹر صاحب آپ سے کبھی تو اپنے کلائنٹس کی ہسٹری ڈسکس کرتے ہوں گے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' شازیہ نے قطعیت سے کہا۔ ''یہ تو ان کی پیشہ ورانہ اخلاقیات کے اصول کے عین خلاف بات ہے کہ وہ کسی کلائنٹ کی کیس ہسٹری کسی سے ڈسکس کریں اور وہ بھی مجھ سے اپنے کلینک میں ریسپشنسٹ کی جاب کرنے لڑکی سے ناممکن۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر تختی سے سر ہلایا۔

''اچھا تو وہ کسی آنے والے پر کوئی کمنٹ تو دیتے ہی ہوں گے۔'' فیضان نے ایک اور کوشش کی۔ ''میرے بھائی والے واقعے پر انکاری ایکشن کیا تھا سچ سچ بتایئے گا۔ یقیناً بہت غضب ناک ہوئے ہوں گے۔''

''نہیں۔'' شازیہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''وہ قطعی ناراض نہیں تھے بلکہ الٹا انہوں نے مجھے اور چاچا شریف کو لیکچر دیا تھا کہ ایسے واقعے کے دوران اپنے حواسوں پر قابو کس طرح رکھنا چاہیے۔''

''ہاں آپ۔'' فیضان کو کچھ یاد آیا۔ ''مجھے پتا چلا تھا کہ آپ بے ہوش ہوگئی تھیں گولی کی آواز پر۔''

''صرف بے ہوش نہیں ہوئی تھی کئی روز تک خوفزدہ حالت میں بستر پر پڑی رہی تھی۔'' شازیہ نے پرپل گلوس لپ اسٹک سے سجے اپنے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

''آپ گولی سے اتنا ڈرتی ہیں۔'' اسے محسوس ہوا کہ یہ بات کرتے ہوئے فیضان مقصود اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

''ظاہر ہے یہ کوئی نہ ڈرنے والا واقعہ تو نہیں تھا۔ خصوصاً جب اتنے سارے غنڈہ ٹائپ لوگ یوں دندناتے ہوئے اندر گھس آئیں اور کلینک کا یہ پرسکون ماحول پاکستانی پنجابی فلموں کا منظر پیش کرنے لگے۔'' شازیہ جانتی تھی کہ اس کا یہ تبصرہ اگر ڈاکٹر عبدالصور سنتے تو ضرور ناراض ہوتے۔ انہوں نے اس ناخوشگوار واقعے پر کسی بھی قسم کے کمنٹس دینے سے سختی سے منع کر رکھا تھا مگر وہ فیضان مقصود تھا اس لڑکے سلمان کا بھائی تھا جس کی وجہ سے یہ سارا واقعہ پیش آیا تھا دوسرے وہ خود

ہی اس واقعے کی تفصیل جاننے کے لیے سوال کر رہا تھا پھر اس کے سامنے اپنے دل میں چبھی بات کہنے میں کیا حرج تھا۔

''پھر آپ نارمل کیسے ہوئیں؟'' وہ بدستور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ شازیہ اس کے دیکھنے کے انداز پر جز بز ہونے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب کی بدولت ان کا یہی تو کمال ہے وہ انسان کے ذہن سے سارے خوف، خدشات اور غلط مفروضے دھو ڈالتے ہیں اور پھر دیکھیے انہوں نے کس کمال سے اس کمرے کا سارا ماحول ہی بدل ڈالا تاکہ مجھے یا چاچا شریف کو یہاں بیٹھنے میں، آنے میں دقت نہ ہو یا ہمیں وہ واقعہ نہ یاد آجائے۔ اب کیا اس کمرے کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اس میں چند غنڈہ ٹائپ لوگوں نے کیا کارروائی کی تھی۔ اپنی اصل زندگی میں تو اس سے پہلے آپ نے غنڈہ ٹائپ لوگ نہیں دیکھے ہوں گے نا۔'' شازیہ کی آنکھوں کے سامنے سجاد کا چہرہ گھوم گیا اور کچہری میں پیش آنے والے واقعے کا منظر بھی۔ اس کا دل ایک مرتبہ پھر خوف سے پتے کی طرح لرز گیا۔

''کیا یاد آگیا۔'' فیضان کا لہجہ اب اسے پراسرار سا لگا یوں جیسے اس نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو اور وہ اس واقعے سے واقف ہو۔

''کچھ نہیں۔'' شازیہ نے سر ہلایا اور ٹیبل پر دھرے ٹشو پیپر نکال کر اپنے چہرے سے وہ پسینہ پونچھنے لگی جو شاید تھا ہی نہیں۔ اس کی اس اضطراری حرکت کو دیکھ کر فیضان مقصود بے اختیار مسکرا دیا۔

''بہرحال۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی کی چین کو ٹیبل ٹاپ پر ہلکے سے بجاتے ہوئے کہا۔ ''اس روز جو بھی ہوا، غلط ہوا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے اس کی معذرت باقی تھی سو پلیز آپ سے معذرت کر چکا ہوں۔''

شازیہ نے سر اٹھا کر اس ساری گفتگو کے دوران پہلی مرتبہ اسے دیکھا۔ خاکی پینٹ اور سرخ اور سفید چیک شرٹ میں ملبوس وہ اچھا خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ صاف اور رنگت گندمی تھی۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کے بال سیاہ اور سلیقے سے کٹے ہوئے اور برش کیے ہوئے تھے۔ وہ چیز جسے مردانہ وجاہت کہا جاتا تھا یقیناً اس شخص میں موجود تھی۔ شازیہ نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں اور نپی آواز میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔''

اسی وقت ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود کلائنٹ باہر نکلا۔ اس فیضان مقصود کی باری تھی۔ وہ

اٹھ کر اندر چلا گیا۔ فیضان کے بعد جن صاحب کی اپائنٹمنٹ کنفرمڈ تھی وہ اب تک نہیں پہنچے تھے ان کے بعد ایک خاتون کا نام درج تھا جنہوں نے حسب ضابطہ ایک دن پہلے رابطہ کر کے اپنی اپائنٹمنٹ کنفرم نہیں کروائی تھی اور اس کے بعد تیسرا اور آخری کلائنٹ آدھے گھنٹے پہلے آ کر کنفرمیشن کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے بعد دوبارہ آنے کا کہہ کر کہیں چلا گیا تھا۔ شازیہ خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھی باقی کا ٹائم ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی اور یونہی فرصت سے بیٹھے بیٹھے اسے کچھ دیر پہلے کی گفتگو اور فیضان مقصود کی نظریں یاد آنے لگیں۔ اس نے اٹھ کر خود کو سامنے کی دیوار پر لگے قدآور آئینے میں دیکھا۔

لائٹ اور ڈارک پرپل کے امتزاج کے کاٹن کے سوٹ پر انہی دونوں کلرز میں خوبصورت ایمبرائیڈری اس نے خود کروائی تھی۔ انہی دونوں کلرز میں رنگا اسٹائلش سا دوپٹا اس کے گلے میں پڑا تھا اور اس کا میک اپ بھی اسی شیڈ کی جھلک دے رہا تھا۔ اس نے اپنے شانوں سے ذرا نیچے تک تراشیدہ بالوں کو جھٹکا دیا۔ ڈارک براؤن شیڈ میں رنگے بالوں میں کارپر کلرز میں کہیں کہیں لہریے پڑے تھے۔ وہ ماڈرن ایج کی ماڈرن لڑکی کی لک دے رہی تھی۔ اس کا جسم اسمارٹ اور فگر متناسب تھا۔ اس نے لائٹ پرپل لائی ہیل سینڈل پہن رکھے تھے۔ جن کی وجہ سے اس کا قد بھی دراز لگ رہا تھا۔ یقیناً وہ اس سجے سجائے وجود سے ہی متاثر ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار اپنے بالوں میں برش پھیر کر انہیں ٹھیک طریقے سے سیٹ کرنے کے بعد واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھے ہوئے اس نے سوچا۔ ''کیا اوقات رہ گئی ہے ہم لڑکیوں کی۔ سجے سجائے وجود لیے شوپیس کی طرح اس قسم کی کرسیوں پر بیٹھی رہیں گی تو لوگ تو پھر دیکھیں گے ہی اور ہمیں اپنی روزی، روٹی کی خاطر بہر داشت تو کرنا پڑیں گی ہر طرح کی نظریں۔ پرشوق نظریں، حریص نظریں، دعوت دیتی نظریں۔'' اس نے تلخی سے سوچا۔ ''کوئی نظریں ایسی بھی ہوں گی کبھی جن میں ہمارے لیے احترام ہوگا اور چاہت بھی۔'' اسے اپنی سوچ پر خود ہی ہنسی آ گئی اور اس کی آنکھوں میں یقیناً آنسو بھی آئے تھے جب ہی وہ اسے بھگی بھگی سی لگ رہی تھیں۔ اس نے ٹشو پیپر سے انہیں تھپتھپا کر خشک کیا۔

''سب ٹھیک ہے۔'' پھر اس نے خود ہی فیصلہ کیا ''سب ہی کچھ ٹھیک ہے۔ جس کی جیسے روزی روٹی لکھی ہوتی ہے اسے ویسے ہی ملتی ہے اور پھر ہمارا کیا جاتا ہے۔ مرد کو بھی تو آنکھیں جھکائے رکھنے کا حکم ہے۔''

''جن لڑکیوں کے چہروں پر زیادہ نظریں پڑتی ہیں نا غیر مردوں کی ان کے چہروں سے نور

ختم ہو جاتا ہے۔'' اسے ایک بھولی بسری بات یاد آ گئی جو برسوں پہلے اس کی نانی نے اسے اور اس کی سب کزنز کو پردے کی تلقین کرتے ہوئے کہی تھی۔

''میرے چہرے پر تو اس حساب سے پھٹکار پڑنی چاہیے اب۔ نور تو عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہو گا۔'' اس نے ایک تلخ بات سوچی اور اپنے سامنے دھری کاغذ پر آڑی ترچھی لائنیں لگانے لگی۔ اس وقت فیضان مقصود ڈاکٹر صاحب کے آفس سے باہر نکلا۔ وہ چونک کر رہ گئی۔

''ارے، اتنی جلدی فارغ ہو گئے آپ۔'' اس نے بے اختیار کہا۔

''جی ہاں، مجھے کوئی خاص لمبی بات تو کرنا نہیں تھی ڈاکٹر صاحب سے۔ بس سلمان کے متعلق دریافت کرنا تھا اور اسی کے متعلق ایک دو باتیں بتانا تھیں۔'' اس نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔

''ویسے آپ کیا میرے جانے کے بعد رونے کا شغل کرتی رہی ہیں اس مختصر عرصے میں'' اس نے اچانک پوچھا۔ شازیہ بری طرح چونک گئی۔

''کیا مطلب؟'' اس نے سٹپٹا کر کہا۔

''مطلب یہ کہ آپ کی آنکھ کا کاجل پھیل رہا ہے اور آنکھیں سرخ بھی لگ رہی ہیں۔ کیا میری کوئی بات بری لگ گئی۔''

''نن..... نہیں تو۔'' شازیہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

''یہ اب آپ ظلم کر رہی ہیں۔'' فیضان نے مسکرا کر کہا۔ ''ویسے آپ کی آنکھیں اس پھیلے ہوئے کاجل کے ساتھ اور بھی اچھی لگ رہی ہیں۔''

شازیہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ یقیناً اس کی نظروں میں غصہ اور ناراضی تھی جب ہی وہ فوراً ''اچھا پھر خدا حافظ، سی یو اگین'' کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

''سی یو اگین کی بچہ۔'' شازیہ نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا بال پوائنٹ میز پر پھینکا۔ ''نہ جانے کہاں سے اٹھ کر آ جاتے ہیں اجڈ، جاہل، گنوار۔'' وہ غصے میں اس لڑکے کے لیے برے برے الفاظ سوچتی گئی۔ جتنا مرضی پڑھ لکھ جائیں، رہیں گے تو وہی گاؤں کے چوہدری، بدمعاش، دل پھینک، الو کے پٹھے۔'' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کو جتنی گالیاں آتی تھیں وہ اس شخص کے لیے بک دے مگر اتنے میں ہی ان خاتون کی آمد ہو گئی جنہوں نے اپائنٹمنٹ کنفرم نہیں کروائی تھی۔

"ویلکم میم، ہم تو آپ کی طرف سے اطلاع کا انتظار کر رہے تھے۔" دوسرے ہی لمحے وہ اپنی پیشہ دارانہ روایتی مسکراہٹ چہرے پر سجائے انتہائی خوش خلقی سے ان خاتون سے مخاطب تھی۔

.......٭.......

"ایک زمانہ تھا مہ پارہ بیگم جب غیرت اور حمیت کا بول بالا تھا۔ اب یہی...... الفاظ ایسے ہیں جو سننے والے کے کان کو اجنبی محسوس ہوتے ہیں۔" حکیم اچھن خان نے پان کی نفیس گلوری منہ میں رکھتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھی مہ پارہ بیگم کو مخاطب کیا۔

"کل رات ہی مجھے مرحوم علی بخش خان عرف جرنیل صاحب والا واقعہ یاد آ رہا تھا۔"

"وہ جو ایک ریاست کے دربار میں استاد مرچ نامی سارنگی نواز سے مقابلہ کرنے بیٹھ گئے تھے۔" مہ پارہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"بالکل، بالکل۔" حکیم اچھن نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "سنا تھا کہ استاد مرچ اور جرنیل صاحب نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ آخرکار استاد مرچ ہار گیا اور سارنگی زمین پر پھینک کر بولا۔ "کم بخت ہاتھ کا ساز تھا نا، گلے کا ساتھ نہ دے سکا۔" اور اسی غم میں خودکشی کر لی۔"

"آ......ہا۔" مہ پارہ بیگم نے بھی یہی واقعہ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "حکیم صاحب اب فنکاروں میں ایسی غیرت کہاں۔ یہ جو آج کل اس فن کے میدان میں مقابلے ہو رہے ہیں ان کو سنا ہی ہوگا آپ نے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے پروموٹرز کے سامنے نمبر کٹوانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے پڑوسی ملک جا کر گا رہا ہوں۔ میرا فن زیادہ عمدہ ہے۔ دوسرا کہہ رہا ہے دشمن کی سرزمین پر جا کر گاتا ہے وطن کا غدار ہے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ایک ہمارا وقت تھا کہ ایسی نیچ زبان استعمال کرنے والوں کو تو ویسے ہی فنکاروں کی منڈی سے بے دخلی کا نوٹس مل جاتا تھا اور ہر کوئی لعن طعن کرتا تھا کہ ایسی حرکت کرنے والوں کو زمین میں جگہ نہ ملتی تھی منہ چھپانے کو مگر اب تو ایسے لوگوں کے چہروں پر فخر اور غرور سجا ہوتا ہے۔"

"مرحوم عاشق علی خان صاحب میرے استاد تھے۔ اماں مرحومہ نے باقاعدہ سفارش کروائی تھی عاشق علی خان کے ہاں کہ مجھے شاگردی میں لے لیں۔ کلکتہ کی ایک میوزک کانفرنس میں استاد احمد جان تھرکوے کے ساتھ طبلے کی تال پر وہ تانیں لگائیں اور گر پکڑے کہ سامعین کا یہ حال ہو گیا کہ تالیاں بجاتے اور کرسیوں سے اچھلتے تھے۔ آج کل آپ نے دیکھا ہوگا کیا بازو لہرا لہرا کر اسٹیج پر

فنکاروں کے ساتھ چڑھ کر رقص کرتے ہوئے داد دی جاتی ہے۔ نہ وہ فنکار رہے نہ وہ سامع نہ وہ ڈھنگ نہ تمیز۔ زندگی کے ہر شعبے کے اپنے اپنے اصول و ضوابط ہوتے ہیں حکیم صاحب، کام رکتے نہیں چلتے رہتے ہیں مگر جو کام اپنے درست لوازمات کے ساتھ پورا کیا جائے اس کا مزہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔"

"ابھی دیکھیے۔" حکیم اچھن نے پان کی گلوری منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی کہیے بیگم صاحبہ کہ اب جو شاگرد آپ کے پاس موجود ہیں ان کے پاس کیا وہ سر، رس اور تان ہے کیا ان کے گانے میں وہ لوچ اور نرمی ہے جو آپ کے ہم عصروں میں ہوتا تھا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" مہ پارہ بیگم نے اپنا دوپٹا سر پر طریقے سے جماتے ہوئے کہا۔ "ہنر بھی ہے، آواز بھی، شوق بھی، رس اور لوچ بھی مگر ان سب کو یکجا کر کے آواز میں وہ سر پیدا کرنے کے لیے جو آواز کو اور آواز والوں کو لازوال بنا دے جو آداب اور شائستگی، متانت اور بردباری درکار ہوتی ہے اس کا فقدان ہے۔ میرے پاس تو گنے چنے بچے آتے ہیں جن کو میں ان کا پس منظر دیکھ کر شاگردی میں لیتی ہوں اگر تو ان کے گھرانے موسیقی شناس ہوں جب ہی میں ان کو سکھانے پر تیار ہوتی ہوں مگر یہ بھی سچ ہے کہ حکیم صاحب کو یہ سارے لوازمات بھی اب وہ بات پیدا کرنے میں ناکام ہوتے ہیں جس کے لیے یہ سارا ریاض کیا جاتا ہے۔ سیکھنے والے کے اندر وہ جذبہ وہ جوش اور لگن ہی نہیں رہی جو فنکار کو فنکار بناتی ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔ سچا فنکار تو ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ براہ راست گانے کا رواج ختم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب تو یہ جو میوزیکل شو منعقد کیے جاتے ہیں ان میں گانے والا صرف ہونٹ ہلاتا ہے آواز پیچھے سے ریکارڈ کی ہوئی آتی ہے۔"

"ہر چیز کی مصنوعیت کا تڑکا لگ چکا ہے مہ پارہ بیگم وہ زمانے اور تھے جب فنکار رات رات بھر گاتے تھے اور نہ سننے والا تھکتا تھا نہ گانے والے۔ اب فنکار رات رات بھر اچھل کود کرتا ہے گانا پیچھے سے ریکارڈ شدہ سنائی دیتا ہے۔ فنکار بھی کسرت کرتا ہے سننے والے بھی۔ ایک ہجوم بد تہذیبیاں دیکھنے کو ملتا ہے میوزیکل شوز میں۔" حکیم صاحب نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"اب کوئی نئی نسل کا نمائندہ سنے تو ضرور الزام دھرے کہ یہ پرانی نسلوں کے لوگ خود کو بہتر سمجھتے اور اپنے ہی راگ الاپتے ہیں" مہ پارہ بیگم نے سروتے سے چھالیا کترتے ہوئے کہا "مگر آپ جانیے حکیم صاحب، کیا ہم لوگوں کو سکھانے والے ہماری ایک ایک جنبش، نشست و برخاست

اور آداب گفتگو پر نظر نہیں رکھتے تھے۔ کیا وہ صرف فن سکھاتے تھے، آداب فنکاری بھی اس تربیت میں شامل ہوتا تھا۔"

"آپ نے وہ بات تو سنی ہی ہوگی مہ پارہ بیگم۔" حکیم اچھن نے فتے خان کا پیش کردہ حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "پرانے زمانے کے نواب، راجا، امرا اپنے بچوں کو تربیت حاصل کرنے کے لیے بالا خانوں کی مہ جبینوں کے پاس بھجواتے تھے۔"

"وہ اس لیے کہ وہ بالا خانے تہذیب، اخلاق اور شائستگی کے منہ بولتے نمونے ہوا کرتے تھے مگر جس دور میں تہذیب اخلاق اور شائستگی کے معیار اور پیمانے ہی بدل جائیں ان میں ایسی باتیں کرنا فضول سی بات ہی ہے۔" مہ پارہ بیگم نے اختری کو چائے لاتے دیکھ کر پاندان بند کرتے ہوئے کہا۔

"اوروں سے تو نہیں مگر ہم آپ آپس میں بات تو کر سکتے ہیں نا، گئے دنوں کا سراغ لگا سکتے ہیں نا۔" حکیم اچھن نے حقے کی نے ایک طرف ہٹا کر مہ پارہ بیگم کے پیش کردہ پکوڑے اور ورقی سموسے پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر میں ان پکوانوں کی بات کروں تو کیا پھر بھی آپ کہیں گی کہ نئی نسل ہمیں جھٹلائے گی، آپ کے ہاتھ کے کباب پراٹھے کھانے والوں کو بند و خان کیا بھائے گا بھلا۔"

"خیر، ایسی بات تو نہ کریں۔" مہ پارہ بیگم نے سر ہلایا۔ "بند و خان کا اپنا ایک نام ہے اور روایتی سا نام ہے۔ اس نے اپنے کام میں مہارت حاصل کی اور پھر اس ذائقے کو ہر طرف پھیلا دیا۔ اس کے نام اور اس کی اہمیت کو آپ ہم کم نہیں کر سکتے۔"

"اچھا تو یہ بتائیے کہ یہ اپنے مرزا بھائی اور بہن بھائی کہاں غائب ہیں۔" حکیم صاحب نے ورقی سموسے کی پرتوں کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مرزا صاحب تو اپنے بیٹے کے پاس دبئی چلے گئے پرسوں شام اور بہن صاحب بھانجی کی شادی میں مصروف ہیں۔"

"خاک مرزا صاحب وقت گزاریں گے دبئی میں۔ ان کا دل کہاں لگے گا وہاں۔" حکیم صاحب نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"وہ اس ہوٹل کا ذکر کر رہے تھے جو سمندر کی تہ میں بنا ہے یا پھر شاید سمندر کے بیچ بیچ، کہہ گئے تھے کہ اس بار یہ مجھ بد دیکھنے کا ارادہ ہے۔"

"دنیا بھر کے عجوبے دیکھتے دیکھتے مرزا صاحب خود عجوبہ بن کر رہ گئے ہیں۔ یاد ہے جب پہلی مرتبہ تاج محل دیکھ کر آئے تھے تو ان کی لن ترانیاں ختم نہیں ہوتی تھیں تان کے متعلق۔" حکیم صاحب ابھی تک منہ بنا رہے تھے۔

"حق ہے حکیم صاحب حق ہے، مرزا صاحب کو اللہ پاک نے بڑے مواقع فراہم کیے اپنی دنیا کی صنعت کاریوں کے مشاہدے کے اور اپنے مشاہدے کے بیان کے لیے زور گفتار بھی عطا کر رکھی ہے انہیں خدا نے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جب بھی جاتے ہیں کیسے ڈھنگ سے حال بیان کرتے ہیں در و دیوار اور گلی کوچوں کا۔ قسم سے آنکھ میں آنسو آ جاتے ہیں۔" مہ پارہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

"خیر، یہ سعادت تو ہمیں اور خود آپ کو بھی عطا ہوئی کہ اس پاک زمین کی مٹی کو چھو آئے اور مشاہدے بھی خوب کیے مگر یہ بات آپ کی ٹھیک ہے کہ زور گفتار و بیاں اس ڈھنگ کا عطا نہیں ہوا ہمیں۔" حکیم صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"میرا ارادہ اس مرتبہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کا ہے۔ دعا کیجئے گا کہ ارادے کو قبولیت کا شرف حاصل ہو جائے۔ چار سال پہلے حج پر گئی تھی۔ حج کے اپنے اتنے لوازمات ہیں کہ زیارتوں کے متعلق تشنگی سی رہ گئی۔ اب فرصت سے کچھ عرصہ وہاں گزارنے کو جی چاہتا ہے۔ بس یہی دیا ہے کہ وہ سچا پیدا را آواز دے بس۔" مہ پارہ بیگم نے آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ ہمارے جو بڑے نام والے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ گانے والیوں، اداکاری کرنے والوں اور اس قسم کے کاموں سے تعلق رکھنے والوں اور والیوں کے عمرے اور حج قبول نہیں ہوتے۔" حکیم اچھن نے دانستہ چوٹ کی۔

"ارے حکیم صاحب۔" مہ پارہ بیگم بھی ان کا مذاق سمجھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔ "کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پاس ہمت بھی ہوتی ہے اور استطاعت بھی، خواہش بھی ہوتی ہے لگن بھی مگر پالنے والا پھر بھی نہیں بلاتا۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو عمر بھر پیسا پیسا جوڑ کر جمع کرتے ہیں اور بلاوے کی امید رکھتے ہیں۔ وہ بلا لیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ہم بھی ہیں۔ بلاوے کے منتظر۔ قبولیت اور نا قبولیت کا فیصلہ کرنے والے انسان کون ہوتے ہیں۔ ہماری مہر و خالہ اللہ جنت نصیب کرے۔ ایک واقعہ سنایا کرتی تھیں۔ حضرت نظام الدین اولیا کا۔ ایک دفعہ ایک کلال

(شراب بیچنے والا) حضرت کے پاس حاضر ہوا اور بولا حضور کاروبار کرتا ہوں مگر چلتا نہیں فاقوں کی نوبت آگئی ہے۔ حضرت نے ایک چھوٹے سے کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ کر اس کو تہ لگائی اور فرمایا جاؤ اور اسے ساتھ لے جاؤ اور اپنے ساتھ ہی رکھیو۔ کلال واپس اپنے شہر چلا گیا اور کام دوبارہ شروع کر دیا۔"

"وہی شراب بیچنے والا؟" حکیم اچھن نے توجہ سے سنتے ہوئے سوال کیا۔

"بالکل وہی۔" مہ پارہ بیگم نے کہا۔ "مگر اب کے ایسا کاروبار چمکا کہ دنوں میں امارت کی انتہا پر وہ پہنچ گیا، محل کھڑے کر لیے۔ برسوں بعد خیال آیا کہ دیکھو تو سہی حضرت نے آخر اس پرزے پر لکھا کیا تھا۔ عقیدت سے اس تہ شدہ پرزے کو چوما اور کھولا۔ اس کاغذ پر لکھا تھا۔ اے اللہ تیری خلقت کے چند لوگوں نے شراب پینا تو نہیں چھوڑی پھر کیوں نہ اس کلال کی دکان سے پیئے۔"

"خوب، خوب۔" حکیم اچھن نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"نقطے کو سمجھے حکیم صاحب۔" مہ پارہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "برے کی برائی کا پیمانہ ماننے والی خلقت خدا اس واقعے کی ضرور جھٹلائے گی مگر آپ ان اولیا اللہ کی دعاؤں کی برکات کو کیا کہیں گے کہ کاروبار دنیا میں اچھے برے کام سب ہی چلتے رہیں گے۔ اچھے اور برے کی تمیز اور ان کے متعلق فیصلہ کرنے والے ہم آپ کون ہوتے ہیں کیا قدرت نے کچھ نامور گانے والوں کی آواز میں طاقت پیدا نہیں کر رکھی تھی کہ آواز کی لے سر پر گلاس توڑ دیں یا بارش برسنے لگے.....تو پھر اس کے متعلق آپ کے نکتہ رسا کیا کہیں گے۔" حکیم صاحب نے ان کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔

"تو پھر ایسا ہے کہ غلط اور درست کا فیصلہ کرنے کا حق اس اوپر والے پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ہماری قوم کو اسی وہ غلط ہے وہ درست ہے کے فتوؤں نے تو..... برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ کے سنائے واقعے سے یاد آیا کہ ہم جب تین برس پہلے ہندوستان کی سیر کی غرض سے گئے۔" حکیم صاحب نے دفعتاً موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "یہی کوئی سرکاری وفد کا ساتھ تھا اس وقت ہمارے پروگرام میں نظام الدین اولیا کے مزار کی حاضری بھی شامل تھی۔ وہاں دیکھا کہ کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا سکھ سب ہی حاضری دینے اور چڑھاوے چڑھانے چلے آتے ہیں۔"

"اور مجاوروں کی مجاوری کا حال نہیں دیکھا آپ نے۔" مہ پارہ بیگم نے ناک چڑھا کر کہا۔

"ہم جب گئے تھے مشاعرے اور میوزک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے تو دیکھا وہی مسلمان مجاور تھے جو نذرانہ ڈال، نذرانہ ڈال کی صدا لگا رہے تھے جگہ جگہ بکس لگا کر۔"

"یہ ہندوستان پاکستان کی تقسیم بھی بڑی عجیب تقسیم ہے۔ مہ پارہ بیگم، ابا جان بتاتے تھے جس دن ہندوستان تقسیم ہوا اسی دن سے ہر چیز تقسیم ہو گئی۔ شاعر، فنکار، موسیقار، آرٹسٹ سب کے سب۔ اقبال اور حفیظ جالندھری ہمارے ہوئے ٹیگور اور جمال ان کے۔ منٹو اور غلام عباس ہمارے ہوئے بیدی اور کرشن چندران کے۔ کمال تقسیم تھی، بھئی کمال تقسیم۔"

"ارے صدقے جایئے اس تقسیم کے حکیم صاحب۔" مہ پارہ بیگم چمک کر بولیں۔ "یہ نہ ہوئی ہوتی تو اب آپ بھی جوتیاں سیدھی کر رہے ہوتے۔ اپنے ایک چھوٹے سے کمرے کے مطب میں بیٹھ کر برہمن زادوں کی اور ہم پڑے ہوتے گمنامی کی دنیا میں دو نمبر کے فنکار بن کر۔"

"ارے ایسا بھی نہیں ہے، آپ نے تاج کی فلم انڈسٹری کا حال دیکھا ہے انڈیا کی، سارے مسلمان سارے خان چھائے بیٹھے ہیں انڈسٹری پر؟" حکیم صاحب نے یہ جملہ بھی دانستہ کیا تھا۔

"نام کے خان، نام کے مسلمان حکیم صاحب کے برس ہو گئے آپ کو تقسیم کا رونا روتے۔ دل تو چاہتا ہے کہ انگلی سے پکڑ کر آپ کو وہاں چھوڑ آئیں اور دیکھیں کہ وہ کب بناتے ہیں آپ کو حکیم سعید حکیم اجمل۔"

"ارے آپ تو خوب ہی برا مان گئیں مہ پارہ بیگم۔" حکیم صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ہم مذاق کر رہے تھے آپ سے ورنہ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم تو پیدائشی پاکستانی ہیں۔ ہمارا تو دل دل پاکستان، جان جان پاکستان ہے۔"

"دل جلانے والے مذاق مت کیا کیجیے حکیم صاحب، اب ہمارا آپ کا چل چلاؤ کا وقت ہے، ایسی دل جلانے والی باتوں کا وقت نہیں ہے۔" مہ پارہ بیگم نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جو اور جیسا آپ کا حکم۔ ہم تو تعمیل کے عادی ہیں حضور۔" حکیم صاحب نے سر پر ٹوپی جما کر اٹھتے ہوئے کہا اور دروازے کے قریب جا کر اپنے جوتے پہننے لگے۔

"اختری اری او اختری۔" مہ پارہ بیگم نے آواز لگائی۔ "فتے خان سے کہو حکیم صاحب کو بیرونی دروازے تک چھوڑ کر آئیں۔ موٹر کا دروازہ خود کھول کر بٹھائے، تاکید کرنا۔"

"کیا وضعداری سی وضعداری ہے۔" حکیم اچھن نے حویلی کے وسیع صحن سے گزرتے

ہوئے کہا۔ مہ پارہ بیگم ان کے ساتھ ہی باہر نکلی تھیں اور اب صحن میں بنے سنگ مرمر کے تخت پر جا بیٹھی تھیں۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے"

حکیم صاحب کی گاڑی جب اس بڑی سڑک کے وسط پر پہنچی ان کے کانوں میں شام کا ریاض کرتی مہ پارہ بیگم کی آواز آئی۔

.....

چند روز اپنے تازہ حلقے میں رہنے کے بعد حسن کمال دوبارہ اپنی پرانی جون میں واپس جا رہا تھا۔

"یہ فاؤل ہے بھئی حسن، ابھی تو ہمارا لنچ بھی ڈیو ہے تمہاری طرف۔" مہرین نے اس روز اسے اسی بے ترتیب حلیے میں دیکھ کر کہا۔

"یہ دل کے موسم کا معاملہ تھا مہرین خانم جو صرف چند روز ثابت ہوا۔" حسن نے کمپیوٹر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے نئے آرٹیکل کے لیے مواد تلاش کر رہا تھا۔

"افوہ بھئی، بہت افسوس ہوا کہ یہ موسم صرف چند روز ٹھہرا تمہارے یہاں۔" مہرین نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کن انکھیوں سے کرن کو دیکھا جو ہونٹ دبائے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بظاہر اپنے کام میں مصروف تھی۔

"ہم جیسوں کے لیے اتنے روز بھی کافی ہوتے ہیں۔ عمر بھر کی یاد بن جانے کو۔" حسن نے سر اٹھا کر ایک نظر مہرین اور کرن پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ ورسا چے کی شرٹ اور خاکی پینٹ کہاں گئی، یقیناً تم نے اسے کہیں ادھر اُدھر پھینک دی ہو گی۔ میلی کر کے اور دوبارہ ان کی طرف دیکھو گے بھی نہیں۔ بھئی وہ بڑے قیمتی کپڑے تھے نہیں چاہئیں تو جہانگیر کو دے دو وہ لانڈری سے دھلوا کر پہن لے گا۔ شاید اس پر بھی دل کے موسم وارد ہو جائیں۔" مہرین نے مذاقاً کہا۔

"وہ کپڑے لانڈری میں ہی گئے ہیں۔ اب اگر میں روزانہ ہی وہ پہن کر آنے لگا تو تم لوگ کوئی اور بات بنا لو گے۔" حسن نے کچھ فیکس ڈاؤن لوڈ کرتے ہوئے کہا۔

"مہرین آپی، میں نے آپ سے وہ آئیڈیا ڈسکس کیا تھا مہ پارہ بیگم والا۔" کرن نے اس

مذاق کو طویل ہوتے دیکھ کر مہرین کی توجہ کام کی طرف دلائی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ اس کا یہ آئیڈیا وہ حسن کمال سے ڈسکس کرے۔ خود اس کے تو وہ کان اور دماغ سب ہی کھا جاتا یہ بات سن کر۔

"مہ پارہ بیگم۔" حسن کمال کے کان کھڑے ہوئے۔

"یہاں میری ٹیبل پر آ جاؤ۔ میں بتاتی ہوں تمہیں۔" مہرین نے کہا اور اس کے آنے پر کرن کا خیال اس کے گوش گزار کرنے لگی۔

"یہ پہلا خاص خیال ہے آپ کی نئی ممبر کا۔" حسن نے ساری بات سن کر کہا۔ "اور یقیناً دلچسپ بھی ہے۔ میں نے ان خاتون کا نام سن رکھا ہے نہ صرف سن رکھا ہے بلکہ میں ان سے دو ایک مرتبہ مل بھی چکا ہوں۔"

"اچھا۔" کرن اپنی جگہ سے اٹھ کر ادھر آتے ہوئی بولی۔ "کیسی ہیں وہ میں نے سنا ہے کہ بے حد منفرد شخصیت ہے ان کی۔" اس کے لہجے کا اشتیاق محسوس کر کے حسن زیر لب مسکرایا۔

"ٹھیک سنا تم نے، مگر جتنی یہ منفرد ہیں اتنے ہی اونچے دماغ والی بھی ہیں۔ کم ہی کسی سے ملتی ہیں اور کم ہی سوشل سرکل میں نظر آتی ہیں۔"

"جب ہی تو۔" کرن نے بے قراری سے کہا۔ "جب ہی تو میں چاہتی ہوں کہ ان کی شخصیت کو ہائی لائٹ کریں۔ ان کی نانی کی تاریخ سے آغاز کریں اور دو چار اقساط میں ان تک پہنچیں اور پھر ان سے ملاقات کا اہتمام بھی کریں۔ یقیناً پڑھنے والے ہماری جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ اس کوشش سے۔"

"یہ تاریخ گرو کے نیچے دب چکی ہے محترمہ، اس گرد کو جھاڑنے کے لیے خاصی کوشش درکار ہو گی یاد رہے۔" حسن نے اسے یاد کرایا۔

"کوئی بات نہیں۔" کرن نے سر ہلایا۔ "ہم سب کوشش ہی کر رہے ہیں اُن کا معیار بہتر کرنے کے لیے محنت اور کوشش تو ضروری ہے باقی اللہ مالک ہے۔"

"اس سلسلے میں ابھی تک تم نے کتنا کام کیا ہے۔" حسن نے پوچھا۔

"میں نے ان کے ایل پی اوسی ڈیز ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔" کرن نے اعتراف کیا۔

"مہ پارہ بیگم کی سی ڈیز۔" حسن کمال کو ہنسی آ گئی۔ "وہ ملیں گی بھی نہیں۔ آڈیو کیسٹ شاید ریڈیو پاکستان کی لائبریری سے مل جائیں۔ میں کوشش کروں گا۔"

''یہ ہوئی نا بات!'' کرن نے دل میں سوچا۔ اس کو یقین تھا کہ اس معاملے میں حسن کمال کا مکمل تعاون اسے حاصل رہے گا۔

''ہمارے ایک پرانے شناسا ہیں مرزا کریم بیگ صاحب۔'' حسن کمال نے ایک اور انکشاف کیا۔ ''تمہیں اللہ بخش سلطان صاحب یاد ہیں۔'' پھر اس نے مہرین سے پوچھا۔ ''وہ جو ہمارے ڈپارٹمنٹ میں میر صاحب سے ملنے کے لیے اکثر آیا کرتے تھے۔''

''ہاں خوب یاد ہیں۔'' مہرین نے کہا۔

''یہ مرزا کریم بیگ صاحب اللہ بخش صاحب کے توسط سے ہی میرے شناسا بنے تھے۔ انہی کے ہمراہ میں نے ایک دو نجی محافل موسیقی میں مہ پارہ بیگم کو گاتے سنا ہے۔''

''کیسی آواز ہے ان کی؟'' کرن کی بے چینی دیدنی تھی۔

''اگر میں الفاظ میں بیان کروں گا تو مبالغہ سمجھا جائے گا۔ بہرحال یہ سمجھ لو کہ مبالغے کی حد تک خوبصورت آواز ہے ان کی، اور شخصیت کا گریس تو بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔''

''کمال ہے، حسن کمال۔'' مہرین نے دلچسپی سے اس کی بات سنتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم ان کو اتنی اچھی طرح جانتے ہو تو پھر تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اس موضوع پر لکھا جاسکتا ہے۔''

''یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، واقعی مجھے خیال نہیں آیا اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ موسیقی کی دنیا میں کوئی کام خاص تعلق محسوس نہیں کرتا ہوں۔'' حسن نے اعتراف کیا۔ ''لیکن اپنے میگزین کے نقطہ نظر سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اچھوتا آئیڈیا ہے اور کرن فاطمہ اس کے لیے داد کی مستحق ہے۔''

''چلیں۔'' کرن نے ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے ٹکائے پلکیں تیزی سے جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''کسی بہانے سہی آپ کے منہ سے میرے لیے داد کے الفاظ تو نکلے۔''

''لگن اور محنت سچی ہو تو کامیابی انسان کے قدم چوم ہی لیتی ہے۔'' حسن نے جان بوجھ کر ایک چبھنے والی بات کی۔

''کس قسم کی کامیابی۔'' کرن نے چونک کر کہا۔

''یہی دوسروں کو قائل کر لینے میں کامیابی کو ہم بھی سوچ سکتے ہیں۔''

''دوسرے دانستہ طور پر لوگوں کے دماغوں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کی نفی کریں تو انہیں کیا کہا جاسکتا ہے۔'' کرن نے شانے اچکائے۔

''ویسے حسن سچ سچ بتا ہی دو کہ اس روز والا گیٹ اپ کس کی نظر کرم کا کرشمہ تھا۔'' مہرین

دوبارہ پہلے والے موضوع پر آ گئی۔

''وہ معجزہ تھا۔'' حسن کمال نے اطمینان سے کہا۔

''کیا مطلب معجزہ تھا۔'' مہرین نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

حسن نے اس روز اپنے کمرے میں رکھے جانے والے تحائف اور پھولوں کا مختصر احوال بیان کیا۔

''امیزنگ!'' مہرین نے اس کی بات سن کر کہا۔ ''اور تم اتنے بدھو بے وقوف ہو کہ تم نے پتا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ کون پراسرار خاتون تھی جو یہ سب وہاں رکھ گئی اور کسی کو علم ہی نہیں ہوا۔''

''آپ کتنے وثوق سے کہہ رہی ہیں کہ وہ کوئی خاتون ہی ہوگی۔'' کرن نے بے ساختہ کہا۔ ''ان کا کوئی دوست بھی تو مذاق کر سکتا ہے۔''

''معاف کیجیے گا خاتون میرا کوئی ایسا دوست نہیں ہے جو میرے ساتھ اتنا مہنگا مذاق کرے، میرے دوست تو بات کرتے ہیں تو معہ سود اس بات کا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔''

''پھر یہ پراسرار شخصیت کون ہو سکتی ہے؟'' مہرین نے سوچتے ہوئے کہا۔

''جو بھی تھی، میرے تو مزے ہو گئے۔ چند دن مجھے یہ احساس رہا کہ کوئی ہے جو میرے لیے خصوصی طور پر سوچتا ہے اور میرے لیے اتنا تردد کر سکتا ہے خواہ ایک بار کے لیے سہی۔'' اس کی اس بات پر کرن نے چونک کر مہرین کی طرف دیکھا۔ جس نے آنکھوں کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ اور پھر حسن کمال کی غیر موجودگی میں مہرین نے کرن کو اس کے ذاتی حالات سنائے۔ وہ تنہا تھا اور اس تنہائی نے ہی اسے اتنا بے پروا بے نیاز اور بے ترتیب شخص بنا رکھا تھا۔

''وہ ایک ذہین، قابل اور محنتی شخص ہے۔ وہ اپنے کام سے اتنی محبت کرتا ہے کہ جب کام کرنے بیٹھ جائے تو دوسری کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا مگر اپنی ذاتی زندگی میں وہ رشتوں، محبتوں اور تعلقات سے محروم انسان ہے۔ اس کی زندگی کے اس تشنہ پہلو کا یقیناً اس کی شخصیت پر گہرا اثر ہو گا جب ہی تو وہ اس طرح بے ترتیب نظر آتا ہے۔'' مہرین نے اسے بتایا۔

''اب تک'' کرن نے اپنے ہاتھ میز کی سطح پر پھیلا کر رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب سے آپ کا ان سے کام کا یا پھر دوستی کا یا پھر کولیگ شپ کا تعلق بنا ہے آپ نے ان کی شخصیت کو بہتر بنانے کے لیے کیا کوششیں کی ہیں۔''

''اپنی طرف سے تو میں نے ہر طرح کی مخلصانہ کوشش کر کے دیکھ لی۔'' مہرین نے بتایا۔

''میں نے اس وقت جب وہ کوئی کام نہیں کر رہا تھا بلکہ جب اسے کہیں کام نہیں مل رہا تھا اپنے یہاں کام کرنے کی آفر کی پھر میں نے اس کی اپنی نظر میں معتبر بنائے رکھنے کی خاطر اسے دفتر میں اتنی اہمیت دی کہ آج تک ''اون لکر'' کا کوئی ایک لفظ بھی اس کی منظوری کے بغیر پرنٹ نہیں ہونے دیا۔ جس چیز کو وہ او کے کر دیتا ہے اون لکر میں وہی چیز لگتی ہے۔ اس کا مظاہرہ تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ تمہارے سلسلے میں ہی دیکھ لو میں نے پہلی ملاقات میں ہی اپنے دل میں سوچ لیا تھا کہ یہ لڑکی ''اون لکر'' کے لیے ایک بہترین اضافہ ثابت ہو سکتی ہے مگر تمہیں یہاں جاب کرنے کی آفر صرف اس وقت دی جب حسن کمال اس بات کو مان گیا۔''

''یہ تو آپ صرف ان کی ایگو کو سیف گارڈ کر رہی ہیں۔ ان کی ظاہری و باطنی شخصیت کو بہتر بنانے کے لیے آپ نے کیا کیا؟''

''وہ اتنا انٹروورٹ ہے کہ انسان اس کے اندر جھانکنے کی ہمت کر نہیں سکتا۔ ہم اس سے اس کے متعلق گفتگو کرنا چاہیں بھی تو دو لفظوں سے آگے بات بڑھتی ہی نہیں۔ یہ تو آج نہ جانے کس رو میں ویلنٹائن ڈے کے تحائف کا قصہ سنا گیا ورنہ یہ تو اس سے امید کی ہی نہیں جا سکتی کہ کبھی وہ کسی سے کھل کر کسی ذاتی موضوع پر بات کرے گا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے حسن کمال کی شخصیت کی اس الوفنس کو اگر ختم کر دیا جائے تو کیا وہ اس معاشرے کا اور ''اون لکر'' کا ایک مزید مثبت ممبر نہیں بن سکتا جو قدرتی صلاحیتیں اس کو ودیعت ہو چکی ہیں کیا وہ مزید نکھر نہیں جائیں گی۔ حسن کمال کی شخصیت کو پالش کرنے کے لیے اس کے ٹیلنٹ کو ابھارنے کے لیے کیا یہ کام بہت ضروری نہیں ہے۔'' کرن نے جوش میں آ کر کہا۔

''یہ بہت ضروری ہو بھی نا کرن فاطمہ تو بھی تقریباً ناممکن ہے۔ اس نے اپنی زندگی کو جس ماڈ پر سیٹ کر رکھا ہے اس سے ہٹنا اس کے لیے مشکل ہے۔ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ ایسی کسی کوشش کے نتیجے میں اس کی شخصیت مزید انتشار کا شکار ہو جائے اور ہم تم اپنی کوششوں پر پریشان ہو کر رہ جائیں۔''

''پھر تو اس شخصیت کو کھوجنا بہت ضروری ہے۔ جس کے لائے تحائف نے حسن کو کسی ایسے کے ہونے کی سرشاری میں مبتلا کر دیا جو اسکے لیے سوچتا اور تردد کرتا ہے۔ کم از کم، اس شخصیت کی اس حرکت نے چند دن کے لیے ہی سہی اس کے دل کے موسم تو بدل ڈالے اور کتنا مثبت اثر ہم

سب نے دیکھا۔''

''تم نے سائیکالوجی پڑھ رکھی ہے نا کرن، اسی لیے تم ان خطوط پر سوچ رہی ہو۔ اس سلسلے میں تمہیں بہت مہارت حاصل ہے۔ میری فیلڈ ذرا مختلف ہے۔ سو اگر تم سمجھتی ہو کہ اس سلسلہ میں تم کچھ کر سکتی ہو کوشش کرو ضرور کرو۔'' مہرین نے سنجیدگی سے کہا۔

''اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔'' کرن مسکرا کر بولی۔ ''چند دن پہلے تک میں مایوسی کے عالم میں سوچ رہی تھی کہ کرنے کا کام تو کوئی بھی نہیں۔ اون لکر کا میٹریل ادھر اُدھر سے پکڑ کر پورا کر لیتے ہیں یہ تو کوئی کام نہ ہوا مگر اب میں سمجھتی ہوں کہ مجھے کرنے کو ایک کے بجائے دو دو کام مل گئے۔ مہ پارہ بیگم اور حسن کمال۔ لگتا ہے آنے والا کچھ وقت اچھی مصروفیت میں گزرے گا۔''

''مارجن بھی ہے کام کا۔'' مہرین مسکرائی۔ ''مجھے تم جیسی ڈیڈیکیٹڈ لڑکیاں ہمیشہ سے اچھی لگتی ہیں اور تمہارے ارادے بھی اچھے ہیں مگر فی الحال تو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ہم صرف باتیں کیے جا رہے ہیں اور کام آج ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ ڈاک پکڑو، ٹیبل باکس چیک کرو اور کوشش کرو کہ جواب جلد ہی لکھ لیے جائیں۔''

''انتہائی بورنگ کام۔'' کرن نے منہ بنا کر کہا اور مہرین کے ہاتھ میں پکڑے کاغذ اس سے لے کر اپنی ٹیبل کی طرف چلی گئی۔

......o......

ڈاکٹر عبدالصبور کی یہ کلائنٹ پہلی مرتبہ آئی تھیں اور ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر عبدالصور سے اپائنٹمنٹ فون پر لی تھی۔ شازیہ نے ڈاکٹر صاحب سے انٹرکام پر بات کر کے اس اپائنٹمنٹ کے بارے میں کنفرم کر لیا تھا اور اپنے کمپیوٹر پر ان کا بائیو ڈیٹا اینٹر کرنے لگی۔ نام مسز گورائیہ، عمر 62 سال۔ سکنہ لاہور۔ پہلی اپائنٹمنٹ کے آگے تاریخ اینٹر کی اور ایک نظر ان پر ڈالی وہ خاصی بارعب شخصیت تھیں اور ان کے لباس اور ہیرے کے زیورات سے ان کی امارت ٹپک رہی تھی۔ نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر شازیہ کو یہ خیال آیا کہ جیسے انہیں اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا مگر اسے کوشش کے باوجود یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔

ایک دفعہ پھر ان کی جانب دیکھنے پر اس کی نظریں ان کی نظروں سے چار ہوئیں اور وہ حسب دستور ہولے سے مسکرائی مگر جواب میں انہوں نے انتہائی سرد نگاہ اس پر ڈالی۔ ان کے چہرے پر مروت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ شازیہ نے گھبرا کر اپنی توجہ مسز طارق کی طرف مبذول کر لی۔

چوبیس سالہ شادی شدہ مسز طارق نازک اندام اور بڑی اسٹائلش سی خاتون تھیں اس وقت وہ لائٹ گرین ٹراؤزر اور وائٹ سلیولیس شارٹ شرٹ میں ملبوس تھیں۔ ان کے گلے میں اسکارف پڑا تھا اور ان کے ریشمی گولڈن بال ان کے شانوں پر پڑے تھے۔ مسز طارق کے کانوں میں بھی ہیرے چمک رہے تھے لاشعوری طور پر شازیہ نے مسز طارق کے ہیروں کا موازنہ نئی آنے والی خاتون کے کانوں اور ناک میں پڑے ہیروں سے کیا۔ اسے ان کی کوالٹی کا کوئی خاص اندازہ نہیں تھا مگر اسے محسوس ہوا تھا کہ نئی خاتون کے ہیرے زیادہ قیمتی اور نفیس تھے۔

''مس شازیہ آپ نے ایروبکس کی کلاسز جوائن کیں یا نہیں؟'' مسز طارق نے اپنے بیگ کا اسٹریپ مروڑتے ہوئے اچانک اس سے پوچھا۔ وہ اپنے پچھلے وزٹ پر وقت گزاری کی گفتگو میں اسے یہ مشورہ دے چکی تھیں۔

''میں نے کوشش کی تھی مسز طارق مگر ایوننگ کلاسز کا میرے یہاں کے اوقات کار سے کلیش ہو گیا اس لیے میرا ارادہ ناکام ہو گیا۔'' شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک نظر پھر نئی خاتون پر ڈالی۔ وہ ان کی باتوں سے بے نیاز پیشانی پر بل ڈالے کسی سوچ میں گم تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود مسٹر عالم عزیز کے باہر آنے پر اس نے مسز طارق کو اندر بھجوا دیا۔ اب کمرے میں وہ خود اور نئی خاتون ہی بیٹھی تھیں اور ان کی موجودگی میں شازیہ کو بلاوجہ گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ مسز طارق کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا سیشن ہمیشہ ہی کافی طویل ہوتا تھا اور اس خیال سے کہ وہ اتنی دیر ان خاتون کے ساتھ یہاں بیٹھی رہے گی شازیہ کو ہول اٹھ رہے تھے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اپنی گھبراہٹ کا کیا علاج کرے بیرونی دروازہ کھلنے پر اس نے فیضان مقصود کو اندر آتے دیکھا۔ اس باتونی شخص کو اندر آتے دیکھ کر پہلی مرتبہ شازیہ کو حقیقی خوشی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر آج کی اپائنٹمنٹ لسٹ پر ڈالی۔ اس میں فیضان مقصود کا نام موجود نہیں تھا۔ حسب معمول وہ پھر بغیر اپائنٹمنٹ کے آ گیا تھا۔

''آج اپائنٹمنٹس کی فہرست طویل اور ڈاکٹر صاحب دیر ہی سے فارغ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ آج وہ آپ سے نہیں مل سکیں گے۔'' شازیہ نے مسکرا کر فیضان مقصود سے کہا۔

''میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے آیا بھی نہیں ہوں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''پھر.....؟'' شازیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''پھر یہ کہ میں آپ سے ملنے آیا ہوں اور یہ انوی ٹیشن کارڈ بھی آپ کے لیے لایا ہوں۔''

''یہ کیسا انوی ٹیشن کارڈ ہے؟'' شازیہ نے میرون کارڈ پر سنہری حروف سے چھپے الفاظ پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''ہماری نئی فیکٹری کی لانچنگ میرے یمنی ہے، آواری میں۔ میوزیکل شو کا بھی اہتمام ہے اور آپ کو آنا ہوگا ہر حال میں۔'' شازیہ کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ کیوں اس کے لیے یہ کارڈ لایا تھا اور کیسے تحکم سے آپ کو آنا ہوگا ہر حال میں کہہ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں نے اس فنکشن میں محدود سے لوگوں کو بلایا ہے اور آپ کو تو بطور خاص خود کارڈ دینے کے لیے آیا ہوں۔'' وہ اسے مزید حیران کر رہا تھا۔

''مگر کیوں؟'' شازیہ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔

''اس لیے کہ میرا دل چاہتا تھا آپ کو کہیں باہر انوائٹ کرنے کو۔'' فیضان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ شازیہ نے کچھ وقت اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے میں گزارا اور پھر چونک کر ایک درزیدہ نگاہ نئی خاتون پر ڈالی جو یقیناً ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھیں ان کے چہرے پر شکنیں پڑ رہی تھیں۔ اس نے کارڈ واپس اس کے کور میں رکھا اور اپنی ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔

''یہ فنکشن آپ کے کام کے اوقات کے بعد شروع ہوگا۔ میں آپ کو لینے کے لیے خود آؤں گا۔'' اس نے ایک اور حیران کر دینے والی بات کی۔

''آپ کو ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے؟'' شازیہ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی دوسری بات کرنے کو نہیں تھی۔

''میں نے یہ بات تو آپ کو پہلے ہی بتا دی تھی کہ میں آج ڈاکٹر صاحب سے ملنے نہیں آیا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''آپ غالباً نروس ہو رہی ہیں، میں چلتا ہوں آپ سے فون پر بات کروں گا کنفرمیشن کے لیے۔'' اس نے اپنے سن گلاسز آنکھوں پر لگاتے ہوئے کہا اور واپسی کے لیے مڑا۔ جاتے جاتے ایک سرسری سی نظر اس نے نئی خاتون پر ڈالی اور ان کی رعب دار شخصیت کو دیکھ کر ذرا کی ذرا ٹھٹکا بھی اور پھر سرعت سے باہر نکل گیا۔

''یہ کتنی دیر میں فارغ ہو جائیں گی خاتون جو اندر گئی ہیں؟'' کچھ دیر بعد کمرے میں نئی خاتون کی آواز گونجی۔

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' شازیہ نے کہا۔

''کیوں، کیا ڈاکٹر صاحب نے ہر ایک کے لیے برابر وقت تقسیم نہیں کر رکھا۔'' شازیہ ان کے لب و لہجے سے یقیناً متاثر ہوئی تھی۔ الفاظ کی ادائیگی اور تلفظ ایسا تھا جو اب کم ہی سننے کو ملتا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب مقرر وقت کے قائل نہیں جب تک ان کا کلائنٹ مطمئن نہیں ہو جاتا وہ اس سے گفتگو کرتے رہتے ہیں۔''

''ایسی صورتِ حال میں تو مقررہ وقت پر ہی پہنچنا چاہیے۔ میں غالباً ڈاکٹر صاحب کے بتائے وقت سے بہت پہلے پہنچ گئی ہوں۔''

''آپ کو کون سا وقت بتایا تھا انہوں نے۔ دراصل میرے پاس آپ کی آمد کی اطلاع نہیں ہے۔'' شازیہ نے متانت سے کہا۔

''سات بجے کا کہ تھا اور میں شاید چھ بج کر دس منٹ پر ہی پہنچ گئی۔''

''سات بجنے والے ہیں۔'' شازیہ نے وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''خاتون اب فارغ ہوتی ہی ہوں گی۔'' اسی لمحے ڈاکٹر صاحب کے آفس کا دروازہ کھلا اور مسز طارق باہر آ گئیں۔ شازیہ نے انٹر کام پر مسز گورائیہ نامی خاتون کے بارے میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے اسے انہیں اندر بھیجنے کو کہا۔ ان کے اندر جانے پر شازیہ نے سکھ کا سانس لیا۔ ان کی موجودگی میں وہ بلا وجہ ہی گھبرا رہی تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی اور تنہائی پر اس نے دراز سے وہ خوبصورت کارڈ نکالا اور اس کے الفاظ پڑھنے لگی۔ ''آپ کو آنا ہوگا ہر حال میں خود آپ کو لینے کے لیے آؤں گا۔'' اس کے کانوں سے دو جملے ٹکرائے اور لمحہ بھر کے لیے اسے اپنا آپ کسی وی آئی پی کا سا لگا۔

''رویوں اور الفاظ پر یقین کر لینے سے پہلے ان کا تجزیہ کر لینا انسان کے لیے فیصلہ کرنے میں انتہائی معاون ثابت ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر صبور کی کہی ایک بات یاد آ گئی۔

''یہ بھی ہے، ایک دو ملاقاتوں میں ہی وہ اتنا بے تکلف ہو گیا کہ یوں کارڈ مجھے لا پکڑایا اور پھر اتنے استحقاق سے شامل ہونے کا فیصلہ بھی صادر کرنے لگا۔'' اس نے سوچا اور کارڈ کی سائیڈ رپ لگی میرون اور سنہری ڈوری کھینچ کر اسے دوبارہ دراز میں رکھ دیا۔

وہ بیک وقت دو احساسات سے دوچار ہوئی تھی۔ اہمیت ملنے کے احساس سے اور دوسرے کے احساس سے۔ اسے پہلے احساس کے لمحاتی ثابت ہونے کا دکھ بھی تھا۔

''ماشاء اللہ آپ کا چہرہ تو خاصا فوٹو جینک ہے۔'' سمعیہ سلطانہ کے سامنے بیٹا شخص اسے کہہ رہا تھا جو کسی پروڈکشن ہاؤس کا مالک تھا اور اس وقت مہ پارہ بیگم سے ملاقات کے لیے آیا بیٹھا تھا۔ جب سمعیہ سلطانہ رباب کے ساتھ بطور خاص مہ پارہ بیگم سے ملنے اور ان کی حویلی دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ یہاں اس کی مڈبھیڑ اس شخص نواز وڑائچ سے ہو گئی جو ایک مشہور پروڈکشن ہاؤس کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ٹی وی پر اکثر نظر آنے والا کمپیئر بھی تھا جو موسیقی کے پروگرام کی کمپیئرنگ بھی کرتا تھا۔

''بیگم صاحبہ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم چہرے اور ٹیلنٹ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ آپ سے تو پرانی یاد اللہ ہے مگر آپ اس سلسلے میں ہمارا کچھ ساتھ بھی نہیں دیتیں۔''

''بات یہ ہے نواز میاں کہ یہ بچی آج پہلی مرتبہ یہاں آئی ہے۔ اس کی سہیلی میری شاگرد ہے۔ یہ تو محض اپنی سہیلی کے توسط سے مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہے اور بات یہ بھی تو ہے کہ چہروں اور ہنر کے بارے میں تم لوگوں کے معیار سے ناواقف ہوں۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔'' مہ پارہ بیگم نے چھالیا چباتے ہوئے کہا۔

''بیٹا نام کیا ہے آپ کا؟'' نواز وڑائچ براہ راست سمعیہ سے پوچھنے لگا۔

سمعیہ لاکھ بولڈ اور بہادر ہونے کا دعویٰ کرتی مگر اپنے محلے یا کالج سے نکل کر پہلی مرتبہ کسی نئی جگہ پر آئی تھی اور ایسی ہستیوں کے سامنے بیٹھی تھی جو اس کے خیال میں نام ور تھیں۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔

''اس کا نام سمعیہ سلطانہ ہے۔'' رباب جو نواز وڑائچ سے ملاقات پر ہی خود کو ٹی وی اسکرین پر گاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اپنی آواز کو سریلا بنا کر بولی۔

''خوب، ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔'' نواز وڑائچ نے سر ہلا کر کہا۔

''آپ پڑھتی ہیں کیا؟''

''جی، میں۔'' سمعیہ سلطانہ سے اس سے آگے کچھ کہا نہیں گیا۔

''عمر یاد، تمہیں یہ چہرہ کیسا لگ رہا ہے؟'' نواز وڑائچ نے سمعیہ سے توجہ ہٹا کر اس کمپیئر کو مخاطب کیا۔

''آپ چہرہ شناس ہیں سر، آپ کا اندازہ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ مسکرا کر خوشامدی سے لہجے میں بولا۔ سمعیہ نے محسوس کیا مہ پارہ بیگم اس صورت حال کو انتہائی ناگوار محسوس کر رہی تھیں۔

''نواز میاں، تم بچے بچیوں کو موسیقی کے مقابلے کے لیے دعوت دینے آئے تھے نا۔ وہ ان لوگوں کو مل گئی اب کوئی اور کام ہو تو بتاؤ۔'' انہوں نے سراسر یہ بات ان دونوں کو وہاں سے ٹل جانے کا اشارہ دینے کے لیے کہی تھی۔

''جی بالکل بیگم صاحبہ۔'' وہ مؤدب سا ہو کر بولا۔ ''مگر دیکھیے اللہ نے ہمیں ایک ایسا چہرہ یہاں دکھا دیا جسے ہم عرصے سے تلاش کر رہے تھے۔'' ''وسیم بٹ نے جو ڈراما لکھا ہے جسے افضل مغل پروڈیوس کر رہا ہے اس کے مرکزی کردار کے لیے انہیں ایسے ہی چہرے کی تلاش ہے کیوں بیٹا۔ آپ کو ڈراموں میں کام کرنے کا شوق نہیں ہے کیا۔'' اس نے ایک بار پھر سمعیہ کو مخاطب کیا۔ سمعیہ کے گھٹنے کانپنے لگے۔ مہ پارہ بیگم ایک نظر میں اس کی حالت بھانپ چکی تھیں۔ جہاندیدہ تھیں سمجھ گئیں کہ لڑکی کس بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی تھی۔

''ہر راہ چلتے کو فنکار بنانے پر تلے بیٹھے ہو نواز میاں، ضروری تو نہیں کہ جسے تم فنکار بنانا چاہو وہ فنکار بننا چاہتا ہو۔ یہ لڑکی یقیناً ایسا ہرگز نہیں چاہے گی۔ تمہیں ابھی کئی اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے، اللہ حافظ کہو ابھی۔'' اب کے انہوں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''بیٹا یہ میرا کارڈ ہے اس پر میرا انتہائی پرسنل نمبر بھی درج ہے۔ میری بات دل کو لگے تو فوراً کال کرنا۔'' نواز وڑائچ مہ پارہ بیگم کے لہجے سے مرعوب ہو کر فوراً اٹھ گیا مگر جاتے جاتے ایک بار پھر سمعیہ کو چارڈالنا نہ بھولا۔ مہ پارہ بیگم نے اس جاتے ہوئے پر ایک خشمگیں نظر ڈالی اور پھر رباب کی جانب متوجہ ہوئیں جو سمعیہ سے سرگوشیوں میں گفتگو کر رہی تھی۔

''میڈم، یہ نواز صاحب.....؟'' انہیں اپنی جانب متوجہ محسوس کر کے رباب نے پوچھا۔ ''کیا واقعی سنجیدگی سے بات کر رہے تھے۔ کیا انہیں واقعی کسی نئی لڑکی کی تلاش ہے۔''

''معلوم نہیں۔'' مہ پارہ بیگم نے جواب دیا۔ ''سیکڑوں کے حساب سے ڈرامے بن رہے ہیں ہر ما جھا گا رائٹر، پروڈیوسر، ڈائریکٹر بنا بیٹھا ہے جس کو کالے دھن کو سفید کرنا درکار ہوتا ہے وہ اس بزنس میں پیسا لگا دیتا ہے۔ ایسے میں ہم کون سے ایسے مردم شناس ہیں جو لوگوں کی گواہیاں دیتے پھریں۔''

''لیکن وہ ہم لوگوں کے میوزک مقابلے کی بات بھی تو کر رہے تھے۔'' رباب ان کے درشت لہجے سے ذرا منمنائی۔

''میوزک مقابلے تو جگہ جگہ ہو رہے ہیں، تم کہو کہاں نہیں ہو رہے۔'' مہ پارہ بیگم نے ہاتھ

میں پکڑی پنکھی جھلتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کسی مقابلہ جیتنے والے کو دوبارہ کہیں دیکھا ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' رباب نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو ایسی باتوں کا زیادہ علم ہی نہیں ہے نا۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ جو بھی کوئی بات ایسے لوگ کرتے ہیں کچھ ہی ہوتی ہو گی۔ ابھی میں سمعیہ کو مبارکباد دے رہی تھی کہ تم اچھی رہیں جو انہوں نے تمہیں ایک بار دیکھنے پر ہی سلیکٹ کر لیا۔''

''مشورہ بھی تخنے کی طرح ہوتا ہے۔'' مہ پارہ بیگم نے بھاگ بھری (ملازمہ) کو اشارہ کر کے اپنا پاندان لانے کے لیے کہتے ہوئے کہا۔ ''میرا مشورہ تو تم جیسی بچیوں کے لیے یہی ہے کہ دانے لے کر جگہ جگہ بیٹھے شکاریوں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کیا کرو۔ ہمارا زمانہ اور تھا۔ شرافت بھی تھی، احترام بھی تھا اور اخلاق بھی تھا مگر جب بھی دھوکے باز معصوم لڑکیوں کو ورغلا کر گھروں تک سے بھگا لاتے تھے۔ وہ غریب گھر سے بھی جاتی تھیں اور آبرو و عزت سے بھی۔ باقی کی زندگی پردۂ اسکرین پر ایکسٹرا کے طور پر نظر آنے میں گزار دیتی تھی یا اس بازار کی رونق بن کر۔ زمانہ بدل گیا، شکاریوں کے طور طریقے بدل گئے مگر مقصد ایک ہی ہے۔ ہاں آگاہی اور شعور میں ضرور اضافہ ہوا ہے۔ اب لڑکیاں بھی سمجھدار اور ہوشیار ہو چکی ہیں۔ اپنا برا بھلا خوب جانتی ہیں۔ ویسے یہ تمہاری دوست آج ادھر آئی کیسے تھی۔'' انہوں نے بات کے اختتام پر سر جھکا کر بیٹھی سمعیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یونہی، بس آپ سے ملنے اور اس حویلی کو دیکھنے کے لیے۔'' رباب مسکرا کر بولی۔

''اپنے والدین سے اجازت لے کر آئی ہو نا؟'' مہ پارہ بیگم نے براہ راست سمیعہ سے پوچھا۔

''جج.....جی.....'' وہ ذرا گڑبڑا کر بولی اور اپنی قمیص کا دامن سیدھا کرنے لگی۔

یہ سوال آپ نے کیوں کیا میڈم.....؟'' رباب جو اُن سے قدرے بے تکلف تھی پوچھنے لگی۔

''ہر کوئی تمہارے والدین کی طرح موسیقی کا اس قدر دلدادہ نہیں ہوتا کہ کھلے دل سے بچیوں کو گویوں کے پاس گانا سیکھنے یا ان سے ملاقات کے لیے بھیج دے۔ یہ بچی مجھے نظر آ رہا ہے کہ یہیں کہیں آس پاس کے علاقے سے تعلق رکھتی ہے اور محض اپنے اشتیاق کے لیے تمہارے ساتھ ادھر آ گئی ہے۔ جی بھر کر ملو تم مجھ سے اور جی بھر کر دیکھو اس حویلی کو آج سمعیہ سلطانہ لیکن آئندہ کبھی اگر ادھر آنے کو جی چاہے تو اپنے والدین کو بتا کر ان سے اجازت لے کر آنا۔'' سمعیہ سلطانہ ان کے مضبوط اور کرخت لہجے سے خائف اور شرمندہ ہو گئی۔

"چلو چلیں۔" اس نے رباب سے کہا۔

"خیر اب یوں بھی نہ کہو۔ آج تو آ ہی گئی ہو سو میری مہمان ہو میری بات کا برا مت مناؤ۔ میں نے عمر گزاری ہے اسی دنیا میں۔ دوسروں کی بہن بیٹیاں مجھے اسی طرح عزیز ہیں جیسے اگر میری اپنی ہوتیں تو عزیز ہوتیں۔ آج کل کی نسل میں یہی تو ایک خامی ہے کہ اسے سمجھانے بیٹھو تو برا مان جاتی ہیں۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور ملازمہ کو آواز دی۔ "اختری جلدی سے چائے پانی کا بندوبست کرو۔ مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ تم لوگوں سے جب تک کہوں نہیں ہلتی نہیں ہو اپنی جگہ سے۔"

"یہ نواز صاحب۔" رباب کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ "میڈم وہ آپ کو بھی تو دعوت دے رہے تھے میوزک مقابلے میں جج بننے کی۔ آپ نے ان کی دعوت کیوں قبول نہیں کی۔"

"تم جانو بچی، عرصہ ہوا میں نے اس طرح کے ہنگاموں سے منہ موڑ لیا ہے اس لیے کہ اب ایسی باتوں میں دل لگنے کے بجائے مجھے ان سے وحشت ہوتی ہے پھر ایسے مقابلوں میں وہ بلاتے بھی تو ان لڑکے لڑکیوں کو ہیں جن کے پاس سفارش ہوتی ہے پھر ٹیلنٹ ڈھونڈنے والی بات تو غلط ہوئی نا۔ ایسے نورا مقابلوں میں ہم نے منصفی کر کے کرنا بھی کیا ہے۔"

رباب نے فخریہ نظروں سے سمعیہ کو دیکھا گویا کہہ رہی ہو دیکھا کیسی بااصول ہیں میری استاد مگر سمعیہ پر خفت اور شرمندگی کا جو دورہ پڑ گیا تھا اس کی وجہ سے اسے کسی بات میں بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"ناشتا آنے تک چلو میں تمہیں اپنی حویلی دکھا لاؤں۔ مہ پارہ بیگم کو لڑکی کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا جب وہ اپنے مزاج کے خلاف خود اٹھ کر انہیں حویلی کے مختلف حصے دکھانے کے لیے لے آئی تھیں اور یہ سب دیکھتے دیکھتے سمعیہ کو اپنی ذہنی حالت بھول گئی تھی۔ وہ اس حویلی کی عظمت اور خوبصورتی کے فسوں میں کھو سی گئی تھی۔ کیسے اونچی چھتوں والے بڑے اور کھلے کھلے کمرے تھے۔ منقش چھتیں اور رنگدار شیشے کی ٹکڑیوں سے سجے دروازے اور کھڑکیاں۔ صحن، فوارے اور چبوترے۔ جالی دار چھتر کے وہ منڈیریں۔ فرنیچر اور دیگر سامان ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی اور نایاب تھا۔ سجاوٹ کو نادر اشیاء آبدار تلواریں، شیروں اور چیتوں کی کھالیں اور سرا یک چبوترے پر شطرنج کی بساط بنی ہوئی تھی اور سنگ مرمر کے منقش صندر قچے میں سنگ مرمر کے ہی خوبصورت مہرے بند تھے۔

"اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔" سمیعہ سلطانہ نے شاگرد پیشہ کے لیے بنے حصے کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "اتنے کھلے اور ہوادار کمرے تو ہمارے اونچے پکے مکان میں ہمیں بھی میسر نہیں۔"

وہ واپس کھلے صحن میں آئیں تو سنگ مرمر کے تخت پر ناشتا چنا جا چکا تھا۔ بلدار پراٹھوں کے ساتھ کچومر پیاز اور ہری مرچوں والا آملیٹ اور میٹھی لسی کا ناشتا۔

"مہمان خانے میں بھجوا دیا ناشتا؟" مہ پارہ بیگم نے ابرو چڑھا کر قریب کھڑی اختری سے پوچھا۔ جس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کے یہاں کوئی مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں میڈم" رباب نے لسّی کا گلاس پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ ہیں ایک پرانے شناسا۔ جب کبھی شہر میں آنا ہو تو ادھر ٹھہر جاتے ہیں۔" مہ پارہ بیگم نے مختصر جواب دیا۔ "آملیٹ بہت لذیذ ہے اور آلو کی بھجیا بھی۔" رباب نے تائید طلب نظروں سے سمعیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سمعیہ نے غالباً اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ ان قیمتی ظروف اور ناشتا پیش کرنے کے انداز کی نفاست میں کھوئی ہوئی تھی۔ ماڈرن زندگی تو بہت دیکھ رکھی تھی مگر زندگی کا یہ انداز اچھوتا بھی ہے اور خوبصورت بھی۔" پھر اس نے ایک نظر نفاست سے ناشتا کرتی مہ پارہ بیگم پر ڈالی۔ سفید لٹھے کا کھڑ کھڑاتا چوڑی دار پاجامہ اور چھوٹے پھولوں کے پرنٹ کا آسا ی کرتہ اس پر آسمانی بیل ٹکا سفید ململ کا ابرق لگا دوپٹا سر اوڑھے وہ کتنی رعب دار شخصیت لگ رہی تھیں۔ ان کی کلائیوں کے کنگن اور گلے میں پڑا کنٹھا، ناک میں پڑی لونگ اور کانوں میں چمکتے ہیرے، ان سب کا ڈیزائن بھی کتنا مختلف تھا۔ ان کی کھچڑی ہوتے بالوں کی سیاہ دراز چٹیا میں بیلے کی کلیوں کی لڑی بھی گندھی ہوئی تھی جب ہی ان سے بیلے کی مہک اٹھ رہی تھی۔ اس نے ان کی مخروطی انگلیوں میں موجود ہیرے کی نازک انگوٹھیوں اور نازک ہلکی ہلکی جھریوں والے ہاتھوں کو دیکھا۔ اس کے لیے یہ ایک نئی اور انوکھی دنیا تھی۔

"رباب ان سے کہو نا کچھ مجھے بھی سنا دیں۔" اس نے رباب کو ٹہوکا مار کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ رباب نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

"ناشتا کرنے کے فوراً بعد آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ اس کی نغمگی میں فرق آ جاتا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن یہ بچی نہ جانے پھر کبھی آئے کہ نہ آئے۔" انہوں نے اختری کو ہاتھ دھونے کے برتن لانے کا اشارہ کیا۔ تام چینی کی سلفچی میں انہوں نے پیتل کے لوٹے سے نکلتی پانی کی دھار

سے ہاتھ دھوئے۔ کلی کی اور خس کی خوشبو میں بھگوئے گئے تولیے سے ہاتھ اور چہرے خشک کیا اب ہلکی ہلکی دھوپ اس صحن میں بھی اترنے لگی تھی۔ وہ چبوترے پر اپنے مخصوص اسٹائل میں بیٹھ گئیں اور انکی انگلیاں ستار کے تاروں کو چھیڑنے لگیں۔

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

''عشق کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے کیا؟'' سمعیہ نے ان کے خاموش ہونے پر اچانک پوچھا۔

''نہیں۔'' انہوں نے ستار کو اختیار سے پرے رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''پھر یہ شاعر کیوں کہتا ہے کہ وہ عشق کی انتہا چاہتا ہے۔'' سمعیہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''دوسرا مصرعہ بھی تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ شاعر خود ہی کہہ رہا ہے میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں۔ گویا وہ اپنی نادانی کا خود ہی اعتراف کر رہا ہے۔''

''خیر، شاعری کی باتیں تو میرے پلے کم ہی پڑتی ہیں۔ ہاں الفاظ کے ردھم اور نغمگی کی وجہ سے گیت، غزلیں، گانے سننے میں مزہ آتا ہے۔'' سمعیہ نے بے پروائی سے کہا اور رباب کو اٹھنے کے لیے اشارہ کر دیا۔

''آج تم نے حاضری کے باوجود ریاض کی چھٹی کر لی۔'' مہ پارہ بیگم نے رباب کو مخاطب۔

''بس یونہی وقت گزر گیا۔ اب تو ہم کالج سے بھی لیٹ ہو گئے۔'' رباب نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''اچھا میڈم اب چلتے ہیں۔ کل صبح سے انشاء اللہ دوبارہ کلاس شروع ہوگی۔'' اس نے جھک کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ طویل صحن سے نکل کر وہ دونوں حویلی کے بیرونی کار چوبی منقش دروازے پر پہنچ گئیں۔ انتری اور بھاگ بھری ان کے ساتھ تھیں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رباب کا پاؤں مڑ گیا اور وہ ہائے اللہ کہہ کر نیچے بیٹھ گئی۔ سمعیہ اور دونوں ملازمائیں بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کا پاؤں ملنے لگیں۔ اسی دم بیرونی کمرے سے کوئی نکل کر اس ڈیوڑھی نما انٹرنینس میں داخل ہوا۔ سمعیہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بڑی بڑی آنکھوں اور سفید گھنی مونچھوں والا وہ شخص خاصی بارعب شخصیت کا مالک تھا جو ہاتھ پشت پر باندھے اپنے سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر سمعیہ کے ذہن میں فوری طور پر ایک خیال یہ آیا تھا کہ اس نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا تھا۔ کہاں یہ سمعیہ کو سارا دن یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آیا۔

''آپ کہیں ناراض نہ ہو گئی ہوں۔ اس روز سے میرا دل ڈر سا رہا ہے۔'' شازیہ کے موبائل نمبر پر وہ کال فیضان مقصود کی تھی جس کی بات سن کر وہ حیران رہ گئی۔ اس نے کسی کو اپنا نمبر نہیں دیا تھا سوائے چند ایک قریبی دوستوں کے۔ اس شخص کو یہ نمبر کہاں سے مل گیا تھا۔

''اور اب آپ حیران ہو رہی ہوں گی میری کال پر۔'' اس نے فوراً ہی اس کی حیرت کا اندازہ بھی لگا لیا تھا۔ ''آپ کے چاچا شریف صاحب کی مہربانی ہے جو یہ نمبر مجھے مل گیا۔ ان کے پاس تو موجود تھا نا!''

''آپ کے فون کرنے کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' شازیہ نے قدرے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کچھ کام بلا مقصد بھی تو کیے جاتے ہیں نا مس شازیہ۔'' وہ ہنس کر بولا اور پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ''مجھے خوف لاحق تھا کہ آپ اس روز کارڈ والی میری جسارت پر ناراض نہ ہو گئی ہوں۔ آپ یقیناً میری جانب سے ایسی جسارت کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔''

''مجھے وہ بات بھول چکی تھی آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی۔'' شازیہ نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔

''آپ بھول چکی تھیں؟'' وہ چونکا۔ ''گویا وہ حرکت آپ کو ناگوار گزری تھی یا پھر آپ کے لیے وہ غیر اہم بات تھی۔''

''جو بھی سمجھ لیں۔'' شازیہ کو لسوڑے جیسی صفت رکھنے والے اس شخص سے وحشت ہونے لگی۔

''وہ فنکشن پرسوں شام کو ہے یاد رکھیے گا۔ میں کلینک ٹائمنگ کے بعد آپ کو پک کرنے کے لیے آؤں گا۔''

''میں اس سلسلے میں معذرت خواہ ہوں۔ میں گھر سے باہر کسی تقریب میں شامل نہیں ہونا چاہتی۔'' شازیہ نے رکھائی سے جواب دیا۔

''میرا ایک اصول ہے جس پر میں کمپرومائز نہیں کرسکتی۔ اب اس سے آپ کا دل ٹوٹتا ہے یا جگر میں اس کا ذمے دار خود کو نہیں سمجھتی۔'' شازیہ نے فون بند کرنے سے پہلے کہا اور سر جھٹک کر اس شخص کی شخصیت اور عمل کے تضاد پر غور کرنے لگی۔ دیکھنے میں کتنا مہذب اور سلجھا ہوا لگتا ہے اور حرکتیں دیکھو وہی فلرٹ ٹائپ چوہدریوں والی۔'' اسے فیضان مقصود کے پس منظر سے چڑ محسوس ہونے لگی۔

وہ خود بھی ایسے ہی پس منظر کی ڈسی ہوئی تھی۔ اسے اپنی زمینیں' گھر' ڈھور ڈنگر یاد آتے تھے۔ اسے اپنے باپ کو اس عمر میں یوں محنت کرتے دیکھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی اپنی زندگی میں گو زمین آسمان کا فرق آچکا تھا مگر اسے اپنی پچھلی زندگی اس شدت سے یاد آتی تھی مگر اب وہ لوگ مجبور تھے۔ برادری کے غلط فیصلے کی وجہ سے انہیں سب کچھ چھوڑنا پڑا تھا۔ اس کے بھائی ابھی چھوٹے تھے اور پڑھ رہے تھے۔ ان کے بڑے ہونے تک اسے اور اس کے باپ کو یونہی محنت کیے جانا تھا اور کون جانتا تھا کہ بھائیوں کے بڑے ہونے تک ان کے جذبات یہی رہتے ہیں یا بدل جاتے۔

''اور اب یہ فیضان مقصود۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک سے ایک بندہ آتا ہے مجال ہے کسی نے ایسی ول پھینک حرکتیں کی ہوں۔ ان لوگوں کی نظر میں ایک ریسپشنسٹ کی اہمیت ہی کیا ہوتی ہوگی مگر یہ چوہدری' حریص اور نظر باز ان کا کوئی اسٹینڈرڈ نہیں ہوتا۔'' اس کا خیال تھا کہ اس کے درشت رویے کو محسوس کرکے فیضان مقصود اس کا پیچھا چھوڑ دے گا مگر اس سے اگلے روز وہ کلینک پر آموجود ہوا۔

''میرا اپائنٹمنٹ ہے۔'' اس کی پیشانی پر پڑتے بل دیکھ کر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''آپ ڈاکٹر صاحب سے پوچھ سکتی ہیں۔ مجھے خود بلایا تھا انہوں نے ہم سلمان کے بارے میں مزید

ڈسکشن کریں گے آج۔'' شازیہ کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے سامنے ریکارڈ میں فیضان مقصود کا نام موجود تھا۔ اس وقت دو اور کلائنٹس بھی انتظار کررہے تھے۔ لہٰذا اس کو کوئی بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ فیضان کو وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہی گزری تھی جب اس کے دو بندے سلمان کو لیے چلے آئے۔ سلمان کو شکل پر نظر پڑتے ہی شازیہ کو وہ خوفناک واقعہ یاد آگیا مگر آج اس کے ساتھ آنے والے بندوں کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔

''ابھی ہم ڈاکٹر صاحب سے ملیں گے۔ ڈاکٹر صاحب ہم سے اچھی اچھی باتیں کریں گے۔ مانی کو اچھی اچھی باتیں اچھی لگتی ہیں نا۔'' شازیہ نے دیکھا وہ آہستہ آواز میں بچوں کی طرح سلمان کو چمکا رہا تھا۔

''کیا۔'' پھر سلمان کے کچھ کہنے پر وہ ذرا بلند آواز میں بولا تھا۔ ''کون مارنے لگا تھا کس کو.....ان کو۔'' اس نے شازیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان باجی کو گولی مارنے لگا تھا۔ نہیں یار..... انہیں گولی مار کر کسی نے جانا کدھر ہے۔ میں زندہ چھوڑوں گا اسے جو انہیں گولی مارے گا۔'' اس نے کن انکھیوں سے شازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوئے پا' تجھے نہیں معلوم' مارنے لگا تھا گولی سے۔ اس دن ٹھا کر کے۔'' ایک دم سلمان تڑپ کر اٹھا اس پر پھر وہی جنون سوار ہوگیا تھا۔ ''ادھر سے رائفل پکڑی اس نے یوں۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر دونوں ہاتھوں کو آپس میں جوڑ کر بازو سیدھے کرتے ہوئے شازیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایسے گولی مارنے لگا تھا اسے اس باجی کو یوں ٹھا ٹھا۔'' اس نے باقاعدہ ایکٹنگ کی۔ ''پھر میں نے بچایا۔ ادھر سے ہاتھ ڈال کر۔'' وہ چھلانگ لگانے کا ایکشن دکھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے کہا اوئے تو لڑکی کو مارنے لگا ہے' میرے ابے نے تو بندے مارے تھے دو ٹھا ٹھا کرکے۔ تو لڑکی مارنے لگا اب تو پچ گیا تھا تجھے نہیں بچانا کسی نے پولیس سے' میں نہ پکڑنا اسے تو یہ تو گئی تھی خونوں خون ہوجانا تھا اس نے۔'' اب وہ چیخنے لگا تھا۔ فیضان اور اس کے ساتھ آئے دونوں بندے اسے قابو کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ دونوں کلائنٹس جو انتظار کررہے تھے اس صورت حال پر بری طرح گھبرا گئے۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ شازیہ کہ ایسی صورت حال میں تمہیں گھبرانے کے بجائے کیا کرنا ہے۔'' شازیہ کو ڈاکٹر صبور کی نصیحت یاد آئی۔

”پلیز‘ آپ تھوڑی دیر کے لیے باہر لے جائیں۔“ اس نے اپنی سیٹ پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”او...... میں نے باہر نہیں جانا پا۔ میں نے نہیں جانا۔“ فیضان سلمان کو باہر لے کر جانے کی کوشش کرنے لگا تھا مگر وہ اس سے اپنا چھڑوا رہا تھا۔ ”میں باہر چلا گیا تو وہ اسے ماردیں گے ٹھاو کر کے‘ پھر ڈھیر سارا خون نکلے گا یہ مرجائے گی پا۔ میں نے اسے مرنے نہیں دینا۔“ اب وہ رونے لگا تھا۔ شازیہ نے دیکھا اس کی اس حالت پر فیضان دل گرفتہ نظر آنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا وہ اسے بہلاتے ہوئے چمکارتے ہوئے باہر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر اس نے اپنے بندوں کو اشارہ کیا جو سلمان کو اٹھا کر باہر لے گئے۔

”آئی ایم سوری مس شازیہ سلمان کی یہاں آمد ہر دفعہ آپ کے لیے پریشانی کا باعث بنتی ہے۔“ سلمان کے جانے کے بعد وہ مرے مرے قدموں سے چلتا شازیہ کی طرف آیا تھا۔

”دراصل اس مرتبہ تو ڈاکٹر صاحب نے سلمان کو ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی ذہنی کیفیت میں تقریباً تیس فیصد بہتری پیدا ہوچکی ہے مگر یہاں آکر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ایسا نہیں ہے وہ وہیں کھڑا ہے جہاں سے چلا تھا۔“ شازیہ نے اس کی کرب اور اضطراب کو دل سے محسوس کیا۔

”یہ ٹھیک ہوجائے گا‘ ڈاکٹر صاحب اپنے کام کے ماہر ہیں۔ یقیناً سلمان انہی کے ہاتھ سے شفا پائے گا۔“ اس نے اٹکتے ہوئی بمشکل یہ الفاظ ادا کیے۔

”فی الحال میں اسے لے جا رہا ہوں۔ اسے گھر پہنچا کر میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لوں گا۔ وقت کی گنجائش ہوئی تو دوبارہ آجاؤں گا۔ اکیلے ان سے ڈسکس کرنے۔“ وہ واپسی کے لیے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

*

(Exploring The History Of The Legend) کے عنوان سے اون لکر نے جہاں آرا بیگم پر آرٹیکل شائع کر کے اس تاریخ پر قسط وار آرٹیکلز کے سلسلے کا آغاز کیا تھا جس کا آئیڈیا کرن فاطمہ نے دیا تھا۔ یہ آرٹیکل حسن کمال اور کرن فاطمہ کی ملی جلی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ جس کے لیے حسن کمال نے ریڈیو پاکستان کی میوزک لائبریری اور شہر بھر کی لائبریریوں میں

موجود برصغیر کے شعبہ موسیقی سے متعلق شائع شدہ تمام کتابیں چھان ماری تھیں۔ جہاں آرا بیگم کی ایک مدھم اور غیر واضح تصویر بھی ان کے ہاتھ کہیں سے لگ گئی تھی۔ اسی کو کمپیوٹر پر تکنیکی طریقے سے ٹھیک ٹھاک کر کے انہوں نے خاصا خوبصورت بنا لیا تھا۔ اس مضمون میں جہاں آرا بیگم کی تاریخ پیدائش‘ جائے پیدائش سے لے کر ان کے بچپن اور جوانی تک کی تاریخ رقم تھی۔ ساتھ ساتھ اس عظیم فنکار گھرانے کی بنیادی ستون ہونے کے حوالے سے موسیقی کی دنیا میں ان کی خدمات کا ذکر بھی موجود تھا۔ وہ یقیناً ایک مفصل اور جامع تعارفی آرٹیکل تھا۔ اسی کی وجہ سے اون لکر کے تازہ پرچے سے متعلق چند اور اخبارات و رسائل میں انہوں نے اشتہار بھی چھپوائے تھے جن میں خصوصی طور پر اس آرٹیکل کا ذکر تھا۔ ان کے اپنے اندازے اور توقع سے زیادہ اس بار ”اون لکر“ کے پرچے بکے تھے اور کرن فاطمہ کو باضابطہ طور پر ایک زرخیز ذہن ”اون لکر“ کے ایڈیٹوریل بورڈ نے قرار دے دیا تھا۔

”میں نے تو پہلے دن ہی اس کو پہچان لیا تھا۔“ مہرین کیانی سر دھنتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”آپ نے محض میرے رضا کارانہ کام کرنے والی بات پر میرا نوٹس لیا تھا ورنہ آپ مجھے اچھا خاصا ٹرخا رہی تھیں درخواستوں کے ڈھیروں کی خبریں سنا کر۔“ کرن نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

”ویسے جہاں آرا بیگم سے متعلق کئی باتیں ہم نے خود ہی گھڑ لیں اگر کوئی واقف حال نکل آیا تو کرکری بھی ہوسکتی ہے۔“ حسن کمال نے خیال ظاہر کیا۔

”جو واقعات تاریخ کی گرد تلے اتنے زیادہ دب چکے ہیں انہیں جھاڑنے کے لیے اتنی ہی فینٹسی کی گنجائش نکل آتی ہے۔“ کرن نے بے پروائی سے کہا۔

”چلو مبالغہ اور فینٹسی تمہارے کھاتے میں رہی۔ باقی حقائق میرے کھاتے میں۔“ حسن نے مسکرا کر کہا اور کسی کام کا کہہ کر آفس سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی جہانگیر نے بتایا کہ حسن کمال سے ملنے کے لیے کوئی آیا کھڑا تھا۔

”تو انہیں بتاؤ کہ وہ ہے نہیں۔“ مہرین نے کہا۔

”وہ آپ کا نام بھی لے رہے ہیں۔“

”اچھا۔“ مہرین نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”چلو بلا لاؤ۔“

وہ بلال ظفر تھا حسن اور مہرین کا کلاس فیلو۔ مہرین نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ وہ

ماسٹرز کے بعد آسٹریلیا چلا گیا تھا اور اتنے سالوں بعد اب واپس آیا تھا۔ جتنی دیر وہاں ٹھہرا رہا اس کی گفتگو کا دائرہ مہرین سے زیادہ حسن کمال کی شخصیت کے گرد گھومتا رہا۔ وہ فوری طور پر اس سے ملنے کا خواہش مند تھا۔

.....

آج کل اتنے زیادہ ٹی وی چینلز پاکستان میں موجود ہیں کہ ایک دوسرے کے مقابلے میں ایک سے ایک بڑی بے ہودگی پیش کرتے ہوئے ان کے کرتا دھرتاؤں کو کبھی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ مرزا صاحب جو دبئی کی سیر سے واپس آنے کے بعد مہ پارہ بیگم سے ملنے کے لیے آئے تھے اپنی سیر، مشاہدے اور تجربات بیان کرنے کے بعد کسی بات کے یاد آ جانے پر بولے۔

"سوتو ہے۔" مہ پارہ بیگم نے خاص ان کے لیے بنائی گئی سبز جائے کی پیالی ان کو پیش کرتے ہوئے جواب دیا "لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک دوسرے سے یہ مقابلہ کم کرتے ہیں سرحد پار کے چینلز جیسا بننے کی خاطر یہ بے ہودگیاں زیادہ ہو رہی ہیں۔"

"ادھر واپسی پر جہاز میں ایئر ہوسٹس نے چند رسائل مطالعے کے لیے پیش کیے ان میں سے ایک مضمون آپ کے فنکار گھرانے پر بھی تھا گو انگریزی پڑھنی اتنی زیادہ ہمیں نہیں آتی مگر آپ کی والدہ اور ان کی والدہ کے نام کی تصاویر بھی موجود تھیں۔ اس رسالے میں۔" مرزا صاحب کو یاد آیا۔ "اب آپ کی والدہ اور نانی ویسی تھیں بھی یا نہیں اور جو کچھ احوال ان کا لکھا گیا تھا اس میں وہ درست تھا یا نہیں یہ تو معلوم نہیں مگر وہ سب دیکھ کر یہ خیال ضرور آیا کہ یہ جو سارے کے سارے ذرائع ابلاغ ہیں ہی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کیا کیا کہانیاں گھڑتے ہیں۔"

مرزا احب کی یہ بات سن کر موہیے اور گلاب کے ہار پروتی مہ پارہ بیگم کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔

"ارے مرزا صاحب' سنانے کی بات آپ اتنی دیر سے سنا رہے ہیں۔ یہ بتائیے آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ جو مضمون تھا وہ والدہ اور نانی مرحومہ کے متعلق تھا۔"

"اجی اس میں آغاز ہی آپ کی تصویر سے کیا گیا تھا۔ ابھی معلوم ہوتا تھا کہ مزید اقساط اس سلسلے کی آئیں گی۔" مرزا صاحب نے انہیں یوں سراسیمگی کی حالت میں دیکھ کر کچھ محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "صاحبزادے سے پڑھوایا تھا وہ مضمون میں نے' اس میں غالباً یہی درج تھا کہ یہ مضمون ایک تاریخ ساز فنکار گھرانے کی فن کی خدمت کے اعتراف کے طور پر لکھا جا رہا ہے۔ یہ گھرانا وضعدار اور شہرت کی ہوس سے بے نیاز ہے اسی وجہ سے اس کو وہ نام نہاد سکا جو اس کا حق تھا۔"

"ایں....." اب تو پھول اور سوئی دھاگہ مہ پارہ بیگم کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گئے۔

"یہ کون سا رسالہ تھا مرزا صاحب آپ کہاں کی سنا رہے ہیں۔ ایسے کسی مضمون کی مجھے تو کچھ خبر نہیں وہ کون لوگ ہیں جو سوئی کلاجگر ہے ہیں۔"

"بھلا سا نام تھا میں نے صاحبزدے سے ڈائری پر درج بھی کروایا تھا۔ ساتھ لانا بھول گیا گو یہ رسالہ میں نے یہاں عام تو دیکھا نہیں مگر جہاز والوں کے پاس موجود تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فن اور ادب کو جاننے والے لوگ اس کو شائع کر رہے ہیں۔"

"خاک جاننے والے ہوں گے۔" مہ پارہ بیگم اس انکشاف کے شاک سے اب تک نکلی ہی نہیں تھیں۔ "بغیر اجازت لیے کسی کے خاندان اور کام پر مضمون چھاپ دینا کہاں کی آشنائی ہے فن اور ادب سے۔"

"ارے مہ پارہ بیگم۔" مرزا صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ "آپ نہیں جانتیں کہ فنکار' شاعر اور ادیب عوامی اثاثہ ہوتے ہیں ان پر کچھ لکھنے یا بات کرنے کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"عوامی اثاثہ یا قومی اثاثہ۔" مہ پارہ بیگم کے لہجے میں عجیب سی چبھن تھی۔

"جو بھی سمجھ لیں' ابھی آپ خود اس بات کی شاہد ہیں کہ اب تک جتنے فنکار اس سرزمین پر پیدا ہوئے ان کے فن پر لکھنے کے لیے کسی صحافی نے پیشگی اجازت کبھی نہیں لی۔"

"مگر وہ فنکار جنہیں انہی آزاد صحافت کے علمبرداروں نے داڑھ گیلی کرنے کی غرض کی نظر کر دیا۔ جن کے فن کی بے حرمتی کرنے کے واسطے انہیں ان سے منہ موڑے رکھنے کی ترغیب دی گئی اور جن کے فن کی تاریخ' تعریف اور توصیف سب ہی وقت کی گرد میں اٹ کر بے نام و نشان ہو گئی ان کے بارے میں لکھنے کا خیال کس کو آیا اور کیوں آیا۔" مہ پارہ بیگم کو یہ خبر یقیناً ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔

"یہ نئی نسل بڑی انوکھی ہے مہ پارہ بیگم جی! یہ وقت کی گرد جھاڑنے اور ہیرے کھنگالنے کا ہنر جانتی ہے' یہ بے قدرے لوگ نہیں ہیں۔ انہیں بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ کون کس کا اور کتنے کا مستحق ہے۔ اب ذرائع ابلاغ کے میدان میں حکومت وقت کے لوگوں سے زیادہ یہ پڑھے لکھے نوجوان موجود ہیں۔ جنہوں نے اس میدان میں بے شمار ڈگریاں لے رکھی ہیں' یہ پیشہ ورانہ مہارت رکھتے ہیں' الفاظ و بیان پر قدرت رکھتے ہیں اور ہر چیز کو درست زاویے سے جانچنے اور

پرکھنے کی صلاحیت کے مالک ہیں۔''

''لیکن اگر میں ہی نہ چاہوں کہ وقت کی گرد جھاڑی جائے' میں ہی نہ چاہوں کہ میں کوئلہ ہوں یا ہیرا ہوں مجھے کھنگالا جائے تو پھر یہ لوگ کون ہوتے ہیں مجھ پر اور میرے خاندان کے فن پر روشنیاں ڈالنے والے۔'' مہ پارہ بیگم نے تنتنا کر کہا۔

''معاف کیجیے گا مہ پارہ بیگم۔'' مرزا صاحب نے عینک کے شیشوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا،

''آپ کو خفا ہونے کا حق نہیں ہے۔ آپ کی نانی جان مرحومہ نے گائیکی کے شعبے میں قدم رکھا' آپ کی والدہ مرحومہ نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا اور پھر آپ بھی اسی میدان کی کھلاڑی رہیں۔ جب میدان میں آجائیں گی تو خبریں بھی بنیں گی اور تصاویر بھی شائع ہوں گی۔ آپ ہی کہیے کہ کیا آپ کی نانی جان مرحومہ اور والدہ مرحومہ کے ریکارڈز کے کورز پر ان کی تصاویر نہیں چھپتی تھیں اور جب آپ خود میوزک کانفرنسز اور محافل موسیقی میں شرکت کیا کرتی تھیں تو کیا آپ کی تصاویر نہیں بنتی تھیں۔ یہ پردہ نشینی تو آپ کو 70ء کے آخری عشرے سے ہے، ورنہ اس سے پہلے تو آپ کو ایسے مضامین پر اعتراض نہیں ہوتا تھا۔''

''آپ خوب جانتے ہیں مرزا صاحب کہ یہ گوشہ نشینی مجھ پر کیوں آئی۔'' مہ پارہ بیگم شکست خوردہ انداز میں بولیں۔ ''اس میدان کے کتنے ایسے ایوارڈز تھے جوان لوگوں کو دے دیے گئے جن کا فن محض چار دن زندہ رہ سکا پھر صدارتی ایوارڈ اور پرائڈ آف پرفارمنس دیے جانے کا سلسلے شروع کیے جانے سے روکے گئے یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ ایوان صدر میں بپا ہونے والی اس محفل موسیقی کا احوال تو آپ ضرور ہی جانتے ہوں گے جس میں شرکت کا دعوت نامہ بھجوائے جانے کے بعد میرا ٹکٹ کینسل کروا دیا گیا خدا بخشے استاد سلطان خان صاحب کو کہا کرتے تھے۔

''مہ پارہ بیٹی ان ہتھکنڈوں کو دل سے نہ لگائیو' تمہاری لگن فن سے ہے سچا فنکار صلہ کی تمنا نہیں کرتا نہ ہی اسے ستائش سے کوئی غرض ہوتی ہے وہ تو صرف اپنا من راضی رکھنے کے لیے فن کی خدمت کرتا ہے۔ جانے دو ان لوگوں کو بڑے لوگوں کی محفل میں تمغے جیتنے کی دوڑ میں شامل ہونے کیے لیے تم اپنے من کو راضی رکھنے کا سامان کرتی جاؤ۔

''ایسی پلے سے باندھی استاد صاحب مرحوم کی یہ بات کہ دنیا داری کی لگن چھوڑ ہی دی اور آپ کو کیسے بھول سکتا ہے مرزا صاحب کہ اس واقعے کے بعد سے اب تک میں نے خبروں میں

آنے اور تصویریں چھپوانے سے کیسا کنارہ کیا۔ اب تو خیر بھول ہی گیا ہے کہ ہم کس چیز کے مستحق تھے اور ہمارے مواقع ہم سے چھین کر کس کس کو دے دیے گئے' نہیں مرزا صاحب۔'' انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ہرگز نہیں چاہوں گی کہ اس گرد کو اب کوئی جھاڑے اور عظیم فنکار گھرانے کا ورد کیا جائے۔ نہ گھرانا رہا نہ گھرانے کے جھومر تاج' سب خاک میں مل کر خاک ہوئے۔ ایک میں اس خاک کو کرید کر ماضی کی یاد میں گم نہیں ہونا چاہتی اب مجھے نہ شہرت کی طلب ہے نہ ہی اپنی عظمت کے اعتراف نامے شائع کروانے کی۔''

''جو بھی کہیں بیگم صاحبہ' یہ نسل منچلی ہے جو دل میں آئے کرتی ہے' منع کرنا چاہتی ہیں تو کسی سے معلوم کر کے منع کروا دیجیے آپ پر کچھ نہ لکھا جائے شاید یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔'' مرزا صاحب ان کی بات سے کچھ کچھ متاثر نظر آ رہے تھے سوسوچتے ہوئے بولے۔

''ہوں۔'' مہ پارہ بیگم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''آپ ایک مہربانی فرمائیے' اپنے صاحبزادے سے جریدے اور مضمون نگار کا نام معلوم کروا دیجیے۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

''جیسے آپ فرمائیں۔'' مرزا صاحب نے اپنی چھڑی پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ویسے یہ بات ذہن میں رکھیے گا' کبھی موقع ملے تو دبئی کی سیر ضرور کیجیے گا' میرا تو مشورہ ہے کہ دیزے کے لیے درخواست دے دیجیے۔''

''سوچیں گے مرزا صاحب اس بات پر بھی فی الحال تو میرے دل کو الجھن محسوس ہو رہی ہے یہ جو نیا قصہ آپ نے آن سنایا ہے۔''

''ایک مرتبہ پھر عرض کروں آپ ناحق ہی الجھ رہی ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ اچھا ہے کہ آپ کے گھرانے کے متعلق لکھا جائے اور آج کل کے قارئین کو معلوم ہو کہ فن گلوکاری پر صرف گنے چنے لوگوں کا ہی راج نہیں تھا' اس میں ایسے بھی لوگ موجود رہے ہیں جو نفع نقصان کے چکر میں پڑے بغیر اپنے فن اور ہنر سے لوگوں کو وہ سناتے رہے جو سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔'' مرزا صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مہ پارہ بیگم نے ان کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ نشست گاہ سے مرزا صاحب خود ہی باہر نکلے۔ ان کو باہر نکلتے دیکھ کر بھاگ بھری اور اختری خود ہی بھاگتی ہوئی ان کی طرف آئیں اور انہیں بیرونی دروازے تک چھوڑنے چلیں۔ فتح خان نے دروازے سے باہر نکل کر ان کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور ان کے رخصت ہونے تک وہیں کھڑا رہا۔ یہ مہ پارہ بیگم کے ہاں کا دستور تھا گو آج مالکن کی جانب سے

خصوصی احکامات جاری نہیں ہوئے تھے مگر وہ سب اپنے فرائض جانتے تھے۔ فتح خان کچھ دیر باہر کھڑا مرزا صاحب کی گاڑی کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا اور پھر واپس حویلی کے اندر داخل ہوا۔ اسے مہ پارہ بیگم صحن میں بیٹھی نظر آئیں۔ اس پر نظر پڑتے ہی انہوں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔

''حکم سرکار۔'' فتح خان نے کندھے پر دھرا کپڑا چہرے پر پھیر کر واپس اسے کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاحب نے صبح کہاں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔'' مہ پارہ بیگم نے ٹھہرے ہوئے مضبوط لہجے میں پوچھا۔

''اسلام آباد جانے کا فرما رہے تھے۔'' فتح خان نے مختصر جواب دیا۔

''اس کا احوال دریافت کرنے نہیں گئے اس بار؟''

''ڈاکٹر صاحب سے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ وہیں سے معلوم ہو گیا تھا کہ کیا صورت حال ہے۔''

''فتح خان بیٹھ جاؤ۔'' مہ پارہ بیگم نے حکمیہ لہجے میں کہا، فتح خان ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کہانی تاریک رخ اختیار کر رہی ہے فتح خان تم جانو دولت اور آسائش کی کبھی خواہشمند نہیں رہی لیکن وہ جو ایک عہد نامہ تھا۔ صورت حال اس کے مطابق تو ہرگز نہیں ہے۔''

''وہ کوشش تو کر رہے ہیں جی اتنا مجھے علم ہے۔'' فتح خان نے اپنے تئیں ایک معقول جواب دینے کی کوشش کی۔

''تمہارے والد نے اتنے برس میرے اور مہرو خالہ مرحومہ کے ساتھ سنگت کرتے گزارے جتنی تمہاری عمر اب ہے۔ مرحوم عمر بھر مجھے گھر بسا لینے کا مشورہ دیتے رہے' چوہدری صاحب کے ساتھ معاملات طے کرنے میں وہ خود اور استاد غریب سلطان پیش پیش رہے۔ غریب سلطان کے حواس ساتھ چھوڑ رہے ہیں اور کالے خان مرحوم دنیا سے چلے گئے۔ اب سوچتی ہوں کہ جب معاملات کے گواہ ہی نہ رہے تو پھر کس بات کو جتلایا جائے۔''

''آپ ڈاکٹر صاحب سے خود دریافت کر لیں جی۔ کیا معلوم آپ کی تسلی ممکن ہو جائے۔''

فتح خان نے سر جھکا کر مودب لہجے میں ایک اور مشورہ دیا۔

''ڈاکٹر صاحب اپنے پیشے کے تقدس کے بے حد لحاظ کرتے ہیں' مختصر بات کرتے ہیں میں

براہ راست اپنے تعلق کو ثابت بھی تو نہیں کر سکتی۔'' مہ پارہ بیگم کے لہجے میں دکھ واضح تھا۔ اس بات کا جواب فتح خان کے پاس نہیں تھا وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''تمہاری بی بی اب کیسی ہے' حبیب خان تمہیں اسپتال لے جائے گا شام کو اچھی طرح معائنہ کرانا پروین کا۔'' مہ پارہ بیگم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ فتح خان نے سر ہلا دیا۔

.....

سمعیہ سلطانہ کے لیے مہ پارہ بیگم کے پاس جانا دو مختلف احساسات کا حامل رہا تھا۔ مہ پارہ بیگم کا سخت لہجہ اور صاف گوئی اس کے لیے خفت کا باعث بنی تھی لیکن وہاں موجود ٹی وی ڈراما بنانے والے شخص نے اسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا اب تک وہ ایک سیدھی سادی زندگی گزار رہی تھی اور کسی نے ابھی تک اسے اس کی شکل صورت کے بارے میں الو کی بات نہیں سنائی تھی مگر اب وہ کتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی اپنے چہرے کو دیکھتی رہتی وہ چہرہ جو اس شخص کے بقول فوٹو جینک تھا جس میں کشش تھی اور جو ویسا تھا جس کی انہیں تلاش تھی۔ سمعیہ عمر کے جس دور میں تھی اور جس قسم کا پختہ ذہن اس نے پایا تھا۔ اس کے لیے اس سے بڑی بات کوئی دوسری ہو نہیں سکتی تھی۔ اب وہ دن رات اس فکر میں گزار رہی تھی کہ اس شخص کی آفر کو قبول کر کے اپنے لیے ایک نیا جہان دریافت کر لینے کے کام کا آغاز کہاں سے کرے۔ اپنے والدین اور بھائی اسے اپنے راستے کی اونچی اونچی دیواریں نظر آ رہے تھے۔ وہ الفاظ کا ذخیرہ جمع کرنے میں مصروف رہتی جنہیں استعمال کر کے اسے سب سے پہلے اپنی امی کو شیشے میں اتارنا تھا اور پھر اس کا خیال تھا کہ باقی کی دیواریں ڈھانے میں وہی اس کا سب سے بڑا سہارا ثابت ہوں گی۔ اس کی دوست رباب جو اس روز اس کے ساتھ تھی اس نے اس آفر والی بات کو بار بار دہرا کر اس کی خوشی کو شوق کی شکل دے دی تھی اور اب تو اس کے شوق کو ہوا ملنے لگی تھی۔

''تم یونہی سوچتی رہ جاؤ گی اور جس ڈرامے کے لیے انہیں نئی لڑکی کی تلاش تھی اس کی شوٹنگ شروع بھی ہو جائے گی۔'' رباب اس کو ڈراتی بھی رہتی تھی۔

''وہ تمہاری میڈم تو کہہ رہی تھیں کہ سب شکاری ہوتے ہیں دانہ ڈال کر شکار پکڑنے والے۔'' سمعیہ اپنا خدشہ ظاہر کرتی۔

اتنی ہی دنیا ترنوالہ بن گئی ہے ان کے لیے۔'' رباب مسکرا کر کہتی۔ ''یہ وقت اور ہے سمعیہ سلطانہ' اس قسم کے شکاری تو اب منہ چھپا کر گھروں میں بیٹھ چکے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں سیکڑوں

کے حساب سے لڑکیاں اس فیلڈ میں آ رہی ہیں۔ اب میڈیا کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے اور آ گاہی بڑھ چکی ہے اب اتنا آسان نہیں رہا لوگوں کا خصوصاً لڑکیوں کا شکار۔'' سمعیہ کے دل کو مزید اعتماد عطا ہوتا۔

''مگر امی ابو اور بھائیوں کا کیا کروں' اب یہ میڈم کے گھر جانے کا کام تو ہے نہیں کہ نہیں بتایا تو گزارہ ہو جائے گا' یہ تو ایسی بات ہے کہ پہلے سے اجازت لیے بغیر میں اس پر عمل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''افوہ' تم ایک مرتبہ نواز صاحب کے پاس چلو تو سہی' سنو تو سہی وہ کہتے کیا ہیں ان سب لوگوں سے اجازت والا مرحلہ تو بعد میں آئے گا۔''

''بابا مجھے ڈر لگتا ہے' کم از کم امی کو تو معلوم ہونا چاہیے۔'' سمعیہ چشم تصور میں ہی اپنے گھر والوں کا ردعمل دیکھ کر ڈر گئی۔

''اچھا..... پھر آرام سے گھر بیٹھو۔'' رباب غصے سے کہتی' ''مگر یاد رکھو اچھے مواقع بار بار نہیں ملتے اور جو لوگ موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ ہمیشہ خسارے میں ہی رہتے ہیں۔ یہ تم ہو جو یوں حیص بیص میں پڑی ہو۔ مجھے ایسی آفر ہوتی تو تم دیکھتیں میں کیسے اڑ کر وہاں پہنچ گئی ہوتی۔ وہ لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جو جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں لوگوں کے پاس جا کر اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے تمہیں بیٹھے بٹھائے موقع مل رہا ہے تو تم امی جان' ابو جان کو روری ہو۔'' رباب کی باتیں سمعیہ کے اندر ایک نیا احساس جگا جاتیں اور اس کا ارادہ پختہ ہوتا گیا کہ اسے اس موقع سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے۔ ایک دن ہمت کر کے اس نے اپنی امی سے یہ بات کر ہی دی۔ اس کی بات سن کر امی جو تھوڑی دیر پہلے ہی بازار سے لوٹی تھیں کے ہاتھ پکڑا شاپر نیچے گر گیا۔ رنگ برنگے فینسی بٹن' نکلیاں' فیتے' زپ اور دھاگے ادھر ادھر بکھر گئے۔

''تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا سمعیہ سلطانہ۔'' امی شاک کے عالم میں کہہ رہی تھیں۔

''مجھے اتنی بڑی آفر ہوئی ہے جسے آپ دماغ کی خرابی قرار دے رہی ہیں۔'' ان کے ردعمل جو کہ متوقع تھا پر سمعیہ جان بوجھ کر تنک کر بولی۔

''اتنی آزادی تجھے اس لیے دی تھی تیرے بھائیوں نے کہ تو ایسی جگہوں پر جانے لگے۔''

''ابھی گئی کہاں ہوں اور بات آزادی کی ہوتی تو یوں مجھے آپ سے پوچھنا نہ پڑتا۔''

''تجھے پتا ہے ٹی وی پر کام کرنے والی لڑکیوں کو بے حیا کہتے ہیں' وہ آوارہ اور بے راہ ہوتی

ہیں۔''

''یہ آپ کا خیال ہے جو پرانا ہو چکا ہے آپ ہی کی طرح' آج کل ٹی وی پر کام کرنے والی سب لڑکیاں بڑے معزز خاندانوں اور اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور مہذب انداز میں کام کرتی ہیں۔''

''دیکھے ہیں میں نے مہذب انداز' روز دیکھتی ہوں ان کا لباس بھی ان کے حلیے بھی۔''

''آپ اسٹار پلس اور زی ٹی وی دیکھتی رہتی ہیں کبھی پاکستانی چینل دیکھے ہیں۔''

''دیکھے ہیں' سب دیکھے ہیں۔ اللہ معافی!'' امی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''تو سمعیہ سلطانہ روز بروز باؤلی ہوتی جا رہی ہے۔''

''امی ایک بات میں آپ کو بتا دوں' میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس موقع سے فائدہ ضرور اٹھاؤں گی۔ یہ نئی صدی ہے اس میں ایسے پرانے خیالات کی اہمیت نہیں رہی اب لڑکے لڑکیاں اپنے راستے خود بنا رہے ہیں اور ان کے والدین کا ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ لوگوں کی طرح بات بے بات اچھلنے اور ناراض ہونے کا زمانہ ختم ہو گیا۔ کیا آپ کو برا لگے گا کہ آپ کی بیٹی کسی میدان میں شہرت پا جائے۔ اس کا نام ہو اور لوگ اس کو جانتے ہوں۔ ہونہار اولاد پر لوگ فخر کرتے ہیں مگر آپ لوگ شرم سے کٹنے لگتے ہیں۔'' سمعیہ نے بات لمبی کرنے کے بجائے دوٹوک الفاظ میں کہی اور پھر اپنی ماں کو ششدر دیکھ کر انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے لگاوٹ سے بولی۔

''سوچیں ذرا' ناموری اور پیسا ساتھ ساتھ آئے تو کیا آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ اس روز آپ مجھے دعا دے رہی تھیں کہ اللہ میرا..... گھر' بنگلے' گاڑی والا خواب پورا کر دے اگر کسی طرح سے یہ خواب پورا ہونے کا امکان نظر آ رہا ہے تو پھر یوں مجھے کہیں کہ آپ کی دعا قبول ہو گئی۔''

''میں نے یوں دعا قبول ہونے کی خواہش تو نہیں کی تھی۔'' امی نے پریشان ہو کر کہا۔ ''سمعیہ سلطانہ میری بچی تو اپنے بھائیوں کے غضب سے واقف نہیں۔ تیرا کوئی غلط قدم انہیں گوارا نہیں ہو گا۔''

''مجھے ایک مرتبہ کوشش کر کے دیکھ لینے دیں' کونسا میں سلیکٹ ہی ہونے جا رہی ہوں۔ امی جہاں میرے اتنے شوق پورے کیے ہیں وہاں یہ ایک شوق بھی پورا کر لینے دیں۔'' سمعیہ سلطانہ نے ایک نسبتاً درمیانہ راستہ اختیار کیا۔

''تو نے پہلے کبھی میری سنی ہے جو اب سنے گی۔'' امی ہار کر بولیں۔

''زندگی صرف ایک مرتبہ ملتی ہے۔ میری بھولی ماں اگر زندگی میں ملنے والے جانسز سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو انسان خسارے میں رہ جاتا ہے۔ سمعیہ نے فلسفیانہ انداز میں کہا، اس کی امی اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

امی کو نرم پڑتے دیکھ کر سمعیہ نے اپنے خیالوں میں ہی اپنے مستقبل کا نقشہ بنانا شروع کردیا۔ وہ خود کو ٹی وی کی اسکرین پر مختلف چینلز پر' اخباروں کے صفحات پر' رسالوں کے کورز پر نمایاں ہوتے دیکھ رہی تھی۔ پیسا شہرت' بنگلا' کار اسے سب کچھ اپنی رسائی میں نظر آرہا تھا اور سب سے بڑا احساس جو اسے خوش کررہا تھا وہ حسن کمال کی نظروں میں آجانے کا تھا۔ پہلے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اس کی نظروں میں آکر اس کی زبان سے اپنی قابلیت کا اعتراف کروانے کا خواب دیکھتی تھی۔ اب اس کو یہ سب ہوجانے کے لیے شارٹ کٹ نظر آنے لگا تھا۔ حسن کمال بھی میڈیا سے وابستہ تھا۔ یوں اس کے منظر عام پر آنے سے وہ اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ یقیناً وہ اسے یوں شہرت پاتا دیکھ کر چونک جائے گا اور اگر وہ محنت کے بل بوتے پر خود کو منوانے میں کامیاب ہوگئی تو پھر وہ ضرور اس کا اعتراف کرے گا اور کہے گا۔

''سمعیہ سلطانہ میں تو تمہیں ایک عام اور معمولی سی لڑکی سمجھتا تھا لیکن تم تو بڑی گریٹ نکلیں۔''

.....

''ہوش سنبھالنے کے بعد جس شخصیت کو ہم نے اپنی ماں کی شکل میں سامنے پایا در حقیقت وہ ہماری ماں نہیں تھیں۔'' فیضان مقصود نے شازیہ کو بتایا جو اس وقت پندرہ دن کی سوچ بچار کے بعد اس سے باہر ملنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ فیضان مقصود کی شخصیت کا چارم شازیہ جیسی لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ شازیہ پر پہلی مرتبہ کسی لڑکے نے یوں توجہ دی تھی۔ اس کا زیادہ تر واسطہ بڑی عمر کے مردوں سے پڑتا تھا جو کسی نہ کسی اعصابی بیماری کے ہاتھوں ڈاکٹر صبور کے پاس آتے تھے اور جن کے پاس یوں بھی اتنا وقت نہ ہوتا تھا کہ وہ شازیہ جیسی ریسپشنسٹ پر توجہ دیتے۔ اس کے ورکنگ آورز کی کلاسز جو اس کررکھی تھیں اور صبح ساڑھے آٹھ سے دوپہر دو بجے تک ان میں مصروف رہتی تھی۔ ایسے میں اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے دوستی بڑھاتی اور اسے ایسے مواقع میسر آتے۔ اس کی رہائش بھی شہر سے دور اس ڈیری فارم والے گھر میں تھی جہاں اس کے والد سپروائزر کے طور پر کام کرتے تھے۔ ایسے حالات میں فیضان

مقصود جیسے لڑکے کا اس پر توجہ دینا اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا اس کے لیے کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ پچھلے کافی لمبے عرصے سے ایک مخصوص روٹین میں مشین کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ ایسے میں فیضان کی زندگی میں آمد اسے ہوا کا تازہ اور خوشگوار جھونکا محسوس ہوئی تھی اور اس نے کچھ سوچ بچار کے بعد دوستی کے لئے بڑھایا ہوا یہ ہاتھ نظر انداز نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی فیصلے کے نتیجے میں اس روز فیضان کے ساتھ وہ فائیو اسٹار ہوٹل کے اس خوبصورت ڈائننگ ہال میں بیٹھی تھی۔ شازیہ کے لیے یہ انوکھا اور کیف آمیز تجربہ تھا۔ کینڈل اسٹینڈ میں جلتی ہوئی موی شمعوں کی روشنی کے عکس میں یہ خوابناک ماحول اس پر عجیب سی کیفیت طاری کررہا تھا۔ فیضان نیچی آواز میں اسے اپنے متعلق بتا رہا تھا اور وہ قدرے بے دھیانی سے سن رہی تھی مگر فیضان کی اس بات نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

''بظاہر ماں جو تھی وہ میری ماں نہیں تھی' کیا مطلب ہے اس بات کا؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ وہ ہماری اصلی ماں تھیں؟'' ہماری ماں بہرحال نہیں تھی۔''

''پھر آپ کی ماں کہاں تھیں؟'' شازیہ نے مزید حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' فیضان نے ایک اور چونکا دینے والی بات کی۔ ''ہم نے آج تک ان کو نہیں دیکھا نہ ان کے متعلق کبھی معلوم ہوا کہ وہ کون تھیں اور کہاں ہیں۔''

''کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو آپ کو بتاتا' آپ کے والد.....''

''ہمارے والد سخت مزاج آدمی ہیں۔ وہ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتے نہ ہی کسی کی جرأت ہوسکتی ہے ان سے کوئی بات پوچھنے کی۔''

''کمال ہے۔'' شازیہ کے لیے یہ عجیب وغریب سی بات تھی۔ ''یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ان سے کوئی بات پوچھنے کی جرأت نہیں کرسکتا کوئی بھی۔''

''ہے تو یہ عجیب سی بات مگر ہے درست۔'' فیضان نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''وہ جو ہیں جو آپ کی آیا یا گورنس جو بھی ہیں ان کو بھی نہیں معلوم۔''

''نہیں' ان کو بھی معلوم نہیں تھا۔ ویسے وہ اب حیات نہیں ہیں۔'' فیضان کے لہجے میں دکھ تھا۔

''اور جو آپ کے عزیز رشتے دار ہیں' جو ملازم وغیرہ ہیں۔''

''ان میں سے بھی کسی کو معلوم نہیں۔ ایک ہماری پھپو ہیں اور ایک تائی اماں' تایا کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ ان کو بھی معلوم نہیں' ان کے بقول ابا پہلے مجھے اور چند سال بعد سلمان کو لے کر آئے تھے مطلب نومولود بچوں کو اور ہماری ماں کے بارے میں وہ کسی کو بھی نہیں بتاتے تھے۔ بطور ان کے جائز قانونی وارث ہم دونوں کو اپنی اولاد انہوں نے خود ڈکلیئر کیا اپنی برادری میں۔ ایک ہمارے ابا کی کزن تھیں۔ جن سے ان کا نکاح ہوا تھا۔ ابا ان میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ان کے بھائیوں نے خلع لے کر ان کا قصہ ختم کر دیا۔ اب تک ہمارے علاقے میں ابا کے متعلق بہت سی کہانیاں گھڑی جا چکی ہیں۔ مختلف شہروں میں ان کی کئی بیویوں کی موجودگی کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے مگر یہ باتیں دبے لفظوں میں ڈرتے ڈرتے ہی کی جاتی ہیں ابا کی دہشت کے سبب کوئی آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔'' شازیہ نے ساری بات سن کر فیضان کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ نارمل تھا۔ اس پر کسی قسم کا بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔

''سلمان آپ کا حقیقی بھائی ہے؟'' اس نے اسی طرح فیضان کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دلچسپ سوال ہے۔'' فیضان نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سوال بھی کافی عرصے ہم سب کے ذہنوں میں گردش کرتا رہا پھر بواجی یعنی میری پھپو نے قیافہ لگایا کہ میری اور سلمان کی شکلیں ملتی جلتی ہیں اور اتفاق سے ہماری شکلیں ابا سے نہیں ملتیں اس لیے ہم دونوں سگے بھائی ہیں۔ اس قیافے کو یقین میں ہم دونوں کو ایک سے بلڈ گروپ نے بدلا' یہ بلڈ گروپ بھی ابا کے بلڈ گروپ سے مختلف تھا۔''

''اوہ۔'' شازیہ کے ہونٹ نیم دائرے کی شکل میں سکڑے۔

''ایک سوال تم نے نہیں پوچھا۔'' فیضان نے مسکرا کر کہا۔

''وہ کیا.....؟'' شازیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ہم واقعی ابا کی جائز اولاد ہیں کسی گناہ کا نتیجہ تو نہیں۔'' اس کی اس بات پر شازیہ بری طرح گڑبڑا گئی۔ ایسی بات وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''اس کے بارے میں ابو جی اور تائی جی کوئی قیافہ نہیں لگا سکیں یا در ہے کہ ان دونوں خواتین کا کام ہی حویلی کے بڑے بڑے دالانوں کے کونوں میں چھپ کر بیٹھ کر قیافے لگانا ہے مگر اس بات سے زیادہ فرق اس لیے نہیں پڑتا کہ ابا برادری میں اور وراثت کے معاملات میں ہم دونوں کو

اپنا جائز اور قانونی وارث قرار دے چکے ہیں ایسے میں اگر گناہ ثواب کا کوئی چکر ہے تو یہ ان کا اپنا ہیڈک ہے۔ ہمارا اس میں کیا قصور ہے۔''

''یہ ساری صورت حال آپ کو پریشان نہیں کرتی۔ آپ کو اس پر جھنجلاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کو اپنی ماں کا خیال نہیں ستاتا۔ آپ کیسے برداشت کرتے ہیں اس سب کو۔'' شازیہ تقریباً چلا کر بولی۔ پھر اردگرد دیکھ کر خود ہی شرمندہ ہو گئی۔

''کتنی دیر پریشان ہوا جا سکتا ہے۔ کتنی دیر جھنجلایا جا سکتا ہے۔'' فیضان نے نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے اس سے پوچھا۔'' شازیہ زندگی کا سلسلہ لمبا ہوتا ہے۔ اتنا لمبا جتنی لمبی زندگی ہوتی ہے۔ اس کو اگر ہم کڑھنے جلنے' جھنجلانے میں صرف کر دیں تو پھر مثبت کام کب کریں گے۔ میری بواجی نے مجھے زندگی کے تمام روشن پہلو دیکھنے کی تربیت محض اس لیے دی کہ انہیں معلوم تھا کہ میری زندگی میں تاریک پہلو اتنے ہیں کہ اگر میں ان میں کھو گیا تو اندھیروں ہی میں بھٹکتا رہوں گا۔ یہ شائد انہی کی دعاؤں اور انہی کے بتائے ہوئے اصولوں کا نتیجہ ہے کہ میں نے زندگی کو پازیٹو لینا شروع کر دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید یوں تمہارے سامنے اس حیثیت میں موجود نہ ہوتا۔ جہاں تک ماں کی یاد ستانے کا تعلق ہے تو ایسا ہے کہ وہ محسوس ہی نہیں کیا' جو دیکھا ہی نہیں اس رشتے کو یاد کیا کروں۔ وہ بھی تو بچے ہوتے ہیں جن کی مائیں ان کے پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہیں۔''

''ان پر تو صبر کیا جا سکتا ہے مگر جن کے بارے میں ٹھیک سے اور یقین سے علم ہی نہ ہو وہ.....'' شازیہ اپنی محدود سطح پر سوچتے ہوئے مسلسل اس سے سوال کیے جا رہی تھی۔

''ان پر بھی صبر کیا جا سکتا ہے۔ شازیہ خود پر گزرنے والی کیفیات کا میں خود ہی واحد گواہ ہوں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں صبر کر لینا ہی بہتر ہے۔'' فیضان نے سکون سے کہا۔

''اسی قسم کے حالات کی زد میں آ کر وہ آپ کا بھائی یوں ذہنی مریض بنا ہوگا۔'' شازیہ کو اس ساری کہانی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

''تم ڈاکٹر عبدالصبور کے پاس کام کرتی ہو شازیہ اور عجیب بات ہے کہ پھر بھی سلمان کو ذہنی مریض کہہ رہی ہو جب کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے پاس آنے والوں کو مریض تو سرے سے قرار نہیں دیتے۔ نفسیات کسی کی گڑبڑ ہو جائے تو وہ مریض تو نہیں ہو جاتا اور تمہیں معلوم ہے تمہارے ڈاکٹر صاحب تو سائیکولوجسٹ ہیں۔''

''وہ اس روز جو کچھ کر رہا تھا وہ یقیناً اسی قسم کے حالات کا شکار نظر آ رہا تھا، آپ کے والد کی

شخصیت انتہائی پراسرار معلوم ہوتی ہے۔ سلمان نے ضرور انہیں کچھ ایسا کرتے دیکھا ہے جو اس کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ ویسے یہ ہیں کون آپ کے والد صاحب۔'' شازیہ نے اس کی بات کا اثر نہ لیتے ہوئے کہا،

''ان کا نام چوہدری مقصود احمد گورائیہ ہے' تم نے شاید کبھی ان کا نام سنا ہو اگر تمہیں قومی سیاست میں دلچسپی ہو تو' وہ آج کل وفاقی کابینہ میں وزیر مملکت ہیں۔''

شازیہ کی نظروں کے سامنے ایک چہرہ آیا۔ ''وہ جو پچھلی حکومت کے دور میں کسی اور سیاسی پارٹی کے ممبر تھے۔ اب کسی اور پارٹی میں ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''خیر' یہ کوالٹی تو آج کل کے اکثر سیاستدانوں میں پائی جاتی ہے' اس خوبی کے ذریعے کسی کو پہنچانا مشکل ہے۔'' فیضان مسکرایا۔

''یہ بات نہیں ہے' میں نے انہیں پہچان لیا ہے' میرے ذہن میں ان کی شکل آ گئی ہے۔'' شازیہ نے اسے اپنے ذہن میں آنے والی شکل کا حلیہ بتایا۔

''ہاں' ایگزیکٹلی' تم نے صحیح پہنچانا۔'' فیضان مسکرایا۔ ''ویسے میرا خیال تھا کہ تمہیں سیاست وغیرہ میں دلچسپی نہیں ہوگی۔''

''مجھے ہے بھی نہیں۔'' شازیہ نے ناک چڑھا کر کہا۔ ''یہ تو اتفاق ہے کہ کلینک پر بیٹھے بیٹھے چند اخبار اور رسالے جو وہاں پڑے رہتے ہیں ان پر نظر ڈالتی رہتی ہوں اور اسی وجہ سے مجھے آپ کے والد کی شکل یاد آ گئی۔''

''گڈ۔'' فیضان ہنسا اور اس کے ہنسنے پر شازیہ کو خیال آیا کہ وہ مسکراتے اور ہنستے ہوئے اور بھی اچھا لگتا تھا۔ ''اب تم اپنے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔'' فیضان کے پوچھنے پر شازیہ ڈبل مائنڈڈ ہو گئی۔ ''اس کو سچ بتاؤں یا گپ ماروں۔'' دراصل اب تک وہ اس بات کا تعین ہی نہیں کر پائی تھی کہ وہ فیضان کے ساتھ کس قسم کا تعلق استوار کرنا چاہتی تھی۔ وقتی دوستی یا دائمی دوستی کا۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ یہ تعلق دوستی خواہ ایک دن کا ہی کیوں نہ ہو وہ اسے اپنے متعلق اسی طرح سب کچھ سچ سچ بتائے گی جس طرح فیضان نے بنا اس کے پوچھے اسے اپنے متعلق سچ بتایا تھا۔ اس نے اپنا ماضی اسی شہر میں آنے کا قصہ اور ڈاکٹر عبدالصبور کے پاس کام کرنے کی ساری کہانی بلا کم و کاست سنا ڈالی۔

''کیسا اچھا بندہ تھا' وہ تمہارا کزن مرحوم جس کی بڈک کے صدقے میں تم یہاں آن پہنچیں

اور میں تم سے ملا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو میں اس اتنے بڑے شہر میں تم جیسی دوست کہاں سے پاتا۔'' فیضان نے بے ساختہ کہا۔

''خیر' یہ آپ مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں۔ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ میری سمجھ میں تو ابھی تک یہ نہیں آ رہا کہ آپ مجھ سے دوستی کیوں بڑھا رہے ہیں۔'' شازیہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بھی اچھا سوال ہے۔'' فیضان ایک مرتبہ پھر مسکرایا۔ ''شازیہ تم نہیں جانتیں کہ اپنے باپ کے بخشے ہوئے پیسے اور اسٹیٹس کی بدولت میرے تعلقات بہت وسیع..... ہیں ایک اچھی جگہ پر بڑی اچھی جاب کر رہا ہوں لیکن اتنے تعلقات اور اتنی دوستیوں کے ہوتے ہوئے بھی میرا دل چاہتا تھا کہ ایک تعلق ایک دوستی میری ایسی ہو جو جس کے ساتھ ہو اس سے میں اپنی ذاتی زندگی اور دل کی کوئی بھی بات کرنے سے پہلے جھجکوں نہیں' جس کے ساتھ میں اپنی ہر بات کھلے دل سے شیئر کر سکوں۔ میں کسی ایسے ہی انسان کی تلاش میں تھا جب تم مجھے ملیں' میں نے ان چار پانچ ملاقاتوں اور گفتگو میں جو ڈاکٹر صبور کے کلینک پر تمہارے ساتھ ہوئیں تمہیں بہت اچھی طرح جانچا اور میرے دل نے گواہی دی کہ یہ لڑکی اتنی معصوم' بے ضرر اور بے نیاز ہے کہ اس سے دوستی ایک نعمت ثابت ہو سکتی ہے۔ میرے جیسے بندے کے لیے جب ہی میں نے تمہیں فیکٹری کے لانچنگ فنکشن میں بلایا جس میں تم نہیں آئیں اور بہت اچھا ہوا کہ تم نہیں آئیں وہ تمہارے آنے کی جگہ بھی نہیں تھی وہ میری غلطی تھی کہ تمہیں وہاں بلایا۔ ہاں یہ جگہ اور یہ ماحول بہت اچھا ہے' ایک اچھی اور دیرپا دوستی کا آغاز کرنے کے لیے۔'' اس نے اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں روایتی سی بات کروں گی' ہمارے معاشرے میں لڑکی اور لڑکے کی دوستی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔'' شازیہ نے نظریں جھکا کر کہا۔

''یہ پرانی باتیں ہو چکی ہیں' اب زمانہ بدل چکا ہے' لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے پڑھتے ہیں اکٹھے جاب کرتے ہیں' اب تو اس ساری بات کا یعنی مخالف جنس کا تصور ہی ختم ہوتا جا رہا ہے۔'' فیضان نے سکون سے کہا۔

''میرا جو اپنا سیٹ اپ ہے نا اس میں ابھی بھی یہ بات مناسب نہیں سمجھی جاتی آج بھی میں اپنے گھر میں جھوٹا بہانا گھڑ کر آئی ہوں جو میرا خیال ہے کہ ایک غلط حرکت ہے اور شاید میں نے پہلی اور آخری دفعہ کی ہے۔'' شازیہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں' بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں مگر کیا کروں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں نے تم سے دوستی کی بات کرنے سے پہلے بھی کئی مرتبہ سوچا تھا' مگر ایسی باتوں پر بندے کا اختیار نہیں ہوتا میں دوستی میں فیملی بیک گراؤنڈ' سوشل اسٹیٹس اور شکل صورت دیکھنے کا قائل نہیں۔ دوست صرف اسے بنانا چاہیے جس کے لیے دل گواہی دے کہ وہ ایک اچھا دوست ثابت ہو سکتا ہے۔"

"مگر یہ میرا مسئلہ اور ہے۔ اس جاب کی حد تک اس کی ضروریات کی حد تک تو میرے والدین سمجھتے ہیں کہ میں جو کرتی ہوں ٹھیک کرتی ہوں اس کے علاوہ میرا اٹھنا بیٹھنا ملنا ملانا کس کے ساتھ ہے وہ یقیناً اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے۔" شازیہ نے بے بسی سے کہا۔

"اچھا' یہ بتاؤ تمہارا دل کیا کہتا ہے۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ "تمہیں اچھا نہیں لگا یہاں یوں میرے ساتھ آنا' مجھ سے باتیں کرنا۔"

"مجھے اچھا لگا ہے' میں اس سے انکار نہیں کروں گی مگر میں نے اپنا مسئلہ آپ کو صاف صاف بتا دیا ہے اور اپنے والدین کے اصولوں سے انحراف میرے لیے ممکن نہیں۔" شازیہ نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"چلو پھر ٹھیک ہے' میں چند دن تم سے رابطہ نہیں کروں گا اگر تمہارا دل مجھ سے بات کرنے کو چاہے تو مجھے مسڈ کال کرنا میں ضرور تم سے رابطہ کروں گا۔" فیضان نے ایک دم اٹھتے ہوئے کہا۔ شازیہ کا دل دھڑکا' اتنے خوبصورت آغاز کا اتنا فوری اور منطقی انجام۔" اس نے سوچا اور پھر اپنا بیگ پکڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" پارکنگ لاٹ میں آ کر فیضان نے کہا۔ شازیہ نے بغیر سوچے سر ہلایا اور اس کے ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ یہ گاڑی نئی' کشادہ اور آرام دہ تھی۔ شازیہ کو اس کا ڈیش بورڈ بہت اچھا لگا تھا۔ گاڑی میں ائیر فریشنر کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی۔ شازیہ کو یہ سفر اچھا لگ رہا تھا۔ فیضان اسے اپنے بزنس اور جاب کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اسے لاہور میں اپنی رہائش گاہ کا پتا بھی سمجھا رہا تھا' مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس وقت کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔ وہ لمحے مختصر تھے۔ وہ ان کو اپنے ذہن و دل میں جاگزیں کرنا چاہتی تھی۔

.......✽.......

"یہ حسن کمال ہے' بیگم صاحبہ۔ بجائے نام پتے کے میں مجرم کو سراپا آپ کے سامنے لے آیا

ہوں۔ فرمائیے' اس کے لیے کیا حکم ہے۔" مرزا صاحب نے اپنے ساتھ آنے والے نوجوان کو بازو سے پکڑ کر آگے کرتے ہوئے کہا۔ مہ پارہ بیگم ریاض میں مشغول تھیں۔ یہ بے وقت کی آمد انہیں پسند نہیں آئی تھی لیکن اس نوجوان کے متعلق مرزا صاحب کے انکشافات نے انہیں چونکا دیا تھا۔ "مجرم کیسا؟" انہوں نے سوچا۔

"میں نے تو اس رسالے اور مضمون نگار کے متعلق تفتیش میں مصروف تھا کہ اچانک معلوم ہوا کہ رسالہ بھی اس کا اور مضمون بھی تقریباً...... یہ حسن کمال ہے تو اس کو بلا کر بنا بتائے آپ کی خدمت میں بے وقت حاضر ہو گیا۔" مرزا صاحب نے وضاحت کی۔

"اوہ!" مہ پارہ بیگم کی سمجھ میں آ گیا وہ نوجوان کون ہو سکتا تھا۔ "تشریف رکھیے۔" یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس لڑکے کے ایڈونچر نے انہیں ذہنی کوفت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انہوں نے وضعداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ نوجوان نے انتہائی سلیقے اور احترام سے انہیں آداب کہا۔

"جیتے رہو۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔ ملازماؤں کو تواضع کا اہتمام کرنے کا کہنے کے بعد وہ دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"جی فرمائیے مرزا صاحب' کیا معلوم ہوا اور کیونکہ معلوم ہوا۔" انہوں نے پان کے پتے پر چونا اور کتھا لگاتے ہوئے کہا۔ "کیا ٹرو سیٹنگ ہے یار۔" حسن کمال نے اس فرشی نشست پر بیٹھتے ہوئے ان خاتون کو پان لگاتے دیکھ کر سوچا۔

"یہی صاحبزادے ہیں جناب جنہوں نے آپ کے خاندان پر قلم اٹھانے کی جرأت فرمائی تھی۔" مرزا صاحب نے وضاحت کی۔

"معافی چاہتا ہوں۔" حسن کمال نے گلا کھنکھار کر بات شروع کی۔ "مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ مضمون آپ کے لیے دل آزاری کا سبب بنے گا۔"

"خیر' میں نے ذاتی طور پر تو نہ وہ جریدہ دیکھا نہ ہی وہ مضمون پڑھا۔" مہ پارہ بیگم نے چھالیہ چباتے ہوئے کہا۔ "لیکن میاں' یہ بات میں تمہیں کہہ دوں کہ قلم کی آزادی اپنی جگہ قلم اٹھانے سے پہلے جن پر اٹھانے کا ارادہ کرتے ہو ان کی حرمت اور عزت نفس کا خیال رکھنا بہرحال ایک صحافی' ایک قلم کار کا اولین فرض ہونا چاہیے۔"

"آپ شرمندہ کر رہی ہیں بیگم صاحبہ۔" حسن کمال نے سر جھکا کر کہا۔ "دراصل یہ جرأت ہمیں اس لیے ہوئی ہے کہ ہم چاہتے تھے کہ وہ لوگ جو اسی تحسین اور قدر کے مستحق تھے جو ان کے ہم

عصروں کا مقدر ٹھہری انہیں ان کا حق ملنا چاہیے اور فن کی خدمت کے حوالے سے ان کی کوششوں سے آج بات ختم کرتے کرتے اس نے اون لکر کا شارہ ان کے سامنے رکھا پھر وہ صفحہ بھی نکالا جس پر ان کی والدہ اور نانی جان کی وہ تصویریں چھپی ہوئی تھیں جو غالباً اب صرف ان کے خاندانی البم کا حصہ تھیں کسی اور شخص کے پاس وہ کیسے پہنچیں یہ وہ سمجھ نہیں پائی تھیں۔

''یہ تصاویر تمہیں کہاں سے ملیں؟'' انہوں نے بے اختیار پوچھا۔

''آپ ہی کے ایک ایسے قدرداں سے جس قسم کے قدردان اب تقریباً ناپید ہو چکے ہیں۔'' حسن نے بتایا۔

''خوب!'' مہ پارہ بیگم نے صفحہ پلٹتے ہوئے کہا اگلے صفحے پر خود ان کی بیس بائیس سال پرانی تصویر موجود تھی۔ ''ان قدرداں صاحب نے یہ تصاویر اب تک سنبھال کر رکھی ہیں' عجیب بات ہے۔''

''لوگوں کو مختلف قسم کے شوق ہوتے ہیں' نادر کتب جمع کرنے کا' نادر ٹکٹ جمع کرنے کا' ویو کارڈز اور تصاویر جمع کرنے کا' یہ صاحب بھی ایسے ہی شوقین مزاج حضرت ہیں ان کو پرانے ریکارڈز جمع کرنے کا شوق تھا۔ یہ تصاویر ریکارڈز کے کورز سے لی گئی ہیں۔ ان کی ری پروڈکشن کا کام ہمارے ایک ماہر فوٹو گرافر اور کمپیوٹر آپریٹر نے کیا ہے۔ لیکن اگر آپ اس مضمون کو جرأت اور گستاخی پر معمور کرتی ہیں تو میں ایک مرتبہ پھر معافی کا خواستگار ہوں۔'' حسن کمال کو ماحول کے مطابق گفتگو کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔

''لگتا ہے مضمون کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر نرم پڑ رہی ہیں۔'' مہ پارہ بیگم کو مضمون پڑھنے میں مگن دیکھ کر مرزا صاحب نے حسن کمال کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ خاموش بیٹھا مہ پارہ بیگم کے چہرے کے تاثرات پڑھنے میں مگن تھا۔

''میں نے مرزا صاحب سے عرض کی تھی کہ میں کسی بھی زمانے میں شہرت اور ناموری کی خواہش مند نہیں رہی ہوں۔ اگر ایسا ہی ہم چاہتے ہوتے تو کیا مشکل تھا لوگوں کی نظروں میں' میڈیا کی نظروں میں آتا' مگر ہمیں ایسی ناموری کبھی بھائی ہی نہیں۔ ہم سستی شہرت اور ناموری کے لیے نکّے نکّے کے بندوں کی جوتیاں سیدھی نہیں کر سکتے تھے نہ ہی ہم نے کیں۔''

''آپ درست فرماتی ہیں۔'' حسن کمال نے انتہائی مودب لہجے میں کہا۔ ''لیکن یقین جانیے کہ یہ آرٹیکل' یہ ریسرچ یہ بھاگ دوڑ نہ تو آپ کو کسی قسم کی شہرت دلانے کے لیے تھی نہ ہی کسی

قسم کی بلیک میلنگ کے لیے' یہ محض اعتراف کی ایک کوشش تھی آپ کے فن کی' عظمت کی' آپ کی فیملی کی اس فن کے میدان کی خدمت کی۔ میں اور میرے ساتھی ہم آپ کو تحفے دلوانے کی پوزیشن میں نہیں' مگر ہم آپ جیسی ہستی کو پس منظر سے پیش منظر میں لانے کی کوشش کر سکتے تھے' ہم تو اپنے قارئین کو بھی یہ باور کرانا چاہتے تھے۔ کہ دیکھو کہ یہ وہ عظیم لوگ ہیں جن کا فن سلیوٹ کیے جانے کے قابل تھا مگر..... اگر کسی نے نہیں کیا تو انہوں نے پرواہ نہیں کی۔ ہماری اس کوشش میں کوئی خاص مقصد' کوئی لالچ نہیں تھا۔''

''ہوں'' مہ پارہ بیگم نے سنہری زنجیر سے جڑی عینک آنکھوں سے اتار کر گلے میں لٹکاتے ہوئے کہا ''معلوم ہوتا ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو' مگر میاں شاید تم نہیں جانتے کہ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ اب میں اور میرا خاندان یوں اخبار و رسائل میں شائع ہوتے اب ہم خاک رسیدہ لوگوں کے متعلق جان کر عوام کریں گے بھی کیا' اب تو ویسے بھی نت نئے' رنگ برنگے لوگ اس فیلڈ میں آ چکے ہیں لوگ ان کو سنتے ہیں اور پسند بھی کرتے ہیں' کلاسیکل موسیقی ویسے بھی دم توڑ رہی ہے اب تو لوگ اس صنف موسیقی کو سننا سزا ہی سمجھتے ہیں۔''

یہ بھی خوب بات کی آپ نے۔'' حسن مسکرا کر بولا۔ ''آپ نے آج کل ٹرینڈ دیکھا ہے' پرانے ہیروز پر' پرانی تاریخ پر' لیجنڈ پر ڈرامے اور فلمیں بنانے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ بڑے بھاری بجٹ کے ڈرامے بنتے ہیں مغلیہ دور کی شخصیتوں کی زندگیوں پر۔ کیوں ہو رہا ہے ایسا.....؟'' اس نے سوالیہ انداز میں مہ پارہ بیگم کی طرف دیکھا۔ ''اس لیے کہ لوگ اب جدید دور کے موضوعات کی یکسانیت سے تنگ آ رہے ہیں۔ اس نئی نسل کو ہر وقت کچھ نیا' کچھ انوکھا چاہیے ہوتا ہے۔ اس لیے وقت کی گرد جھاڑ جھاڑ کر پرانی چیزوں کو نئے انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اور میرے خیال میں یہ کچھ ایسا برا بھی نہیں۔ یہ نئی نسل کسی ڈھنگ میں سہی اپنی تاریخ سے تھوڑی بہت واقفیت تو حاصل کر ہی رہی ہے نا۔''

''مگر ہم' میرا مطلب ہے میں اور میری والدہ نانی مرحومہ.....'' مہ پارہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

''وہ میں بتاتا ہوں۔'' حسن نے ان کی بات کاٹی۔ ''دیکھیے میڈم' جو انداز موسیقی آپ لوگوں نے اپنایا اور جو صرف آپ کے خاندان تک محدود ہے' غزل کی گائیکی کو جو آہنگ آپ نے دیا اس سے لوگوں کو روشناس کرانا ضروری ہے۔ لوگ اس فن میں چند محدود لوگوں کا نام ہی کیوں

لیتے رہیں' آپ کو کیوں نہیں' آپ کا نام کیوں لوگوں کو معلوم نہ ہو۔ ایسا نہ کر کے آپ اپنے ساتھ تو یقیناً نہیں لیکن ہم لوگوں کے ساتھ یقیناً زیادتی کر رہی ہیں۔''

''بات غلط نہیں ہے بیگم صاحبہ اگر آپ غور کریں تو.....'' مرزا صاحب نے پہلی مرتبہ اس ساری بات میں دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

''آپ تو بہت اچھی طرح جانتے ہیں مرزا صاحب کہ ہمارے چند اپنے اصول ہیں وضعداری کا جو معیار ہے اس پر عمر بھر سمجھوتا ہم نے نہیں کیا۔ اب ایسے مضامین کی اشاعت پر ہمارے ہی کئی ہم عصر نہ جانے کس کس قسم کی باتیں بنائیں گے۔ کوئی کہیں سے جواباً کچھ کہے گا' اس میں لکھی باتوں کو جھٹلائیں گے اور ان کے برخلاف نئی نئی باتیں لائیں گے۔'' مہ پارہ بیگم نے اپنی ہچکچاہٹ کی وجہ بتائی۔

''آپ یوں ہی فکر مند اور متامل ہو رہی ہیں میڈم' لوگوں نے اس مضمون کو پڑھا ہے اور ہمیں اس کی فیڈ بیک بھی ملی ہے۔ لوگوں نے اس کو پسند کیا ہے اور اکثر نے بتایا ہے کہ وہ اس کی اگلی قسط کا انتظار کر رہے ہیں۔'' حسن نے کہا۔

''ایک دو مزید مضامین میں یہ تعارف یا اعتراف جو بھی ہے مکمل ہو جائے گا' اس دور کے لوگوں کے سامنے آپ کا نام اور مقام آ جائے گا اور امر ہو جائے گا' اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔'' مرزا صاحب نے کہا۔

''ایک شرط ہے پھر اس سلسلے میں.....'' مہ پارہ بیگم نے کہا۔ حسن اور مرزا صاحب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔ کسی طور سہی وہ رضامند ہوتی نظر آ رہی تھیں۔

''جو بھی شائع کرنے کا ارادہ ہو گا وہ مجھے پہلے سے دکھایا جائے گا۔''

''یقیناً' ضرور..... بلکہ آپ سے مکمل راہنمائی لی جائے گی۔ ہم تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ آپ ہمیں بتائیں اور ہم لکھیں۔'' حسن کمال نے انتہائی ادب سے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر'' مہ پارہ بیگم نے گہرا سانس لے کر اون لکر کا شارہ بند کر دیا جس کے سرورق کے ایک کونے میں ان کی والدہ کی تصویر چمک رہی تھی۔

.....

''آپ کتنی دیر میں فارغ ہو جائیں گی جی' میں دوبارہ آپ کو لے جاؤں گا۔'' حسن کمال نے اپنی ممانی کو ان کی والدہ کے گھر پر موٹر سائیکل سے اتارتے ہوئے کہا۔ آج ان کی انتہائی

عاجزانہ انداز میں درخواست پر وہ انہیں یہاں چھوڑنے چلا آیا تھا۔

''تم بس پندرہ منٹ بیٹھو میں نے ابھی واپس جانا ہے۔'' انہیں معلوم تھا اب کا گیا وہ کب واپس آئے گا اور جائے آئے بھی کہ نہیں۔

''آپ کو دیر ہو جائے گی' میں نے کہا نا کہ میں آپ کو دوبارہ لینے آ جاؤں گا۔'' حسن نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ ''تم آؤ میرے ساتھ دیکھنا ہم نے یوں فارغ ہوتی ہوں۔ ممانی کا بالکل بھی موڈ نہیں تھا دیکھوں اور بسوں میں دھکے کھانے کا۔ مجبوراً حسن کو رکنا پڑا۔ وہ اپنی موٹر سائیکل کے بارے بھی کانشس تھا جو اس نے حال ہی میں قسطوں پر خریدی تھی اور جسے وہ رات کو اپنی رہائش گاہ کی ڈیوڑھی میں کھڑے کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ ممانی کا محلہ تو یوں بھی ایسا تھا کہ گلی میں کھیلتے بچوں سے بھی اسے ڈر لگ رہا تھا۔

''آ جاؤ' آ جاؤ'' ممانی کہتے ہوئے گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ اس نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور مجبوری سے قدم اٹھا ان کے پیچھے چل دیا۔ ممانی اس کے اندر داخل ہونے تک صحن میں کھڑی اپنی والدہ سے کچھ کہہ چکی تھیں۔ وہ آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرنے لگیں اور اسے لے کر گھر کے یقیناً سب سے بڑے اور سجے سجائے کمرے کی طرف چل دیں۔ یہ کمرا بیٹھک اور ڈرائنگ روم کی درمیانی شکل تھا اور متوسط طبقے کی ان خواتین کی خوش ذوقی کا منہ بولتا نمونہ تھا۔ مگر جس چیز پر اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر پڑی تھی اور جسے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا بھی تھا وہ اون لکر کا پھیلا شارہ تھا جو سینٹر ٹیبل پر رکھا تھا۔ ''یہ'' اس نے بیٹھتے ہی وہ پرچہ اٹھا لیا ایسا یقیناً اس نے بے اختیار ہی کیا تھا۔

''یہ'' ممانی کی امی کے لہجے میں خوشی اور فخر اتر آیا۔ ''اپنی سعدیہ سلطانہ ہے نا وہ پڑھتی ہے انگریزی کے پرچے بڑی انگریزی آتی ہے اسے۔ اس طرح کے اتنے ڈھیروں ڈھیر پرچے اس نے رکھے ہوئے ہیں اپنے کمرے میں۔'' حسن کمال کے لیے یہ انوکھا انکشاف تھا۔

''سعدیہ سلطانہ کون.....؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''آپ کی بیٹی.....؟'' حسن کمال نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ''اچھا آپ کی بیٹی'' یاد نہ آنے پر اس نے ہونقوں کی طرح کہا۔

''بڑی لائق فائق ہے میری بچی' کالج میں پڑھتی ہے انگریزی کی کتابیں' اب تو بڑے بڑے لوگوں سے اس کے تعلقات بن چکے ہیں۔ کوئی کہیں بلاتا ہے' کوئی کہیں۔'' ممانی کی والدہ

فخر کرتے کرتے کچھ بلند و بانگ دعوے بھی کر گئیں۔

''اچھا'' حسن کمال نے متاثر ہونے کی اداکاری کی۔ ''یہ تو بڑی بات ہے۔''

''ہمارے سارے خاندان میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی ہے سمعیہ سلطانہ۔'' ایک اور امتیازی تعارف آیا۔

''خوب بہت خوب۔'' حسن کو اس صورت حال میں مزہ آنے لگا۔ اسی وقت ایک اور خاتون یخ کولڈ ڈرنک کا گلاس چھوٹی ٹرے میں دھرے اندر داخل ہوئیں۔

''یہ میری بڑی بہو ہے۔'' ممانی کی والدہ نے تعارف کروایا۔ حسن نے انہیں سلام کیا۔

''کس کالج میں پڑھتی ہے سمعیہ سلطانہ۔'' والدہ نے کہا۔ ان کی بہو نے کالج کا نام بتایا۔ یہ ایک پرائیوٹ کالج تھا۔

''اور کیا مشاغل ہیں ان کے......؟'' حسن نے یونہی پوچھا۔

''بس جی پڑھتی رہتی ہے ہر وقت۔'' بہو نے ساس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نند کی تعریف کی۔

حسن نے اون لکر کے شمارے کے صفحات پلٹے۔ ایک چیز دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا تھا۔

......•......

''شازیہ نے اس روز کی اپائنٹمنٹس کی لسٹ چیک کی۔ مسٹر علوی' مسز شہزاد' مسز بلال' مسٹر سعید رازی' مسٹر طارق جنجوعہ' مسٹر تیمور عثمان' مسز گورائیہ کمپیوٹر اسکرین پر نظر دوڑاتے دوڑاتے وہ چونکی۔ ''مسز گورائیہ'' اس نے اپنے دل میں دہرایا۔ ''گورائیہ'' یہ نام چند دن پہلے بھی اس نے کہیں سنا تھا۔ کہاں اس نے یاد کیا۔ ''مقصود احمد گورائیہ'' اسے یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی فیضان کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ اس روز کے بعد فیضان سے اس کا دوبارہ رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اور وہ ایسا دانستہ نہیں کر رہی تھی۔ یقیناً دوسری طرف بھی یہ صورت حال تھی۔ شازیہ مسکراتے ہوئے کمپیوٹر کی دبانے لگی۔ پھر کلائنٹس آنے شروع ہو گئے۔ شام سات بجے مسز گورائیہ بھی آ گئیں۔ اس وقت ڈاکٹر صبور تیمور عثمان کے ساتھ مصروف تھے۔ مسز گورائیہ اپنے اسی طنطنے کے ساتھ اس کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اس روز شازیہ نے پہلی مرتبہ ان کو فرصت اور تفصیل کے ساتھ دیکھا۔ ان کا لباس اور انداز ہی بہت مختلف تھا۔ اس نے بطور خاص ان کے پاؤں دیکھے جو سلور

کھسوں میں مقید تھے۔ انہوں نے سفید چوڑی دار پاجامے کے ساتھ آسمانی قمیص پہن رکھی تھی جس کے گلے اور آستینوں پر آسمانی اور سلور ہلکی ہلکی کڑھائی ہوئی تھی۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب سا رعب تھا۔ شازیہ ان کے بغیر بولے ہی مرعوب ہو رہی تھی۔ یہ کوئی عام شخصیت نہیں ان میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔ اس نے سوچا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب مزید کتنی دیر لگائیں گے' میرے ڈرائیور کو کسی کام سے جانا ہے کہیں اور میں عین مقررہ وقت پر پہنچی ہوں۔'' دس منٹ انتظار کرنے کے بعد مسز گورائیہ نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ایک تو یہ پیسہ' یہ اسٹیٹس اور اس کا غرور' شازیہ نے ان کے طرز تخاطب پر بھنا کر سوچا۔

''بعض اوقات اپنے کلائنٹ کی ذہنی تسلی کے لیے ڈاکٹر صاحب اسے کچھ زیادہ وقت دے دیتے ہیں۔'' شازیہ نے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا جب کہ اس کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔

''ہونہہ'' انہوں نے نخوت سے سر کو جھٹکا دیا اور اپنے پرس میں سے اپنا موبائل نکال کر کوئی نمبر دبانے لگیں۔

''ہاں فتح خان'' انہوں نے دوسری طرف سے فون ریسیو کیے جانے پر کہا۔ ''بھئی یہاں تو کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا' اب کرامت کا کیا کروں اس غریب کو جانا تھا اپنی گھر والی کو لے کر'' دوسری جانب سے نہ جانے کیا جواب دیا گیا۔

''تم ایسا کرو اسپیشل رکشا کر کے خود پہنچ جاؤ یہاں' کرامت کو فارغ کر دیتے ہیں واپسی پر گاڑی تم چلا لینا۔'' انہوں نے کہا۔ ''کیا کہا رشید صاحب اور حکیم صاحب آئے بیٹھے ہیں' کالے نواب کا فون بھی آیا تھا۔'' اب وہ کسی دوسرے موضوع پر بات کرنے لگیں۔ ''عجیب اتفاق ہے' پہلے تو یہ لوگ کبھی یوں اکٹھے جمع نہیں ہوئے' اچھا تم ایسا کرو انہیں بسنتی اور اختری کے حوالے کر کے خود چلے آؤ۔ نہیں بھئی مرزا صاحب کے ڈرائیور کو ادھر بھجوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ یہاں آ کر کیا کیا سوال نہ پوچھے گا۔ بس تم ویسا کرو جیسا میں نے کہا ہے۔'' انہوں نے فون بند کر دیا۔

''ایک بچہ آتا ہے ڈاکٹر صاحب کے پاس سلمان۔'' فون بند کرتے ہی انہوں نے شازیہ کو مخاطب کیا۔ ''کتنے دن پہلے آیا تھا وہ ادھر؟''

''سلمان'' شازیہ نے یاد کیا اور پھر اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ''سلمان مقصود'' اس نے بے اختیار کہا۔

''ہاں'' انہوں نے سر ہلایا۔

''وہ یہاں نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب اس کا ٹریٹمنٹ کہیں اور کر رہے ہیں۔'' شازیہ نے مختصر جواب دیا۔ مگر اس کے دل میں عجیب سے خیالات امڈ رہے تھے۔

''آپ ڈاکٹر صاحب سے پوچھیں کتنا ٹائم اور لیں گے۔'' اب وہ ذرا بے قراری سے بولیں۔ اسی وقت تیمور عثمان ڈاکٹر صاحب کے اندرونی آفس سے باہر نکلے۔

''آپ کا نمبر'' شازیہ نے مسکرا کر مسز گورائیہ کو مخاطب کیا۔ اور ان کے اٹھ کر اندر چلے جانے کے بعد اپنے سامنے رکھے کاغذ پر لائنیں کھینچتے ہوئے کچھ اندازے لگانے لگی۔

مقصود احمد گورائیہ' فیضان مقصود' سلمان مقصود' مسز گورائیہ..... مسز گورائیہ' اس نے دو مرتبہ اس کاغذ پر لکھا کہیں کوئی تعلق بنتا ضرور ہے۔ اس نے سوچا اس کا دل بے اختیار فیضان سے بات کرنے کو چاہا۔ لیکن اس نے کچھ سوچنے کے بعد ایسا نہیں کیا۔

.....

''یہ تو طے ہے کہ مس سمعیہ کہ آپ جیسے چہرے کی ہمیں ضرورت ہے۔'' سمعیہ کے سامنے بیٹھے شخص نے ریوالونگ چیئر پر جھولتے ہوئے کہا۔ سمعیہ نے فخریہ نظروں سے قریب بیٹھی رباب کی طرف دیکھا۔ جو کولڈ ڈرنگ پی رہی تھی۔ ''اور اب تو آپ جانتی ہیں کہ یہ شعبہ کتنا وسیع ہو چکا ہے' اس میں ترقی اور شہرت حاصل کرنے کے جتنے چانسز ہیں اتنے کہیں اور نہیں ملتے۔'' وہ نواز وڑائچ تھا جو سمعیہ کو قائل کر رہا تھا۔ ''ہمارے ہر پروجیکٹ کو جتنے اسپانسر ملتے ہیں اتنے اللہ کے فضل سے کسی اور کو نہیں ملتے پرائیویٹ چینلز والے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں ہمارے پروجیکٹ' آپ نے تسلی کرنی ہو تو بے شک کر لیں۔''

''میڈم مہ پارہ اس روز ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہی تھیں آپ کے متعلق۔'' رباب نے دانستہ طور پر اپنا شک ظاہر کیا۔

مہ پارہ بیگم۔'' نواز وڑائچ نے اپنی چیئر کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ''یہ نسل اب تاریخ کے لیٹ آور بن چکی ہے لیڈیز' ان کے خیالات' تصورات اور مشورہ بھی انہیں کی طرح فرسودہ ہو چکے ہیں لہٰذا ان کی بات پر کان دھرنے کی بجائے سنہرے مستقبل کے بارے میں سوچیں جو آپ کا منتظر ہے۔'' نواز وڑائچ کے یخ بستہ آفس آفس کے ڈیکور اور سنہرے مستقبل کے خوابوں نے سمعیہ سلطانہ کے دماغ پر خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ہنستی

مسکراتی' قہقہے بکھیرتی ٹی وی آرٹسٹس کی شکلیں گھومنے لگیں۔ وہی سب کچھ اس کا مقدر بھی بن سکتا تھا وہ سنہرا مستقبل صرف ایک گز کے فاصلے پر کھڑا اسے اپنی طرف آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

''زندگی میں ایسے چانس بار بار نہیں ملتے۔'' اسے اپنی کہی بات یاد آئی۔ اور پھر اس نے سنا وہ نواز وڑائچ سے اسکرپٹ اور اس کے لوازمات کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

.....

''حسن کمال' مہرین اور کرن فاطمہ کو مہ پارہ بیگم سے ہونے والی ملاقات کا حال سنا رہا تھا۔

''خاصا لمبا ٹائم دیا انہوں نے مجھے' میرا خیال نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی اجازت نہیں دیں گی خصوصاً جس طرح مرزا صاحب مجھے ذرا دھکا کر وہاں لے کر گئے تھے اور جو ماحول ان کی حویلی پر طاری تھا میں تو بالکل مرعوب ہو رہا تھا۔ مگر ان کے آہستہ آہستہ نرم پڑنے پر میں خود بھی حیران ہوا اور مرزا صاحب بھی۔'' اس نے کہا۔

''یہ سب ہمارے ہاں کی ہیلو جرنلزم کا قصور ہے۔ ہمارے صحافیوں نے عزت دار سلیبریٹیز کو ذرا کر رکھ دیا ہے۔ وہ لائم لائٹ میں آتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں اور یہ تو پھر ایک دلچسپ تاریخ کی مالک خاتون ہیں ایک ایسی تاریخ جو دلچسپ بھی ہے اور نادر بھی۔'' مہرین نے خیال ظاہر کیا۔

''مجھے تو یہ سوچ سوچ کر مزہ آ رہا ہے کہ ہم ان سے اپنا مواد ڈسکس کرنے جائیں گے۔ کیا ملاقات ہوگی وہ بھی۔ میں نے سنا ہے کہ عموماً..... وہ ہر کسی سے ملتی نہیں ہیں۔'' کرن نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ملو گی تو سمجھ جاؤ گی۔ یہ ایک ڈفرنٹ بال گیم ہے۔ وہ واقعی بڑی لفٹ شخصیت ہیں جن سے گفتگو کے دوران زبان دبیان اور الفاظ کی درستگی کا خیال لحہ لحہ رکھنا پڑتا ہے۔ وہ کسی بھی بات پر ناراض ہو سکتی ہیں۔'' حسن نے اسے ڈرایا۔

''بھئی ہم کون سے کوئی گرے پڑے لوفر لفنگے لوگ ہیں' ہماری تو میگزین کے لیے کاوش ہی اتنی سخت محنت سے مزین ہے کہ وہ سن لیں تو ہمیں پشت پر ایک تحسین آمیز دھپا ضرور ماریں۔'' مہرین نے کہا۔ ''ایک بار یہ میگزین مقبول ہو جائے پھر ہم کا ہے کو لوگوں کی منتیں کریں گے۔''

''خیر میگزین کے نامقبول ہونے کی بات تو مت کرو۔'' حسن نے کچھ یاد کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''پچھلے دنوں میں نے ایسی جگہ اون کلر پڑے دیکھا جہاں اس کے کیا کسی بھی پڑھنے والی

چیز کے موجود ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

''ایسی کون سی جگہ پہنچ گیا اون لکر.....؟'' مہرین کے لہجے میں تشویش تھی۔

''میری ممانی کے میکے میں۔'' حسن بدستور مسکرا رہا تھا۔

''کیوں' کیا وہ بہت جاہل لوگ ہیں۔'' کرن نے کہا۔

''نہیں' خیر جاہل تو ہم نہیں کہیں گے' کون عالم ہے کون جاہل اس کا فیصلہ ہم نے کیا کرنا ہے۔'' حسن نے اسے جتایا۔ ''مگر ان کے گھر کا عمومی ماحول ایسا ہرگز نہیں کہ وہاں اون لکر جیسا پرچہ جو اچھے پڑھے والوں کے ہاتھ میں بھی خال خال نظر آتا ہے تو اتر سے جاتا ہو۔''

''یعنی وہ لوگ باقاعدہ قاری ہیں اس کے.....؟'' کرن کو حیرت محسوس ہوئی۔ ''وہ لوگ تو نہیں البتہ ان کے گھر میں ایک ان کی بیٹی ایسی ہے جو اون لکر باقاعدگی سے پڑھتی ہے بڑے بڑے لوگوں سے اس کے تعلقات ہیں۔'' حسن کمال نے انکشاف کیا۔

''وہ کون خاتون ہیں؟'' مہرین نے ناک سکوڑی۔ ''اس کا نام سمعیہ سلطانہ ہے اور وہ میری ممانی کی بہن ہے۔''

''تمہاری یہ ممانی خود کتنی پڑھی لکھی ہیں؟'' کرن نے پوچھا۔

غالباً پانچ جماعتیں پاس ہیں اور عام طور پر ان کا رویہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا اس طبقے کی خواتین کا ہوتا ہے۔''

''اور یہ سمعیہ سلطانہ' تم نے کبھی دیکھا ہے انہیں؟'' حسن نے بتایا۔

''اس لڑکی سے ملاقات کرنی چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ اس ماحول میں وہ پڑھی لکھی ہے بلکہ اون لکر بھی باقاعدگی سے پڑھتی ہے۔ یہ بات دلچسپ بھی ہے اور عجیب بھی۔ اون لکر میں اسے کیا بات خاص اور اچھی لگتی ہے جو وہ اسے خریدتی اور پڑھتی ہے۔'' کرن نے اس بات میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''کوشش کرتے ہیں کہ اس لڑکی سے بھی ملاقات کی جائے۔ ''چلو یہ اگلا ہفتہ ملاقاتوں کا ٹھہرا۔ مہ پارہ بیگم سے اور سمعیہ سلطانہ سے' دیکھو کونسی ملاقات زیادہ دلچسپ رہتی ہے۔''

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ آج میں جلدی گھر پہنچ جاؤں اور اپنے چچا میاں کو بتاؤں کہ ہم لوگ مہ پارہ بیگم سے ملنے والے ہیں۔'' کرن کو دوسری بات سوجھی۔ اسی وقت نعیم کمرے میں داخل ہوا۔

''آج آپ لوگوں والا کام میں نے کیا ہے۔'' اس نے ان کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''کیا.....!'' وہ تینوں بیک وقت بولے۔

''میں شہر بھر کی چھوٹی بڑی خبریں اکٹھی کر کے لایا ہوں' میرا ایک دوست ایک روزنامے میں کام کرتا ہے' رپورٹر ہے وہ شوبز کے صفحے کا۔ اتفاق سے آج اس سے ملاقات ہو گئی اس کے پاس نئی نئی اور تازہ تازہ خبریں موجود تھیں۔''

نعیم نے اپنی ڈائری ان کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔ ہالی ووڈ' بالی ووڈ' لالی ووڈ' وہ سب آواز بلند نعیم کی لکھی شہ سرخیاں پڑھ کر ہنس رہے تھے۔ ٹی وی راؤنڈ اپ کرن نے ایک اور سرخی پڑھی۔

''بادفا''.....نواز وڑائچ کی نئی ڈرامہ سیریل کے لیے پانچ نئے چہرے۔ پرویز میر' عارفہ خان' سلیم نواز' سمعیہ' سلطانہ' کرن پڑھتے پڑھتے رک گئی۔

''سمعیہ سلطانہ.....'' حسن کمال نے فوراً دہرایا اور نعیم کی ڈائری کرن کے ہاتھ سے لے لی۔ ''امپاسیبل'' اس نے سر ہلایا ''وہ لڑکی نہیں ہو سکتی۔ اس کے گھرانے میں تو اس قسم کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔''

''ابھی تم نے کہا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں سے اس کے تعلقات ہیں۔'' کرن نے اسے یاد دلایا۔

''یہ تو اس کی والدہ نے سادگی میں کہا تھا۔ اس بے چاری کے کون سے بڑے لوگوں سے تعلقات ہو سکتے ہیں۔'' حسن نے کہا۔

''چلو ہم اس سے ملاقات تو کرنے والے ہی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ سمعیہ سلطانہ کون سی ہے۔ ویسے ناموں میں مماثلت تو بہت زیادہ ہے۔'' کرن نے کہا۔

.....o.....

''چوہدری صاحب کا فون ہے جی' آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔'' فتح خان نے ریاض میں مشغول مہ پارہ بیگم کی محویت توڑی۔ عموماً وہ اور دوسرے ملازمین یہ جرأت ان کے ریاض کے دوران نہیں کیا کرتے تھے مگر یہ فون ایک ایسی شخصیت کا تھا جس کے متعلق بتانا ضروری تھا۔

''معلوم ہے مجھے یہ فون کس سلسلے میں آیا ہے۔'' مہ پارہ بیگم نے ستار ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔ ''فتح خان چوہدری صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس وقت ریاض میں مشغول

ہوتی ہوں۔"

"جی حضور۔" فتح خان نے ہاتھ باندھے باندھے سر جھکا کر کہا۔

"کہہ دو ان سے کہ میں مصروف ہوں اپنے کام میں..... اور یہ بھی کہہ دینا کہ جس سلسلے میں انہوں نے فون کیا ہے وہ مجھے معلوم ہے اس کا جواب میں پرسوں انہیں دے چکی ہوں۔"

"آپ بات سن لیں حضور' کیا معلوم کوئی اور بات کہنی ہو۔" فتح خان نے کہا۔

"فتح خان....." مہ پارہ بیگم نے ابرو چڑھا کر کہا' "کیا اس مرتبہ بہت بھاری بخشش مل گئی تھی چوہدری صاحب سے جو یوں ان کی طرف داری کی جا رہی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے جناب' چوہدری صاحب سے تعلق آپ کی خاطر ہے ان کی خدمت ناز برداری آپ کی وجہ سے ہے' اسی لیے آپ سے عرض کی تھی کہ آپ فون سن لیں۔" فتح خان نے عاجزی سے کہا۔

"تم نے کہہ دیا' میں نے سن لیا۔ اب ان کو وہی جواب دے دو جو میں نے کہا ہے۔" مہ پارہ بیگم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور ستار دوبارہ اٹھالیا۔ ان کی انگلیاں ستار کے تاروں پر پھر نے لگیں۔ فتح خان کچھ دیر یونہی کھڑا انہیں دیکھتا رہا اور پھر ان کو مگن دیکھ کر واپس چلا گیا۔

.....

"اس روز شازیہ نے فیضان کو اپنے سامنے پا کر حیران ہوتے ہوئے اپائنٹمنٹ لسٹ ایک مرتبہ پھر چیک کی۔

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں اب تک۔" فیضان نے اسے پریشان دیکھ کر کہا' "تمہاری اپائنٹمنٹ لسٹ میں ایم اے گورائیہ کا نام موجود ہے یا نہیں۔" شازیہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی یہ نام اس لسٹ میں موجود تھا۔

"یہ میرے والد کا نام ہے اور حسب معمول وہ یہاں پہنچ نہیں سکے' لہٰذا یہ اپائنٹمنٹ بھگتانے کے لیے یہ فدوی حاضر ہے۔" شازیہ کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔

"میں تمہاری کال کا منتظر رہا اتنے دن....." کچھ دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کہا۔ شازیہ نے نظر اٹھا کر وزیٹرز سیٹس پر بیٹھے دو لوگوں کو دیکھا وہ اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔

"میں نے کال کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔" شازیہ نے نیچی آواز میں کہا وہ بظاہر اپنے کام میں مصروف تھی۔

"ہاں' یہ بھی ٹھیک ہے لیکن وہ جو انسان کو ایک امید سی ہوتی ہے نا وہ بہر حال مجھے تھی..... لیکن تم خاصی بے نیاز قسم کی خاتون ہو۔" فیضان نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کا بھائی سلمان کیسا ہے اب.....؟" شازیہ نے یہ بات بھی نیچی آواز میں پوچھی تھی۔

"وہ بہتر ہو رہا ہے' خاصی امپرومنٹ ہے اس کی کنڈیشن میں مگر وہ ایا کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اور ان پر نظر پڑتے ہی اپنی پرانی حالت میں لوٹ جاتا ہے۔" اس کے اس سوال پر فیضان نے کہا۔

"ڈاکٹر عبدالصبور نے اس کی اس حالت کے بارے میں کچھ بتایا نہیں' کیوں ہو جاتی ہے۔" شازیہ یہاں آنے والوں سے ایسی بات پوچھنے کی عادی نہیں تھی مگر وہ فیضان تھا جو خود ہی اس کے ساتھ بے تکلفی سے بات کرتا تھا۔

"وہ دیکھ رہے ہیں سارے معاملے کو جانچ رہے ہیں' اس کے سلسلے میں انہوں نے سلمان سے تعلق رکھنے والے کئی لوگوں سے بات کرنے کا ارادہ بھی کیا ہے۔"

"اچھا جب ہی۔" اچانک شازیہ کو اس روز والی خاتون یاد آ گئی۔

"کیا جب ہی.....؟"

"ایک روز مسز گورائیہ نام کی ایک خاتون آئی تھیں' وہ بھی سلمان کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔"

"مسز گورائیہ۔" فیضان نے زور دے کر کہا۔ "ہوا زشی..... وہ کون تھیں۔"

"معلوم نہیں۔" شازیہ نے شانے اچکائے اور پھر اسے تفصیل سے ان خاتون کا حلیہ بتایا۔

"ایسی کوئی خاتون میری نظر سے تو کبھی نہیں گزریں۔" فیضان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اور انہوں نے خود کو مسز گورائیہ کہہ کر متعارف کروایا۔"

"ہاں' وہ پہلے بھی ایک مرتبہ آئی تھیں۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کس سلسلے میں آئی تھیں۔ اس بار تو انہوں نے خود سلمان کے بارے میں پوچھا تھا' ہو سکتا ہے وہ آپ کے والد کی دوسری مسز ہوں۔" شازیہ نے اپنا قیافہ ظاہر کیا۔

"ڈونٹ ٹیل می۔" فیضان ناراض سا ہو کر بولا۔

''میرے والد کی نہ دوسری نہ تیسری کوئی بھی مسز نہیں ہیں' میری والدہ ان کی زندگی میں نہیں رہیں۔ ان کے بعد انہوں نے شادی وغیرہ کا کوئی سلسلہ نہیں کیا' یہ مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے میری بوا جی اور تائی جی دونوں ہی بہت اصرار کے ساتھ انہیں یہ کام کر لینے کا کہتی رہیں مگر وہ نہیں مانے۔''

''پھر یہ خاتون آپ کی تائی جی بھی تو ہو سکتی ہیں۔'' شازیہ نے ایک اور خیال ظاہر کیا۔

''قطعی نہیں..... میری تائی جی تو سیدھی سادی نمازی پرہیزگار خاتون ہیں اور ہمارے علاقے سے کوئی خاتون نکلے اور ہمیں علم نہ ہو یہ ہو نہیں سکتا کوئی اور معاملہ ہے۔''

''اچھا پھر یہ تو نہ سمجھ میں آنے والا معاملہ ہے اس کا کیا' کیا جائے۔ بہتر ہے کہ اس پر بات ہی ختم کر دی جائے'' شازیہ نے ڈاکٹر صاحب کے کمرے سے باہر آتے شخص کو دیکھ کر اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر بیٹھی تھی۔ فیضان اس کی سوچ کو پڑھ چکا تھا۔ اسی لیے خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا تھا مگر اس کے چہرے پر تفکر کے اثرات تھے۔

''ایک فیور مجھے دینا۔'' ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے بعد باہر نکل کر اس نے ایک مرتبہ پھر شازیہ کو مخاطب کیا۔ شازیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''اب جب بھی کبھی یہ خاتون یہاں آئیں جنہیں تم مسز گورائیہ کہتی ہو مجھے کال کر دینا۔ میں بھی یہاں آ جاؤں گا۔ تم اتنا تو کر سکتی ہو نا۔'' اس نے امید افزا نظروں سے شازیہ کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے اب وہ آئیں تو میں ایسا ہی کروں گی۔'' شازیہ کو اچانک ہی اس معاملے سے خوف آنے لگا تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے جو اسے بھی اس کا علم نہیں ہے اور وہ ڈاکٹر صاحب کو باقاعدہ وزٹ کرتی ہیں۔ شازیہ ڈاکٹر عبدالصبور سے یہ معاملہ ڈسکس کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی اور اگر فیضان نے ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیا اور انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اسے ان کے بارے میں مجھ سے پتا چلا ہے تو پھر۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک لہر دوڑ گئی۔

.....o.....

''سلمان کے متعلق پوچھنے کے لیے ڈاکٹر عبدالصبور کے پاس بار بار آپ کا جانا بہت سے ایسے سوالات اٹھا سکتا ہے جن کے جواب نہ آپ دے سکیں گی نہ میں۔'' مہ پارہ بیگم نے بڑے سکون کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھے شخص کی یہ بات سنی تھی۔ وہ اس شخص کے منہ سے یہ بات سننے کی بہت دنوں سے توقع کر رہی تھیں۔

''کیا اب بھی اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی آپ کو سوالات اٹھائے جانے کا خوف ہے جبکہ آپ کے متعلق حوالوں سے اٹھائے جانے والے سوالات کا کوئی شمار ہی نہیں.....'' مہ پارہ بیگم کو خود محسوس ہوا ہے کہ اپنے مخاطب سے بات کرتے ہوئے زندگی میں پہلی بار ان کے لہجے میں اور انداز میں اعتماد آیا تھا۔

''ہوں.....'' ان کے سامنے بیٹھے شخص نے ان کے انداز اور سوال پر غور کرنے کے بعد کہا وہ ایک ذہین شخص تھا اور یقیناً جان چکا تھا کہ مہ پارہ بیگم کے لہجے میں کوئی بات نئی سی تھی۔

''میری تو خیر ہے بیگم صاحبہ آپ اپنے متعلق غور کیجیے کیا اس عمر میں آپ اس قسم کے سوالات کے جواب دے لیں گی؟''

''خوب!'' مہ پارہ بیگم مسکرائیں ''بات یہ ہے چوہدری صاحب کے نت نئی سوجھانے کی آپ کی عادت پرانی ہے جو کسی طرح بھی جاتی دکھائی نہیں دیتی' رہا عمر اور سوالات کا معاملہ تو یہ میرا دردسر ہے کہ مجھے کس بات کا اور کون سے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کے سلسلے میں خیر

ہے تو پھر مت پروا کیجیے اس بات کی کہ سلمان کے سلسلے میں لوگ میرے بارے میں کیا پوچھیں گے اور کیا کہیں گے۔"

"جہاں سے بھی مل رہی ہے کہنا پڑے گا کہ آپ کو اچھی فیڈنگ مل رہی ہے' چلیے آپ اپنا زور لگا لیجیے' اتنا تو آپ کا حق بنتا ہے۔"

"نوازش ہوگی کیونکہ اب اس معاملے سے بے نیازی اور بے رخی برتنا میرے اختیار میں نہیں رہا۔ میں عمر کی اس منزل پر ہوں جہاں حواس اور قویٰ کمزور پڑنے لگتے ہیں اور انسان چاہتے ہوئے بھی ویسا نہیں رہ پاتا جیسا جوانی میں ہوا کرتا تھا۔" مہ پارہ بیگم اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔

"ایک عہد نامہ طے پایا تھا ہمارے آپ کے درمیان کہیں تو اس کے مندرجات ایک مرتبہ پھر گوش گزار کردوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں' آپ زحمت نہ کیجیے کیونکہ اس کے مندرجات الف سے لے کر یے تک مجھے بخوبی یاد ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ آپ کو بھی یاد ہیں وہ اب تک۔"

"اچھا....." ان کے مخاطب نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ایک مرتبہ پھر ان کے اندر پر غور کیا' "یہ بھی اچھی بات ہے کہ اس وقت آپ اپنی سلطنت کے اندر ہیں' نوکر' ملازم' خدمت گار سب آپ کے اپنے ہیں آپ بے خوف ہو کر بات کر سکتی ہیں۔"

"بات صرف اتنی سی نہیں ہے چوہدری صاحب....." مہ پارہ بیگم نے باریک کترنی چھالیہ پھانکتے ہوئے کہا' "بات پھر عمر کی اس منزل کی آ جاتی ہے جس تک پہنچ کر ڈر' خوف سب ختم ہو جاتا ہے اور کہنے والی بات کہتے ہوئے کوئی امر مانع نہیں ہوتا سوائے احترام کے۔"

"ٹھیک کہتی ہوں گی آپ۔" اس شخص نے متانت سے جواب دیا' "بہر حال میرا مشورہ یہی ہے کہ سلمان کے سلسلے میں ذرا احتیاط ہی واجب رکھیے وہ خود بھی بہت سے لوگوں کو اتنا نہیں جانتا' اس کی ذہنی صحت کے لیے بہت ضروری ہے کہ غیر متعلقہ لوگ اس سے دور ہی رہیں۔"

"یہ فیصلہ خود اس کو کرنے دیجیے کہ متعلقہ اور غیر متعلقہ کون ہے۔ جبھی چوہدری صاحب وہ صحت پا سکے گا۔" مہ پارہ بیگم کے لہجے میں قطعیت جھلک رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ شخص اٹھتے ہوئے بولا' "چلتا ہوں پھر کبھی حاضر ہوا تو اس موضوع پر بات کریں گے۔"

"ارے بھئی ہم تو ملاقات کے پروگرام ہی بناتے رہ گئے اور یہ مس سمعیہ سلطانہ شہرت کے میدانوں کو عبور کرنے میں کمال حاصل کرنے لگی ہیں۔" کرن فاطمہ نے مختلف اخباروں کے مخصوص کرنے لگی ہیں۔" کرن فاطمہ نے مختلف اخباروں کے مخصوص ایڈیٹنز والے صفحات اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" مہرین قدرے اشتیاق سے آگے بڑھی' "یہ سمعیہ سلطانہ وہی ہے نا ممانی فیم۔"

"بالکل وہی۔" کرن نے سر اٹھا کر کہا' "آپ خود ہی انداز کر لیں گی اس مختصر تعارف کو پڑھ کر کہ محترمہ دراصل بے حد متوسط طبقے سے اٹھ کر اچانک فنکارہ بنتے چلی گئیں۔"

"حیرت تو اس متوسط طبقے پر ہے جس نے اسے جانے دیا کیونکہ سننے میں آیا کہ ایسے گھرانوں میں ایسے بولڈ اسٹیپ لیے جانے پر خاصی لے دے ہوتی ہے۔" مہرین نے کرن کے سامنے سے چند اخبار اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی اب ماضی بعید کا حصہ بن کر رہ گیا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ ایسے اقدامات پر طوفان اٹھاتے تھے اب گلیمر اور لائم لائٹ ایک علامت بن گئی ہے عزت' ناموری اور دولت کی شہرت یقیناً سمعیہ سلطانہ کے گھر والے بھی اس نئی صورت حال پر ناراض نہیں ہوں گے۔" کرن نے اپنی معلومات جھاڑیں۔

"ایک تو یہ حسن میاں نہ جانے کہاں اچانک اتنے مصروف ہو گئے کہ ہمارا طے شدہ ہفتہ ملاقات بھی یوں ہی ضائع ہو گیا۔ مہ پارہ بیگم اور سمعیہ سلطانہ دونوں سے ہی ملاقاتیں نہیں ہو سکیں۔" مہرین نے اخبارات پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد انہیں واپس کرن کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ان کی خیر منایئے' میں نے جہانگیر نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرتے ہوئے کہا' "سنا ہے کثیر سرمائے کے ساتھ یہ صاحب ایک نیا روزنامہ شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جگہ خرید کر عمارت وہ پہلے ہی سے تعمیر کر چکے ہیں اور اب کچھ تکنیکی قسم کے مسائل سلجھا رہے ہیں۔"

"ہوں....." مہرین کا ماتھا ٹھنکا' "اور کہا حسن کیا ان کا مشیر اپائنٹ ہو گیا ہے۔"

"نہیں' ایسی تو بظاہر کوئی بات نظر نہیں آ رہی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ حسن صاحب سے مستقل طور پر ایک کالم لکھنے کے لیے اصرار کر رہے ہیں یہ کالم سیاسی موضوعات سے متعلق ہوگا۔"

"یہ بات تمہیں کب سے معلوم ہے؟" مہرین نے جہانگیر کو قدرے درشتی سے مخاطب

کرتے ہوئے کہا۔

''یہی..... ایک دو دن پہلے سے.....'' جہانگیر نے بے نیازی سے کہا''بظاہر تو حسن صاحب صرف ان کو تکنیکی مشورے دیتے نظر آ رہے ہیں کیونکہ ان کی پی آر کافی مضبوط ہے اس لیے بلال ظفر کو مختلف لوگوں سے ملوانے کا کام بھی انہوں نے اپنے سر لیا ہوا ہے۔''

''کمال ہے!'' مہرین نے کرن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا''ہم آفس میں اس کے تھوڑی دیر کے لیے آنے کو'اون لکر' کے ہی کسی کام کے سلسلے کی مصروفیت سمجھتے رہے اور وہ بلال کے کام کرتا پھر رہا ہے۔''

''اس میں گھبرانے یا غصہ کرنے والی بات کیا ہے میم' دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں اور حسن تو خاصے دوست دار آدمی ہیں۔ بلال ظفر کا کام سیٹ ہو گیا تو فارغ ہو جائیں گے حسن صاحب بھی۔'' کرن نے اسے تسلی دینے کے سے انداز میں کہا۔

''یہ تو محض خیال ہی ہے نا دل کو بہلانے والا مفروضہ.....'' مہرین نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا''ورنہ جس حسن کو میں جانتی ہوں وہ یونہی اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کی مدد کرتے پھرنے کا قائل نہیں ہے اور وہ بھی اب جبکہ پرچہ پریس میں جانے میں کچھ دن ہی باقی ہیں اور اس کا بہت سا کام باقی ہے' خصوصاً مہ پارہ بیگم کے متعلق مضمون کی دوسری قسط شائع ہونے سے پہلے ایک بار ان کو دکھانے والی شرط پوری کرنے والی بات اتنی اہم ہے کہ حسن اس کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا۔''

''پلیز ڈونٹ وری میم' میں ابھی حسن صاحب سے کو میٹ کرتی ہوں اور انہیں یہ سب کام یاد دلاتی ہوں' جو مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی بھی نہیں بھولے ہوں گے۔'' کرن نے اپنے موبائل پر حسن کا نمبر پریس کرتے ہوئے کہا''وہ فون اٹینڈ نہیں کر رہے۔'' کچھ دیر بعد اس نے موبائل کان سے ہٹا کر کہا۔

''دیکھا.....'' مہرین نے یوں کہا جیسے کہہ رہی ہو کہ میری بات درست تھی۔

''ایسا کرتے ہیں کہ جو کچھ اس بار ہم نے مہ پارہ بیگم کے متعلق لکھا ہے اسے دن کو دکھانے کے لیے ہم خود ان سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہم سے ملنا ہی پسند نہیں کریں گی۔'' کرن نے ایک اور راستہ سجھایا۔

''یہ بات نہیں ہے۔'' مہرین قدرے مایوسی سے بولی''میرا خیال ہے کہ حسن تمہارے ساتھ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ اس کی ان سے شناسائی ہے' اور جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے تو آج اے

پی این ایس کی میٹنگ اٹینڈ کرنے جانا ہے۔''

''تو پھر میں اور جہانگیر چلے جاتے ہیں' کیوں جہانگیر' چلیں اندرون شہر فالودہ اور گول گپے کھانے۔'' کرن نے خوشدلی سے جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اپن کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے' جہاں مرضی لے چلیے۔'' جہانگیر نے مسخرے پن سے کہا۔

''اوہ۔'' مہرین نے جھنجلا کر کہا''میں نے کہا نا کہ وہاں جانے کے لیے حسن کا ساتھ ہونا بہت ضروری ہے' یہ کمٹ منٹ وہی ان سے کر کے آیا تھا اور وہی اس کو نبھائے گا بھی۔'' جہانگیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا' کرن نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا اور متانت سے مہرین سے مخاطب ہوئی۔

''ٹھیک ہے میم' ہم حسن کے آنے کا یا اس سے رابطہ ہونے کا انتظار کر لیتے ہیں پھر مل لیں گے مہ پارہ بیگم سے۔'' مہرین واپس اپنی ٹیبل کی طرف چلی گئی۔

''اصل بات تو یہ ہے مہرین کیانی کہ تم اس پرچے کو چلانے کے لیے حسن کمال نامی بیساکھی کی اتنی عادی ہو گئی ہو کہ تو سرا کوئی شخص تمہیں کتنا ہی اچھا کام کر کے کیوں نہ دے' تمہیں تسلی نہیں ہو گی۔'' کرن اس روز اپنے کام کے دوران کن انکھیوں سے بوکھلائی ہوئی مہرین کو دیکھتے ہوئے سوچتی رہی''خدا جانے تمہاری سوچ کا انجام کیا ہو گا۔'' اس نے آخر میں سوچا اور اپنے لکھے ہوئے صفحے کو ایک مرتبہ پھر پڑھنے کی غرض سے اس پر نظر دوڑانے لگی۔

.....

''ہم کہیں بہتر علاقے میں ایک اچھا سا فلیٹ نہ لے لیں امی۔'' سمعیہ سلطانہ نے بڑے ناز کے ساتھ اپنی والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بس ایسی کون سی انہونی کہہ دی میں نے۔'' سمعیہ نے اپنے بجے سنورے بالوں میں سے پنیں نکالتے ہوئے کہا''بھئی' اب میرے پاس اتنا پیسہ ہے کہ میں کسی اچھے علاقے میں کرائے پر گھر لے سکتی ہوں۔''

''میں نے کہا نا کہ چپ کر جا' پہلے ہی تیرے کاموں کی وجہ سے گھر پانی پت کا میدان بنا پڑا ہے اس کو ختم ہونے دے پھر کوئی اگلی بات کرنا' بھائی تیرے تجھ سمیت مجھے بھی اور تیرے باپ کو بھی گھر سے نکال دینے کے درپے ہوئے پڑے ہیں اور تو فلیٹ لیتی پھر رہی ہے۔''

''تو نکال دیں نا!'' سمعیہ نے بالوں کو کھول کر ان میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا''پرواکس

کو ہے' آپ ہی تو کہتی ہیں شرع میں کیا شرم ہے۔''

''ارے کم بخت چپ کر جا' اس عمر میں میرے سفید چونڈے اور اپنے باپ کے سفید سر میں خاک ڈلوا رہی ہے' عزیز' رشتے دار سب منہ پر انگلی دھرے تھو تھو کرتے پھر رہے ہیں۔ بیٹیوں' جوائیوں سب کی لعن طعن میں سن رہی ہوں تیرا کیا جاتا ہے تو تو شوں کر کے اڑ جاتی ہے صبح سویرے اور اس وقت شام پڑے واپس آ جاتی ہے۔''

''او میری بھولی ماں۔'' سمعیہ نے اٹھ کر ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں ''تو نے کبھی ٹی وی پر دیکھا ہے مجھے' نہیں نا میرا ڈراما ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اب طریقہ کچھ اور ہے اور ڈراما مکمل ہو جائے تو آن ایئر ہوتا ہے۔ وہ بھی کبھی کبھار سال دو سال بعد' چلو ڈراما دکھایا جائے ابھی یا نہیں لیکن میری ریکارڈنگ اور کام دیکھ کر ہی جو آفرز مجھے آن لگی ہیں ان کی تفصیل سن کر تو آپ کا دماغ ہی گھوم جائے اب تو مجھے اشتہاروں میں بھی کام ملنے لگا ہے اور مزید ڈراموں میں بھی' سیٹلائٹ چینلو پر بھی میری لائیو پرفارمنس والے پروگرام چلنے کی امید ہے۔ وہ عاصم ہے نا عاصم' اس نے اپنی گلوکار۔'' پھر اس نے خود ہی بتایا ''اس نے اپنے میوزک ویڈیو میں کام کے لیے مجھے پینتیس ہزار معاوضہ دینے کی پیشکش کی ہے' اس کے علاوہ ایک میوزیکل بینڈ مجھے لاکھوں میں معاوضہ دینے کو تیار ہے اپنے میوزیکل ویڈیو میں کام کرنے پر۔''

''ہزاروں' لاکھوں۔'' اس کی امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ''تیرا دماغ تو گھوم گیا ہے کون دے گا تجھے ہزاروں' لاکھوں؟''

''یقین نہیں آتا۔'' سمعیہ نے ہنس کر کہا ''تو یہ دیکھیں۔'' اس نے اپنا بیگ کھولا جو روپوں سے بھرا پڑا تھا' ''آپ ایک ابھرتی ہوئی بے مثال فنکارہ کی والدہ ہیں امی' آپ کو تو فخر سے سر بلند کر کے لوگوں کو بتانا چاہیے کہ آپ کی بیٹی کیا بننے جا رہی ہے۔ سب طعنے دینے والے' سب انگلیاں اٹھانے والے خود ہی خاموش ہو جائیں گے اور ایک دن وہ بھی آئے گا جب یہ لوگ ہی اپنے ملنے والوں کو بتایا کریں گے کہ مشہور فنکارہ سمعیہ سلطانہ سے ان کا کیا رشتہ ہے' رہی بات فلیٹ کی تو وہ تو میں ضرور لوں گی چاہے گھر پانی پت کا میدان بنے چاہے کورو پانڈو کی جنگ لڑی جائے۔''

''ارے سمعیہ' کون تمہیں روکتا ہے فلیٹ لینے سے۔'' نہ جانے کدھر سے اس کی بھابی ادھر کو نکل آئیں ''جگ جگ لو فلیٹ بھی گاڑی بھی' ارے امی آپ تو یونہی کھپ رہی ہیں ہماری بچی میں

کوئی گن ہے تو ہم منہ کیوں چھپائیں' فخر سے کیوں نہ بتائیں آخر یہ جو اتنی ساری لڑکیاں آج کل اس میدان میں موجود ہیں یہ ساری کی ساری تو غلط قسم کے خاندانوں سے تعلق نہیں رکھتی ہیں پھر ہماری سمعیہ کے لیے ہی لعن طعن کیوں' میں نے تو اس کے بھائی کو بھی سمجھایا تھا' بہن ڈاکٹر بن جاتی' انجینئر بن جاتی یا پروفیسر بن جاتی کام تو گھر سے باہر نکل کر کرنے کا ہی ہوتا نا تو پھر اس کام میں کیا برائی ہے۔ اچھا ہے شہرت بھی ملے گی اور پیسہ بھی۔'' بھابی کی نظر ساری بات کے دوران سمعیہ کے ادھ کھلے بیگ پر تھی جس میں سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ جھانک رہے تھے۔

''ارے جئیں بھابی۔'' سمعیہ اس بات پر جی جان سے نثار ہوئی ''دیکھا آپ نے امی بھابی نے کتنی جلدی وقت کی آواز سن لی۔ کم از کم ایک ووٹ تو میرے حق میں ہوا مجھے یقین ہے کہ آہستہ آہستہ یہ ساری کورو پانڈو اور پانی پت کی لڑائیاں دم توڑ جائیں گی۔ آپ بھابی ایسا کریں کہ یہ پیسے لیں اور آج ہی اپنے لیے اور بچوں کے لیے کچھ شاپنگ کر آئیں۔'' اس نے بیگ کھول کر کئی نوٹ بھابی کو پکڑا دیے۔

''جیتی رہو' دیکھا امی بیٹوں سے زیادہ تو بیٹی کماؤ نکلی آپ کی۔'' بھابی نوٹ پکڑ کر کھل اٹھیں اور سمعیہ کی امی ہونقوں کی طرح اس پل پل بدلتی صورت حال کو دیکھتی رہ گئیں۔

''ویسے تو شاید یہ ممکن نہ ہوتا مگر سمعیہ بی بی کے اس نئے شوق نے امید پیدا کر دی ہے کہ ہماری جان ان محترمہ سے جلد ہی چھوٹ جائے گی۔'' اس روز بڑی بھابی نے شاپنگ سے واپسی پر چھوٹی بھابی کو مژدہ سنایا۔

''بھائی تو اس کے بھڑ کے پڑے ہیں سمعیہ بی بی کا نیا شوق پورا کیسے ہوگا؟'' چھوٹی بھابی نے یقین نہ کرتے ہوئے کہا۔

''بڑے والے کو سمجھانا اور ٹھنڈا کرنا میرا' منجھلے کو سمجھانا تمہارا کام ٹھہرا' دیکھو یہی موقع ہے کہ یہ بی بی اماں باوا سمیت یہاں سے فارغ ہو جائے ورنہ ہمیشہ یونہی دُھواں کا پکا کر گزارہ کرتے رہیں گے۔'' بڑی بھابی نے اپنے ذہن میں آئی اسکیم کے تحت چھوٹی بھابی کو اپنا حامی بنانے کی خاطر کہا ورنہ اس سے پہلے سمعیہ کے ٹی وی پر جانے کی خبر سن کر ان دونوں نے ہی اپنے اپنے شوہروں کی جلتی پر مزید تیل ڈالنے کا فرض ادا کیا تھا۔

''اور چھوٹے والے کا کیا کریں گے' اس کو ٹھنڈا کرنے اور سمجھانے والی تو ابھی آئی نہیں۔'' چھوٹی بھابی نے خیال ظاہر کیا۔

''اس کو دونوں بڑے سنبھال لیں گے' ویسے بھی وہ ابھی چھوٹا ہے میں نے محسوس کیا ہے کہ سمعیہ کے ٹی وی پر نظر آنے میں اسے کوئی خاص اعتراض نہیں اس کا خیال ہے کہ ممکن ہے سمعیہ کی وجہ سے اس کو بھی کوئی ایسا چانس مل جائے' تم جانتو ٹی وی فلموں اور تھیٹر کا رسیا تو وہ سدا سے ہے' ہوسکتا ہے خیالوں میں خود کو سعدیہ امام کے مدمقابل ڈائیلاگ بولتے دیکھ رہے ہوں حضور.....''

''یہ تو ہے اور بھئی ہمیں کیا کہ سمعیہ بی بی کنویں میں گرتی ہیں یا کھائی میں' جہاں بھی گریں گی اپنی مرضی سے گریں گی کوئی دودھ پیتی بچی تو ہیں نہیں محترمہ.....'' چھوٹی بھابی کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔

''پلو وہ کسی اچھے علاقے میں بنگلا لے یا فلیٹ بلا سے ہماری جان تو چھوٹے' ہم ناراض ہو کر کیوں رہیں' ہفتہ واری تعطیل پر بچے بھی جا کر پھوپی سے مل آیا کریں گے' چار گھڑی ذرا ماڈرن ماحول میں رہ لیا کریں گے۔ بچوں پر تو خاصی مہربان ہو رہی ہے جب سے پیسہ ملنے لگا ہے سو پچاس آتے جاتے پکڑا جاتی ہے۔''

''اپنے لیے حمایت حاصل کرنے کی خاطر۔'' بڑی بھابی مکارانہ انداز میں ہنسیں ''تو پھر بی بی تم خود ہی سوچ لو ہمارا کیا جاتا ہے سمعیہ سلطانہ کے اداکارہ بن جانے سے ہمارا تو دوطرفہ فائدہ ہے بہتری اسی میں ہے کہ ہم اپنے اپنے شوہروں کو قابو کر کے قائل کر لیں۔''

یوں سمعیہ سلطانہ جس کے ڈرامے میں کام کرنے پر گھر میدان کارزار بن کر رہ گیا تھا' دونوں میں امن کا گہوارہ بن گیا۔ سمعیہ نے اقبال ٹاؤن میں ایک چھوٹا بنگلا نما گھر کرائے پر لے لیا اور اپنے ابا امی کو اپنے ساتھ لے آئی۔

بھائیوں نے صلح صفائی سے گھر سے رخصت کیا اور حسب منصوبہ بھائی بھابی ہفتہ واری تعطیل منانے اس کے پاس باقاعدگی سے آنے جانے لگے۔ سمعیہ کے اس قدم نے ہر طرف خوشحالی پھیلا دی تھی۔ بھائیوں کے ہاتھ بھی کشادہ ہونے لگے تھے۔ امی ابا بھی اچھا کھانے اور اچھا پہننے اوڑھنے لگے تھے۔ بہت سی ایسی چیزیں جو رسائی سے باہر نظر آتی تھیں اب پہنچ میں آ گئی تھیں۔ یوں ڈرامے میں کام کرنا میراثی بھانڈوں کا پیشہ کہلانے کے بجائے دنوں میں معزز ہنر کہلایا جانے لگا جس میں عزت' شہرت اور پیسہ سب ہی کچھ مل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ عزیز و اقارب اور دوستوں' محلے داروں نے بھی اس حقیقت کو قبول کرنا شروع کر دیا اور سب کے لیے ہی سمعیہ سلطانہ کا نام اور اس سے تعلق فخر کا باعث بننے لگا تھا۔

.....o.....

''خوب پکڑا بھئی آپ کو۔'' اس شام فلاور شاپ پر حسن کمال کو پھولوں کا بوکے خریدتے دیکھ کر کرن فاطمہ نے انہیں جا لیا۔ اے محسوس ہوا حسن اسے سامنے پا کر ذرا بے آرام سے ہو گئے تھے۔

''کہاں غائب ہیں بھئی آپ' ہم تو کنوؤں میں ڈنڈے بھی ڈلوا چکے کہیں آپ کا سراغ نہیں مل رہا تھا؟'' کرن نے پردانہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہیں تھا مجھے کہاں جانا ہے؟'' حسن نے کان میں انگلی چلاتے ہوئے کہا۔ کرن نے ایک نظر غور سے انہیں دیکھا اس روز بھی وہ بہت بہتر حلیے میں تھے مگر یہ کپڑے وہ نہیں تھے جو وہ ویلنٹائن ڈے والے واقعے کے بعد پہن کر آئے تھے۔

''اور یہ بوکے کس کے لیے خرید رہے ہیں؟'' اس نے حسن کے ہاتھ میں پکڑا سرخ گلابوں کا گلدستہ دیکھ کر کہا ''کیا وہ تحفے والی خاتون دریافت ہو گئیں؟''

''سارے سوال اکٹھے ہی کر لو گی کیا؟'' حسن نے بوکے کی قیمت ادا کرتے ہوئے کہا اور شاپ سے باہر نکل آئے۔

''آپ کا موبائل بھی آف ملتا ہے کیا نمبر بدل لیا ہے آپ نے؟ جہانگیر بتا رہا تھا کہ آپ اب اکثر بلال ظفر کے ساتھ نظر آتے ہیں جو اپنا ڈیلی نکالنے کی تیاریاں کر رہا ہے' بات کیا ہے بھئی حسن صاحب' آپ اتنے پراسرار کیوں ہو رہے ہیں آپ کو اندازہ ہے کہ مہرین نے اس صورت حال پر کتنی پریشان ہے۔'' کرن مسلسل بولے چلی جا رہی تھی۔

''میں مہرین سے خود بات کر لوں گا۔'' فٹ پاتھ پر چلتے چلتے حسن صاحب نے ایک دم رک کر کہا ''میں خاصا مصروف ہوں اس لیے فی الحال اون لکر کے لیے ٹائم نہیں نکال پاؤں گا۔''

''کیوں بھئی؟'' کرن کے چلتے قدم رک گئے ''اون لکر تو آپ کی پہلی ترجیح ہونا چاہیے' بلکہ یہ پہلی ترجیح ہے جبکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ پرچہ پریس میں جانے میں بس چند ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' حسن صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''مگر ترجیحات کا کیا ہے یہ تو وقت کے ساتھ ساتھ بدل جاتی ہیں۔''

''ڈونٹ ٹیل می۔'' کرن بری طرح چونک گئی۔

''ارے گھبرا گئیں.....!'' حسن صاحب نے قہقہہ لگایا ''ڈونٹ وری' اون لکر کا یہ پرچہ

میرے ہاتھوں سے ہی گزر کر پریس میں جائے گا۔"

"اور اون لکر کے اگلے پرچے۔" کرن کے لہجے میں بدستور شک تھا۔

"واقعی بہت ذہین ہو۔" حسن مسکرائے "آنے والے وقت کے بارے میں کوئی پیش گوئی ہو نہیں سکتی وہ تو اوٹ میں ہے ابھی۔"

"آنے والے وقت کے کئی منصوبے تو ہم نے بہت پہلے سے بنا رکھے ہیں حسن صاحب' اون لکر کے کس شمارے میں کیا اچھوتی بات ہوگی اس کی فہرست تو آپ نے خود اپنے ہاتھ سے بنا کر رکھی ہوئی ہے۔"

کرن نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کرن فاطمہ۔" حسن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "منصوبہ کسی اور کا عمل کوئی اور بھی تو کر سکتا ہے۔ بہرحال میں مہرین سے خود بات کرلوں گا یہ بات تم سے اور وہ بھی یوں سرراہ کرنے کی نہیں ہے۔" وہ فٹ پاتھ کے ساتھ پارکنگ کی طرف مڑتے ہوئے بولا اور کرن انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی' ان کی پشت کرن کی جانب تھی اور وہ اپنی موٹر سائیکل کو کک مار رہے تھے۔ وہ یونہی خاموش کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی پھر اچانک اسے نہ جانے کیا خیال آیا وہ تیزی سے حسن صاحب کی طرف بڑھی جنہوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے موڑلی تھی۔

"ہمیں مہ پارہ بیگم سے بھی ملنا تھا حسن صاحب' ان کے بارے میں مضمون کی اگلی قسط تیار پڑی ہے لیکن حسب وعدہ وہ انہیں دکھائے بغیر ہم شائع نہیں کر سکتے۔ کب وہ اسے دیکھیں گی اور کب ہم اسے پریس میں بھیجیں گے یوں تو پرچہ بہت لیٹ ہو جائے گا حسن صاحب۔"

"اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کرن فاطمہ۔" وہ ایک بار پھر مسکرا کر بولے اون لکر کی سرکولیشن اتنی محدود ہے کہ پرچہ لیٹ ہو جانے پر بھی طوفان نہیں اٹھے گا شہر میں۔"

"آپ شاید ٹھیک کہتے ہیں۔" حسن کے مسلسل سرد رویے کو محسوس کر کے کرن نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا اب آپ کو غالباً کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپ آپ کی ترجیح وضعدار اور دوست دار مہرین کیانی نہیں مالدار بلال ظفر ہے جس نے یقیناً آپ کو آپ کے ہنر اور ٹیلنٹ کو پیسہ دے کر خرید لیا ہے اور آپ کی آنکھوں پر وہ پٹی چڑھا دی ہے جس کے پیچھے سے پرانے شناسا نظر نہیں آتے۔ آپ کے دماغ پر اس نے پیسے کی طاقت کا غرور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے' جس کی وجہ سے آپ کی کٹ منٹس اور ترجیحات بدل گئی ہیں' کوئی بات نہیں۔" کرن نے چبا چبا

کر الفاظ ادا کرتے ہوئے کہا "اس کارخانہ حیات میں لوگوں کا یہ شیوہ نیا نہیں' قلم اور قلمکار کے عرصۂ دراز سے بکنے اور خریدنے کی تاریخ رقم ہوتی رہی ہے مگر آپ..... آپ حسن کمال..... جس کے بارے میں کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ یوں اتنا ارزاں بک جائے گا اور یوں اپنے برے وقت کی ساتھی مہرین کیانی کا ساتھ چھوڑ جائے گا۔"

"لڑکی تم ابھی چھوٹی ہو اور باتیں بڑی بڑی کر رہی ہو۔" حسن نے بائیک پر بیٹھے بیٹھے کہا "تم اس میدان میں حادثاتی طور پر آئی ہو اور وہ بھی کچھ عرصہ پہلے ہی جبکہ ہمیں مدت ہوگئی اس کی خاک چھانتے، کیا درست ہے کیا غلط..... بکا کیسے جاتا ہے اور خریدا کیسے جاتا ہے، بکتا کون ہے اور خریدنے والا کون ہوتا ہے، یہ باتیں تم نے محض سن رکھی ہوں گی ہم نے ہوتی دیکھی ہیں اس لیے بہتر یہ ہے کہ بین السطور قیافے لگانے کا شوق ترک کر کے اچھے بچوں کی طرح اپنا کام کرتی جاؤ۔ اون لکر آج کل تمہاری کاوشوں کا نتیجہ ہوتا ہے، حسن کمال اس میں سے نکل بھی جائے تو کچھ خاص فرق نہیں پڑتا۔" انہوں نے ایک بار پھر بائیک کو کک لگائی اور اس کے اسٹارٹ ہونے پر راہگیروں کے درمیان سے گزرتے دور کہیں غائب ہو گئے۔ کرن فاطمہ کو محسوس ہوا کہ اس کا گلا گھٹ رہا تھا اور اسے شدت کی پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو چھوا جو نم تھیں اور پھر اپنے ہونٹوں کو جو خشک ہو رہے تھے اسے اپنا سر گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے ہمت کر کے کسی طرح جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہیے۔" اس نے سوچا اور اپنی بے جان ٹانگوں کو گھسیٹتی ویگن اسٹینڈ تک پہنچ گئی۔ اس رات اسے تیز بخار نے آلیا اور وہ اگلے تین روز تک دفتر نہیں جا سکی۔

.....o.....

شریف چاچا نے کلینک کے ریسپشن روم کی صفائی کے دوران دیوار گیر شیلفوں کی درازوں سے پرانے اخبارات اور رسالے نکالے اور انہیں ردی میں بیچ دینے کی نیت سے لے جانا چاہتے تھے شازیہ کچھ دیر قبل ہی ڈیوٹی پر آئی تھی اور اس نے حسب معمول اپنی اپائنٹمنٹ لسٹ چیک کرنے کے بعد اپنا رجسٹر تیار کر لیا تھا اور اب وہ شریف چاچا کو ان کے کام میں مشغول دیکھ رہی تھی۔

"نئے دن کا اخبار اسی دن کی شام کو اتنا پرانا اور بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے، ہر روز صبح لوگ نیا اخبار دیکھنے اور پڑھنے کو بے چین ہوتے ہیں اور شام ہونے تک اس اخبار کی خبریں باسی اور غیر اہم ہو چکی ہوتی ہیں۔" شازیہ نے اخبارات کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر اسے اسی ڈھیر میں

چند پرانے میگزین نظر آئے جو یقیناً وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی مگر اس وقت محض وقت گزاری کے لیے وہ انہیں نکال کر اپنے ٹیبل پر لے آئی۔ ہر رسالے میں تقریباً مخصوص قسم کی چیزیں شامل تھیں۔ ماڈلز کی تصاویر، شوبز نس کی خبوز، سیاسی شخصیات کے انٹرویو، فوڈ کارنرز، ہیلتھ اینڈ بیوٹی ٹپس، فیشن کے صفحات اس نے یونہی سرسری نظر سب میگزینز پر ڈالی۔

"یہ نیا رسالہ ہے شازیہ بی بی، میں نے آج ہی ڈاکٹر صاحب کے کمرے سے نکالا ہے اور یہ پرانے اخبار بھی۔" چاچا شریف نے ایک چیئر پر رکھے ہوئے چھوٹے سے ڈھیر میں رکھے ایک رسالے کو نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی پہلے پڑھ رکھا ہوگا میں نے چاچا شریف۔" شازیہ نے بے دلی سے رسالہ پکڑا مگر اس کا ٹائٹل دیکھ کر وہ چونک گئی۔ "یہ میگزین تو نیا لگتا ہے، میں نے نہیں دیکھا۔" اس نے شاید خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور رسالے کے صفحات پلٹنے لگی۔ "Exploring the history of the legends" اندرونی صفحات میں سے ایک کی شہ سرخی نے اسے چونکا دیا۔ یہ مضمون کسی معروف گائیک گھرانے کے متعلق تھا۔ شازیہ کو ان پرانے گلوکاروں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی جو کبھی راگ گاتے تھے اور ٹریفک کنٹرول کرنے والے کانسٹیبلوں کی طرح ہاتھ ہلاتے تھے۔ یہ گھرانہ بھی اسی قسم کے گائیکوں کا تھا۔ شازیہ کو انگریزی کی شدبد واجبی سی تھی گو اس نے اسپوکن انگلش کی کلاسز لینا شروع کر رکھی تھی۔ اس لیے اسے مضمون کے بھی بہت سے مندرجات سمجھ میں نہیں آئے تھے مگر جس چیز کو دیکھ کر وہ بری طرح چھونکی تھی وہ اس مضمون کے صفحات پر چھپی وہ تصویر تھی جس کے نیچے "Mahpara Begum the sole living inheritor of the family" کا کیپشن درج تھا۔

"ہائے....." اس نے فوری ردعمل ظاہر کیا "چاچا شریف، یہ تصویر دیکھیں ذرا۔" اس نے شریف چاچا کو قریب بلایا۔ "یہ وہی خاتون نہیں جو ادھر بھی آتی ہیں کبھی کبھی....." اس نے اپنے خیال کی تائید چاہی۔

"ہوں....." چاچا شریف نے میگزین اٹھا کر آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں تو ایک سے ایک بیبیاں آتی ہیں شازیہ بیٹا۔" انہوں نے اپنا چشمہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے کہا "کون سی بی بی ہے یہ؟" انہوں نے یاد کرنے کی کوشش کی "نہ" بہت غور کرنے کے بعد چاچا شریف نے حلق سے آواز نکالتے ہوئے کہا "اس بی بی کی شکل دیکھ کر یاد نہیں آ پا رہا اس بی بی کو

میں جانتا ہوں۔" اس نے ایک اور تصویر پر انگلی رکھی شازیہ نے تصویر کے نیچے دیکھا "شہ پارہ بیگم" اس کے نیچے درج تھا۔ "یہ بی بی اپنے وقتوں کی بڑی مشہور گانے والی تھی، ہم بھی ریڈیو پر اس کے گانے سنا کرتے تھے جب چھوٹے ہوتے تھے۔"

"یہ بی بی یاد کریں شریف چاچا، ادھر آتی....." شازیہ کی بات ڈاکٹر عبدالصبور کی آمد پر ان کے بہ آواز بلند السلام علیکم کہنے پر ادھوری ہی رہ گئی۔ شازیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے لاشعوری طور پر وہ میگزین ٹیبل سے اٹھا کر دراز کے اندر ڈال دی۔ ڈاکٹر صبور کی آمد کے ساتھ ہی روٹین کی مصروفیت شروع ہوگئی اور شازیہ کو وہ میگزین دوبارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس شام کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر جاتے ہوئے اسے وہ میگزین دوبارہ یاد آیا۔ اس نے جاتے جاتے اسے دراز سے نکال کر اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

اسی رات اس کی انگلی اس کے موبائل پر پہلی مرتبہ فیضان کا نمبر وبار ہی تھی "اس وقت تو میں چند دوستوں کے ساتھ ہوں تم سے کل بات کروں گا۔ اپنی چونکا دینے والی خبر سمیت میرے فون کا یا پھر خود میرا انتظار کرنا۔" فیضان نے جواب دیا۔

.....

"حسن صاحب نے آپ سے کیا بات کی میم؟" کرن نے پورے تجسس کے ساتھ اگلے ہی روز مہرین سے پوچھا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے وہ مجھ سے کیا بات کر سکتا ہے۔" مہرین نے الٹا سوال کیا۔

"یہی کہ وہ بلال ظفر کے ڈیلی کی جوائن کر رہے ہیں اور اون لکر کو چھوڑ رہے ہیں۔" کرن نے ایک ہی سانس میں وہ خدشہ ظاہر کر ڈالا جو گزشتہ ملاقات سے اسے ہولائے دے رہا تھا۔

"وہ ایسا کیوں کرے گا بھلا؟" مہرین نے میز کی سطح پر کہنیاں ٹکا کر ہاتھوں کے پیالے پر چہرے سے ٹکاتے ہوئے کہا۔

"میں نے کئی مرتبہ ان کو بڑے کینوس پر اپنی بات کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ اون لکر کو سرکولیشن والا میگزین قرار دیتے ہیں۔ وہ ایک ذہین اور پیدائشی صحافی ہیں۔ بلال ظفر اگر ان کے لیے موقع پیدا کرے گا تو یقیناً وہ اسے ضائع نہیں کریں گے۔" کرن نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اور مہرین کیانی کا چھوٹا سا کینوس کیا کرے گا پھر.....؟" مہرین سے یقیناً حسن نے کوئی

دل دکھا دینے والی بات کی تھی جبھی وہ اتنی مایوس اور بجھی بجھی نظر آ رہی تھی۔

''کچھ بھی نہیں کرے گے۔'' کرن نے سر ہلا کر کہا ''وہ بس اپنی ڈگر پر چلتا رہے گا کیونکہ اس کا نہ تو کسی سے مقابلہ ہے نہ ہی اسے کوئی ایوارڈ جیتنے کی تمنا ہے، اس کے قاری لوئر مڈل کلاس میں بھی موجود ہیں اور اپر کلاس میں بھی گو محدود ہی سہی مگر جن کو اون کر کے پڑھنا ہے وہ کوئی دوسرا میگزین نہیں پڑھیں گے۔''

''مجھے بچوں جیسی تسلیاں مت دو کرن فاطمہ، میں نوشتہ دیوار پڑھ رہی ہوں۔'' مہرین حد سے زیادہ مایوس نظر آ رہی تھی ''یہ میگزین لولا، لنگڑا ہی سہی حسن کمال کے سر پر چل رہا تھا ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ وہ اسے چھوڑ جائے گا تو ہم دونوں اسے کیا اور کتنا چلا سکیں گے؟''

''جتنا بھی، جیسا بھی ہم کوشش تو کر سکتے ہیں نا.....'' کرن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مہرین کو کس طرح تسلی دے سکتی تھی۔

''اب یقیناً اس دکان کو بڑھا دینے کا وقت آ گیا ہے ہم قسمت سے یقیناً نہیں لڑ سکتے۔ مہرین نے مایوسی کے سمندر میں تیرتے ہوئے ایک اور بات کہی۔

''ابھی جہانگیر کو نعیم کو لے کر میں مہ پارہ بیگم کی مشہور معروف حویلی جا رہی ہوں، چلیں دکان بڑھانے سے پہلے یہ خواہش تو پوری کر لینے دیں میں تو مارے اشتیاق کے پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔'' کرن نے اس کو ہنسانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے جاؤ..... یہ چابی لے لو گاڑی نیچے کھڑی ہے۔'' مہرین نے اس کی توقع کے خلاف فوراً اجازت دے دی۔

''یار رہے کہ ہماری ملاقات طے نہیں ہے ان سے، یونہی انکل پنچو جا رہے ہیں ہم۔'' کرن نے اسے یاد دلایا۔

''جو بھی ہے جاؤ بھی اب اس بار کا پرچہ تو نکالنا ہی ہے نا۔'' مہرین نے قدرے سنبھلتے ہوئے کہا۔

.....

وہ حویلی پرانی تھی، اس کا سن تعمیر تو خیر کہیں بھی درج نہیں تھا مگر طرز تعمیر سے اس کے زمانہ تعمیر کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا۔ کرن نے بڑے تجسس سے اس کے بیرونی دروازے کو دیکھا جو سیاہ لکڑی کے دو پٹ جوڑ کر بنایا گیا تھا اور اس پر کھدائی کا کام اتنی مہارت سے کیا گیا تھا کہ بنانے والے کو بے اختیار داد دینے کا دل چاہنے لگا تھا۔

''اس دروازے پر روایتی پھول بوٹے تو نہیں، اس پر تو کچھ اور ہی نقش و نگار ہیں۔'' جہانگیر جو ایسے فنون کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا بولا۔

''یہ کسی بادشاہ یا راجہ، مہاراجا کے زمانے کا میدان جنگ ہے غالباً جو اس دروازے پر نقش کیا گیا ہے۔'' کرن نے اس گدھے ہوئے نقش و نگار والے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'' یہ دیکھو یہ گھوڑوں کی فوج یہ پیادے اور یہ ہاتھیوں والی فوج کا منظر، ارے لگتا ہے کسی نے راجا پورس اور سکندر اعظم کا چنگ کا نقشہ بنایا اور اس دروازے پر دیکھو دریا کا کنارہ سا لگ رہا ہے، خوب بھئی خوب کیا آئیڈیا ہے۔'' کرن نے بے ساختہ کہا۔

''آپ تو بیرونی دروازے پر ہی عاشق ہو گئیں، اندر جا کر دیکھتے ہیں یہ حویلی اپنے اندر کیا دنیائیں سجائے کھڑی ہے۔'' جہانگیر نے پیتل کے کنڈے کو دروازے پر بجاتے ہوئے کہا۔'' کیا روایتی انداز سے دستک کا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

پانچ منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی سر پر پگڑی سجائے بر آمد ہوا ''جی حضور!'' اس نے ہاتھ باندھ کر پوچھا۔

''جہانگیر ذرا خیال رکھنا، میں گر ہی نہ جاؤں مجھے لگ رہا ہے کہ میں کسی ٹائم مشین میں بیٹھ کر پچھلی صدی میں چلی گئی ہوں۔'' کرن نے سرگوشی کے انداز میں جہانگیر سے کہا۔

''ماہنامہ اون لکر سے آئے ہیں۔'' جہانگیر نے انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں وزیٹنگ کارڈ آنے والے کو پکڑایا ''بیگم صاحبہ کی حسب ہدایت حاضر ہوئے ہیں۔''

''آپ کو حضور کچھ دیر زحمت کرنا پڑے گی انتظار کی، میں اندر سے دریافت کر کے ابھی حاضر ہوا۔'' آنے والے نے انتہائی مودب لہجے میں کہا اور سیاہ دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

''میں چشم تصور سے دیکھ رہی ہوں کہ اندر علی بابا چالیس چور والی مرجینا کا سا لباس پہنے خادمائیں موجود ہوں گی اور لمبی لمبی گردنوں والی صراحیاں اور قہوے کی پیالیاں۔'' کرن اپنی فینٹیزر بیان ہی کر رہی تھی کہ بڑی مونچھوں والا کسی جن کی طرح دوبارہ باہر آ گیا۔

''آیئے حضور، گو بیگم صاحبہ کے آرام کا وقت ہے لیکن آپ چونکہ حسب وعدہ آئے ہیں سو بیگم صاحبہ نے اندر آنے کی اجازت دے دی ہے۔'' وہ کہتا ہوا انہیں اندر لے آیا۔ ایک نیم تاریک دیوڑھی جس کے دائیں بائیں ایک ایک کمرے کے دروازے کھل رہے تھے، سے گزر کر وہ ایک وسیع صحن میں نکل آئے۔ صحن کے ایک طرف چھوٹا سا باغیچہ تھا جس پر پھلائی بہار اپنے جوبن پر تھی۔ باغیچے کے وسط

میں سنگ مرمر کا تخت سا بنا تھا۔ وسیع صحن میں سرخ اینٹ کا فرش تھا ایسی نفیس اینٹ جواب شاید کہیں بھی نہیں بنتی تھی۔ موٹچھوں والے شخص نے صحن کے اس پار ہی ان کو دو خواتین کے حوالے کر دیا۔

''اختری اور بسنتی، یہ بیگم صاحبہ کی خصوصی مہمان ہیں، نشست گاہ میں بٹھاؤ بیگم صاحبہ ابھی تشریف لاتی ہیں۔''

کرن اور جہانگیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بہ مشکل تھوک نگلا اور ان دونوں خواتین کی ہمراہی میں صحن عبور کر کے ایک بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرا جدید، قدیم آرٹ کا مرقع تھا۔ جس میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ وہ دونوں جوتے اتار کر ایرانی قالین پر بچھی سفید چاندیوں والے فرش پر مخمل کے غلافوں سے سجے گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور چاروں دیواروں کو منہ اٹھا کر دیکھنے لگے۔ روغنی پینٹنگز، آبدار تلواریں، آرائشی ظروف اور دستکاریوں کے نمونوں سے سجی وہ دیواریں اور وہ کمرا کتنا مختلف اور کتنا منفرد لگ رہا تھا۔ یہ وہ دونوں ہی بتا سکتے تھے۔ وہ دونوں جدید دور کے نیچکل نوجوان تھے مگر اس کمرے کی سجاوٹ میں ایسا رعب دبدبہ تھا کہ دونوں ہی مرعوب ہوئے گنگ بیٹھے تھے۔

نہ جانے وہ خود کیسی ہوں گی؟'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد کرن نے اس سکوت کو توڑا۔

''مجھے تو خوف سا محسوس ہو رہا ہے نہ جانے ہمیں اس حویلی کے مکینوں جیسے لوگوں سے بات کرنے کی تمیز بھی ہے یا نہیں.....'' جہانگیر نے خیال ظاہر کیا۔

''اس حویلی میں بھی اسے سلیبریٹیز بسنت مناتے ہوں گے کیا؟'' کرن نے کہا۔

''پتا نہیں لیکن لگتا ہے کہ ابھی پی ٹی وی یا کسی پرائیوٹ چینل والے کی نظر نہیں پڑی اس پر ورنہ اب تک دسیوں شامیں اور راتیں منعقد ہو چکی ہوتیں اس میں۔'' جہانگیر نے جواب دیا۔

''تم نے چھت کی جالیاں دیکھی ہیں اور جھروکے اور ستون اور شطرنج کی بساط کا سا فرش اور ان ملازمین کے آداب میزبانی مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔'' کرن نے مرعوب لہجے میں کہا۔

''آداب عرض ہے۔'' اسی دم کمرے کے ایک کونے سے آواز آئی۔ ان دونوں نے چونک کر دیکھا اور یکدم کھڑے ہو گئے۔ ان کے سامنے ڈھلتی عمر کے باوجود ایک حسین رعب دار خاتون کھڑی تھیں۔ سلور گرے بالوں پر دوپٹا ڈالے، انگوری پاجامے اور سفید کرتے میں ملبوس پاؤں کھسوں میں مقید تھے۔ کرن نے نظر اٹھا کر ان کے گلے میں پڑے کنٹھے کو دیکھا اور پھر ان کے

ستواں ناک میں چمکتی ہیرے کی رنگ کو۔

''اوہ خدا، یہ میرے سامنے موجود ہیں زندہ..... مجسم۔'' اس کے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا'' اوہ چاچا میاں، اور آپ کے چچا جو اُن کے مداح تھے دیکھیں میں ان کے کتنے قریب موجود ہوں کتنے قریب.....'' اس نے تصور میں چاچا میاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تشریف رکھیے۔'' ان کا لہجہ سرد تھا مگر وضعداری کا دامن مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ دونوں روبوٹس کی طرح بیٹھ گئے۔

''آپ کا تعلق کس جریدے سے ہے؟'' انہوں نے اوپر کو اٹھی ہوئی اپنی ستواں ناک ذرا مزید اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''اون لکر جی..... یہ کارڈ اور یہ میگزین۔'' جہانگیر منمنایا۔

''جو صاحبزادے پہلے آئے تھے ان کا نام بھی کچھ اور تھا اور حلیہ بھی۔'' انہوں نے اب کے کرن کو مخاطب کیا۔

''جی.....'' کرن نے گلا کھنکھارا اور سیدھی ہو کر بیٹھی۔ ''حسن کمال ہمارے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر ہیں اور اس مضمون کے سلسلے میں وہی آپ سے اس سے پہلے ملے تھے، لیکن آج کل وہ کچھ اہم کاموں میں مصروف ہیں۔ میرا مطلب ہے کچھ اہم ذاتی کام ہیں لہٰذا حسب وعدہ ہم دونوں یہاں آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔''

''جی فرمایئے پھر، کیا لائے ہیں آپ؟'' کرن نے محسوس کیا کہ وہ اگرچہ کچھ بیزار سی تھیں مگر اپنی وضعداری نبھانے کی خاطر خاصی مروت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس نے چند کاغذات سمیت ایک فائل اُن کی طرف بڑھا دی۔

''آپ مختصر اپنی بات جو اس میں لکھی ہے بتا دیجیے، اس وقت میرا چشمہ میرے پاس نہیں ہے۔'' انہوں نے فائل پکڑے بغیر کہا۔ جہانگیر اور کرن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''اس بار مضمون کا زیادہ تر حصہ شہ پارہ بیگم یعنی آپ کی والدہ کے فن کے بارے میں ہے، خصوصاً کلکتہ میں منعقد ہونے والے سنگیت سمیلن میلے میں ان کی شرکت اور ٹھمری اور دادرا کے فن میں ان کی عظیم الشان پیشکش جس کے نتیجے میں انہیں نشانِ سنگیت سے نوازا گیا۔''

''اس کانفرس میں نشانِ سنگیت انہیں ٹھمری اور دادرا سنانے پر نہیں آساوری راگ کے مظاہرے پر ملا تھا۔'' مہ پارہ بیگم نے تصحیح کروائی ''راگ آساوری صبحدم کا راگ ہے اور انہوں نے

یہ مظاہر سمجھ میں ہی کیا تھا۔"

"آپ اس راگ کے بارے میں کچھ اور بتائیں گی؟"

"اس راگ کے سر فضا کی لہروں سے متعلق ہیں، فطرت کی مادرائی قوتوں کی باگیں اسی راگ کے ہاتھ میں ہیں اور اس کی روح کنول کے پھولوں سے نمودار ہوتی ہے۔ اس راگ کی دیوی کا لباس کیسری ہوتا ہے جس میں بھبوت ملی ہوتی ہے۔" کرن نے دیکھا یہ بات کرتے ہوئے مہ پارہ بیگم کے لہجے اور چہرے میں بے زاری کا شائبہ نہیں رہا تھا، وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں انہیں مختلف راگوں اور راگنیوں کے متعلق بتا رہی تھیں۔

"حکومتِ پاکستان کی طرف سے ان کے فن کو پذیرائی نہیں ملی، اس کی کیا وجہ ہے؟" کرن نے پوچھا۔

"جن کے فن کو حکومت کی طرف سے پذیرائی ملی، وہ کن حالوں میں جیتے ہیں آپ تو سحابی ہیں آپ سے بہتر کون جانتا ہوگا۔" وہ قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"کیا اسی وجہ سے انہوں نے میوزک کانفرنسز چھوڑ کر نجی محفلوں میں گانا شروع کر دیا اور تمغات اور اعزازات کی دوڑ سے باہر نکل گئیں۔"

"تمغوں اور اعزازات سے زیادہ اہم پیٹ کی بھوک ہوتی ہے بیٹا، بھوکے پیٹ بڑے سے بڑا فنکار بھی اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ یہ پیٹ کی بھوک ہی ہے جس نے اس ملک عزیز کے کئی فنکار ضائع کر دیے، حکومتی سرپرستی کے بغیر فن کا زندہ رہنا مشکل ہوتا ہے اور حکومت وقت کی سرپرستی زیادہ تر ان کو زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے جو فنکار نہیں ہوتے، ہاں انہیں حالات کے مطابق جینے اور آگے بڑھنے کا فن ضرور آتا ہے۔ آج تم لوگ جس شہ پارہ بیگم کو لپیٹ آف میوزیکل ورلڈ قرار دینے کی کوشش کر رہے ہو جیتے جی ان کا یہ حال تھا کہ امرا اور روسا کی محافل میں فن کا مظاہرہ کر کے کماتی تھیں اور رات کو بستر پر پڑے پڑے آنسو بہاتی تھیں کہ یہ وہ وقت تو نہیں تھا جس کا تصور انہوں نے کیا تھا۔"

"اور مہرو جان وہ جو آپ کے ساتھ ہوتی تھیں انہیں تو حسن کارکردگی کا تمغہ بھی دیا گیا وہ کیوں یوں کسمپرسی کی حالت میں جیتی رہیں۔" کرن نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ مہ پارہ بیگم اس سوال پر بری طرح چونک گئیں۔

"تم لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ کسمپرسی میں جیتی رہیں، اسی....." انہوں نے انگلی کا اشارہ

کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا "اسی حویلی میں زندگی کے آخری ایام گزارے ہیں انہوں نے ٹھاٹ سے شان بان سے۔ اعلیٰ افسران نہ سہی ہم جیسے غریب تو تھے ان کی قدر دانی کے لیے، مہرو جان نے ایک شاندار زندگی گزاری۔ ان کے فن کو پزیرائی بھی ملی، مگر جس تمغے کا ذکر تم کر رہی ہو اسی کے حصول کے بعد تو ڈاؤن فال آیا ان پر۔ ان کی ضرورتیں وہ تمغہ نہیں پورا کر سکتا تھا، نتیجتاً خناس میں کوڑیوں کے مول بک گیا۔ یہ دنیا ہے بٹیا رانی یہاں شاہ کو گدا ہوتے اور گدا کو شاہ ہوتے دیر نہیں لگتی مگر اس معاشرے میں قدر دانی کے مستحقین کی جس طرح ناقدری ہوتے ان آنکھوں نے دیکھی ہے وہ شاید کسی اور معاشرے میں نظر نہ آئے۔ یہ لوگ، یہ دنیا والے نہیں وہ اوپر بیٹھا خدا ہے جو مسبب الاسباب ہے میری والدہ کا انتقال ہوا اور میں مہرو جان کے در پر جا پڑی، مہرو جان بیماری اور ضعیفی کے باعث فن کے مظاہرے سے محروم ہوئیں، وہم کے ساتھ دام کا ساتھ ہوا، اللہ والی بی بی تھیں، دینے والا ہاتھ عطا ہوا تھا عمر بھر کی زکوٰۃ ہاتھ سے دی ہوئی کام آئی۔ اسی خدا نے مہرو جان کو ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے بچا کر اس حویلی میں لا اتارا، اس شان سے اس حویلی سے جنازہ اٹھا ان کا کہ کیا اپنے کیا پرائے سب ہی حیران ہوئے شریک بھی ہوئے مگر وہ اس دنیا کے بنے ہوئے نا خدا وہ تمغے نواز کر تصویریں کھنچوانے والے سب سوئے پڑے رہے، ایک عظیم فنکارہ مری کہ چیونٹی کسی کو خبر نہ ہوئی۔ یہی حال میری والدہ کا رہا۔ یہی حال میرا ہونے والا ہے نہ اس تمغے نے مہرو خالہ مرحومہ کو گمنامی سے بچالیا، نہ تمغوں سے محرومی نے میری والدہ کی روزی کم کی۔ یہ سب قدرت کے رنگ ہیں مگر شو بازی، سستی شہرت اور نام کی عزت کمانے والے عبرت حاصل نہیں کرتے، یہ ان کا مقدر ہی نہیں ہے۔"

"یہ..... میرا مطلب ہے یہ ساری بات لگا دیں جی۔" کرن نے خوفزدہ سے لہجے میں پوچھا۔

"لگاؤ" انہوں نے اپنا دوپٹا درست کرتے ہوئے کہا "ضرور لگاؤ پہلے تو میں اپنے گھرانے پر کسی قسم کا لفظ لکھا دیکھنے کی روادار نہیں تھی لیکن اب اگر تصویر کا ایک رخ منظر عام پر آ ہی گیا ہے تو یوں ہی سہی۔ اب میں چاہوں گی کہ جو ہم پر گزری وہ بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچ ہی جائے۔ ہمارے عصر وہ لوگ جواب بھی گردن ٹیڑھی کیے بیٹھے ہیں انہیں کان ہی ہو جائیں کہ جن کا حق مار کر وہ اس فن کے تنہا تمابنے بیٹھے تھے ان کو نہ صرف بات کرنی آتی ہے بلکہ وہ حوصلہ بھی رکھتے ہیں بات کو بیان کرنے کا یہ اور بات ہے کہ خدا نے انہیں اتنی بے نیازی عطا کر رکھی ہے کہ نظر کے سامنے ہوتے تماشے دیکھ کر بھی خاموش رہے۔"

"یہ کچھ پرانے ریکارڈ ہیں آپ کی والدہ مرحومہ کے۔" کرن نے چند ریکارڈز ان کو دکھاتے ہوئے کہا "یہ میرے چامیاں یعنی میرے چچا کو ان کے چچا سے ملے تھے اور اب تک ان کے پاس محفوظ ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ان کو سی ڈیز پر منتقل کرلیا جائے اس کی رائلٹی آپ کو مل جائے گی کمپنی بلا معاوضہ......"

"بٹیارانی، ہمیں رائیلٹیز اور معاوضوں سے نہ تو کبھی غرض رہی ہے نہ ہی کبھی ان کی چاہ ہوئی ہے ہم ایسے غرض مند ہوتے تو فن موسیقی کے جو خزانے ہمارے پاس موجود ہیں منہ مانگی قیمت پر نیلام کر چکے ہوتے، مگر اس دنیا کے شریفوں کے وتیرے دیکھ کر خاموش رہنے اور کنارہ کشی میں ہی عافیت جانی۔" انہوں نے ریکارڈ کورز کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔ یقیناً اپنی والدہ کی تصویریں اور ریکارڈز کے ٹائٹل دیکھ کر ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اس مضمون کی اصل محرک تم ہی ہوگی۔" پھر انہوں نے سر اٹھا کر کہا "چلو میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ تمہارا جو دل آئے ان کے ساتھ کرو، اور جیسا چاہے لکھ ڈالو، کیونکہ تمہارا تعلق ایسے خاندان سے نظر آتا ہے جو قدر دان بھی ہے اور فن شناس بھی۔ ہو سکے تو اپنے چچا سے میری ملاقات ضرور کروانا۔" کرن ان کے نرم لہجے اور اپنے لیے شفقت دیکھ کر دم بخود ہوگئی۔ "واہ چامیاں آپ کے کمال!" اس نے دل میں کہا۔

"میں آپ کو ان سے ضرور ملواتی مگر بدقسمتی سے وہ جب سے ایک حادثے میں بصارت سے محروم ہوئے ہیں انہوں نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔" اس نے کہا۔

"اوہ، بہت افسوس ہوا۔" مہ پارہ بیگم نے بے ساختہ کہا "چلو، کوئی بات نہیں یہ کوئی ایسی وجہ نہیں کہ ملاقات نہ ہو سکے تم اپنے گھر کا پتا مجھے لکھ کر دے دو۔ میں خود ان سے ملنے چلی آؤں گی۔"

"ارے، کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" کرن کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"تم لوگ چائے پیو۔" پھر انہوں نے ملازمہ...... کی لائی ہوئی طشتریاں سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ وہ چائے انتہائی پر تکلف تھی اور نفیس انداز میں پیش کی گئی تھی۔ کرن کا دل اسی ماحول میں رہنے کو چاہنے لگا۔

"ہم ماڈرن دنیا کے جدید لوگ کتنے خسارے میں ہیں۔" اس نے واپسی پر جہانگیر سے کہا "ہمارے پاس وقت کی تنگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے لیکن اس سیاہ منقش دروازے کے پیچھے زندگی کتنی مختلف پر سکون اور لطیف ہے۔"

"ہم خوش قسمت ہیں کہ اس تہذیب اور اس زندگی کی ایک جھلک دیکھ آئے ہیں اور میرے کیمرے نے تو اس کے کئی رخ محفوظ بھی کر لیے۔" جہانگیر نے کہا "ویسے بھی یہ تو معجزہ ہی ہو گیا، میری ٹانگیں تو اُن خاتون کی پہلی جھلک دیکھتے ہی کپکپانے لگی تھیں مگر تم نے تو کوئی خاص جادو کر دیا ان پر جو وہ یوں مہربان ہو گئیں ہم پر اور اپنی حویلی کا گوشہ گوشہ بھی دکھا دیا ہمیں۔"

"ان سچے فنکاروں کو سچے قدر دانوں کی پہچان ہوتی ہے، میرے چامیاں کے جمع کیے ہوئے ریکارڈز اور معلومات دیکھ کر ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم محض اون لکر کی پروموشن کی خاطر ہی نہیں واقعی ان کا نام زندہ کرنے کے لیے یہ مضمون لکھ رہے ہیں۔" کرن نے جواب دیا۔

اس کے بعد کئی روز تک کرن مہ پارہ بیگم سے اپنی اس ملاقات کے سحر سے آزاد نہیں ہو پائی۔ وہ خواب میں بھی خود کو اس حویلی میں موجود پاتی۔ والان، دروالان، شہ نشین، محرابی اور ہشت پہلو ستون، کیا ٹھاٹھ ہیں اور کیا شان۔ وہ سوچتی کیا جدید طرز تعمیر میں چاروں موسموں کی مناسبت کا خیال رکھا گیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ جدید ماہر تعمیرات اب اسی قسم کے گھر بنا رہے تھے جن کا آرکیٹیکچر پرانی حویلیوں کا سا تاثر دیتا تھا مگر وہ گھر نہ تو اتنے کشادہ ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اتنے پر سکون۔ یہ اس کا خیال تھا جس کے بارے میں اس کا اندازہ تھا کہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔

......✿......

"ہیلو...... کیا میں مس سمعیہ سلطانہ سے مخاطب ہوں؟" سمعیہ نے اپنے موبائل پر آنے والی کال کو سنا۔

"جی فرمائیے۔ آپ کون؟" ذاس نے پوچھا جبکہ اس کا خیال تھا کہ اس کا کوئی نیا نیا پرستار ہی یوں فون کر سکتا تھا۔

"میرا نام حسن کمال ہے جی، میں ایک صحافی ہوں اور آپ کے کام کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، کیا آپ مجھے تھوڑا ٹائم دے سکیں گی؟" سمعیہ کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا۔

"میرا تعلق ماہنامہ اون لکر سے رہا ہے، شاید آپ کی نظروں سے گزرا ہو۔" دوسری جانب سے مزید تعارف کروایا جا رہا تھا۔ سمعیہ کا دم رکنے لگا "اتنی جلدی، اتنی جلدی......" سمعیہ کا دل کہہ رہا تھا اس کو جس موسم جس وقت کی آمد کا انتظار تھا وہ اس قدر جلد آ گیا ہے۔ اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔

......✿......

''مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ وہ ماضی کی ایک مغنیہ ہیں اور سلمان کے بارے میں ڈاکٹر عبدالصبور کے پاس کچھ ڈسکس کرنے یا پھر شاید اس لیٹسٹ صورت حال معلوم کرنے آتی ہے، یہ کیا اسرار ہے بھئی۔'' فیضان مقصود نے شازیہ سے یہ نئی بات سن کر الجھتے ہوئے کہا۔

''میری سمجھ میں خود بھی یہ بات نہیں آئی، آخر ان کا سلمان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟'' شازیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اس امکان کو تو کسی طور پر بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ تعلق تو ضرور ہے ان کا اس بات کا کہ سلمان، ڈاکٹر عبدالصبور کے زیر علاج ہے۔'' فیضان نے خیال ظاہر کیا۔

''یقیناً..... مگر یہ تعلق کیا ہے؟'' شازیہ نے کہا ''جس قدر اس میگزین کے آرٹیکل سے مجھے ان کے متعلق معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق وہ ماضی کی ایک ایسی گلوکارہ ہیں جو زمانے کی ناقدر شناسی کا شکار ہو کر گم نام ہو کر رہ گئیں۔ صرف وہی نہیں ان کی والدہ اور نانی بھی گلوکارہ ہی تھیں یعنی یہ ایک فنکار گھرانہ تھا۔'' فیضان یہ بات سن کر مزید الجھ گیا۔

''میں جتنا بھی غور کروں مجھے اس معاملے کا کوئی سرا ہاتھ آتا معلوم نہیں ہوتا، میرا خیال ہے کہ میں ڈاکٹر عبدالصبور سے خود ہی پوچھ لوں۔'' اس نے کہا۔

''پلیز!'' شازیہ نے التجائیہ انداز میں کہا ''یہ نہ کیجئے گا، میری نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو کلینک کے معاملات باہر کسی سے ڈسکس کرنا سخت ناپسند ہے۔''

''ضروری تو نہیں کہ ان سے کچھ پوچھنے کے دوران تمہارا ذکر بھی آئے، بات کرنے کے کئی ڈھنگ ہو سکتے ہیں۔''

''ایسا ممکن نہیں ڈاکٹر عبدالصبور بہت ذہین انسان ہیں وہ ضرور اس بات کی کھال اتاریں گے اور اس کی تہہ تک پہنچ جائیں گے۔'' شازیہ نے اپنے دل کا خوف ظاہر کیا۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو کہ مجھے کیسے بات کرنی ہے، یہ یقین رکھو کہ اس میں تمہارا ذکر ہرگز نہیں آئے گا۔'' فیضان نے اپنا موبائل اور گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ دونوں کلینک کے قریب ایک چھوٹے سے ریستوران میں بیٹھے تھے۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں شازیہ تم نے میرے کہنے پر اور میرے لئے ان خاتون کے دیر اباؤٹس ڈھونڈ نکالے۔'' فیضان نے اخلاقاً کہا۔

''میں نے ایسا ارادہ کر کے نہیں کیا بلکہ اتفاقاً ہی ایسا ہو گیا۔'' شازیہ نے سادگی سے کہا ''اگر چاچا شریف اس روز وہ میگزین نہ نکالتے تو مجھے بھی کہاں معلوم ہوتا۔''

''تم بتا رہی تھیں کہ اس آرٹیکل کے آخر میں To be Continued لکھا تھا۔'' فیضان کو یاد آیا۔

''ہاں۔'' ''مجھے وہ میگزین دے دو اور یہ بتاؤ کہ وہ کس ماہ کا پرچہ تھا تاکہ میں اس سے اگلا پرچہ تلاش کر کے اسے بھی پڑھ سکوں۔'' فیضان نے کہا۔

''وہ میگزین کلینک میں ہی پڑا ہے میرے ٹیبل کی دراز میں، ابھی لے لیں۔'' شازیہ نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ کلینک کا ٹائم شروع ہونے میں پانچ دس منٹ ہی باقی تھے اور اب اس کا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ وہ فیضان کے ساتھ ہی ریستوران سے باہر نکلی۔ کلینک پر اس وقت حسب معمول چاچا شریف کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ شازیہ نے ٹیبل کی دراز کھول کر میگزین فیضان کے آگے رکھ دیا۔ وہ اسے کھول کر اسی کے بتائے ہوئے صفحات دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھول کر ڈاکٹر عبدالصبور کی پہلی کلائنٹ اندر داخل ہوئیں۔ اس وقت تک شازیہ نے اس دن کی کلائنٹ لسٹ چیک نہیں کی تھی۔

.....o.....

''مجھے یہ جان کر مزید مسرت ہوئی کہ آپ سے میرا دور کا ہی سہی رشتے داری کا کوئی تعلق بنتا ہے۔ میں تو آپ کی والدہ سے مل کر حیران رہ گیا ابھی کچھ عرصہ قبل ہی ان سے میری ملاقات آپ

کے پرانے گھر میں ہوئی تھی۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ان کی بیٹی ہیں۔'' سمعیہ سلطانہ کے سامنے بیٹھا حسن کمال کہہ رہا تھا اور سمعیہ سلطانہ اس کی باتیں سنتی دل ہی دل میں حیران ہو رہی تھی اس کا خدا کی قدرت پر یقین مزید مضبوط ہونے لگا تھا۔

''آپ کا پہلا ڈراما گو ابھی آن ایر نہیں گیا لیکن آپ کا نام زبان زد عام ہو گیا اور لوگ آپ کے ٹیلنٹ کے معترف ہونے لگے ہیں، ایسا بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔'' سمعیہ سلطانہ جو اب تک صحافیوں سے گفتگو کے کچھ ڈھنگ سیکھ چکی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص کی باتوں کا کیا جواب دے۔ اسے اپنی زبان گنگ ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں یہاں آیا تو اپنے اخبار کے شوبز بنس پیج کے لئے آپ کا مختصر تعارف لینے تھا لیکن یہاں آ کر آپ کے ساتھ اپنے دور کے ہی سہی تعلق کا علم ہونے پر مجھے خیال آ رہا ہے کہ آپ کو اس ابتدائی اسٹیج پر تھوڑی سے گائیڈ لائنز دے دوں۔ آپ برا تو نہیں منائیں گی۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''پلیز، آپ بتائیں۔'' سمعیہ سلطانہ نے بہ مشکل یہ الفاظ کہے۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ شخص جو اس کی رسائی سے باہر..... بہت دور نظر آتا تھا۔ وہ بلند، منفرد اور اعلیٰ محسوس ہوتا تھا وہ جو اتنے سالوں سے اسے خوابوں میں نظر آتا تھا وہ شخص اتنا قریب بیٹھا تھا کہ چاہتی تو ہاتھ لگا کر اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتی تھی اور وہی شخص اس کی عزت افزائی کر رہا تھا، اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور اسے ایسی ٹپس بتا رہا تھا جو آگے چل کر اس کے کام آنے والی تھیں۔ یہ بتانے اور سمجھانے وہ خود چل کر اس کے گھر آیا تھا۔ سمعیہ سلطانہ کو خود پر ناز سا محسوس ہونے لگا۔ وہ حسن کمال کی باتیں کم سن رہی تھی اپنے دل کی سرگوشی میں زیادہ جلا تھی۔

''یہ سب باتیں جو میں آپ کو بتا رہا ہوں، یہ ایسے تجربات ہیں جن سے عنقریب آپ خود بھی گزرنے والی ہیں، میں ان سے محض اس لیے واقف ہوں کہ میں ان سے گزر چکا ہوں اور مجھے وقت اور تجربات نے سکھایا ہے کس موقع پر انسان کو کیسا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ آپ ابھی اس میدان میں نو وارد ہیں مجھے امید ہے کہ میری بتائی ہوئی باتیں ضرور آپ کے کام آئیں گی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''مثلاً.....؟'' سمعیہ سلطانہ نے اپنی بھاری پپوٹوں والی غلافی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''مثلاً.....'' وہ ہولے سے ہنسا، یقیناً وہ سوچ رہا ہوگا کہ بی بی پچھلے آدھے گھنٹے میں مختلف باتیں تمہیں سمجھا چکا ہوں تم کہاں کھوئی ہوئی ہو جو تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''صحافت کو فورتھ اسٹیٹ کہا جاتا ہے آپ کو معلوم ہے؟'' اس نے دوبارہ سے پہلے کبھی بات کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے یہ معلوم ہے کہ صحافیوں کے پاس کوئی ایسی غیر مرئی طاقت ہوتی ہے جس کے بل پر وہ کسی بھی شخص کو آسمان پر بٹھا سکتے ہیں اور کسی آسمان پر بیٹھے شخص کو زمین کی پستیوں میں بھی اتار سکتے ہیں۔'' سمعیہ سلطانہ نے اپنے خیالات جھٹک کر الرٹ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ممکن ہو جاتا ہے؟'' حسن کمال نے دوسرا سوال پوچھا۔ سمعیہ سلطانہ کے جواب نہ دینے پر وہ خود ہی بولا۔

''کیونکہ ان کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے اور لکھنے کے لیے کالم اور خبریں۔ وہ اکثر نہیں کبھی کبھار ہی سہی منظر عام پر آئے شخص پر قلم کی سیاہی کے چھینٹے اڑا دیں تو ان کا کچھ نہیں بگڑتا مگر جس شخص پر وہ یہ چھینٹے اڑا دیتے ہیں اس کا بہت کچھ بگڑتا ہے، ان چھینٹوں کے داغ میں بہت وقت لگ جاتا ہے اور کبھی کبھار تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ یہ داغ دھو ہی نہیں پاتا عمر بھر اور اس کی شخصیت لیبل ہو کر رہ جاتی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ منظر عام پر آنے والی شخصیات کو صحافیوں سے ڈر کر رہنا چاہیے۔'' سمعیہ سلطانہ نے سادگی سے پوچھا۔

''وہ رہتے ہیں، انہیں رہنا پڑتا ہے۔'' حسن نے مسکرا کر جواب دیا ''ایک عام قاری کی حیثیت سے آپ یہ تو جانتی ہوں گی کہ آپ کی پسندیدہ ترین ایسی ہستی جو منظر عام پر رہتی ہو اس کا امیج آپ کے ذہن پر ان ہی انٹرویوز، خبروں اور مضامین نے بنایا ہوگا جو اس شخصیت کے بارے میں لکھے اور شائع کیے گئے۔''

''جی بالکل!''

''تو پھر آپ کو اتنا ادراک تو ہونا چاہیے کہ لکھنے والا چاہے تو اس شخصیت کا بہتر امیج بنا دے، چاہے تو اسے بگاڑ دے کیونکہ اس کا لکھا اثر رکھتا ہے۔''

''یہ بھی صحیح ہے۔''

''تو بس، یہ بات نوٹ کر کے رکھ لیجئے کہ اس میدان میں سروائیو کرنا ہے تو پھر پروڈیوسرز، ڈائریکٹر کے ساتھ ساتھ صحافیوں کے ساتھ بھی بنا کر رکھنا ہوگی۔''

"ایسا کرنے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟" سمعیہ سلطانہ نے معصومیت سے پوچھا۔

"اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہی صحافیوں میں سے ایک آدھ کو اپنا مستقل پروموٹر بنالیا جائے، ایسا ایک ہی بندہ کافی ہوتا ہے کیونکہ صحافت بھی ایک انٹر لنکڈ نیٹ ورک ہے۔ ایک تگڑا اور مانا ہوا صحافی خاصا اثر رکھتا ہے اور اس کا اثر قبول بھی کیا جاتا ہے۔"

"ایسا صحافی کیسے ملتا ہے؟" سمعیہ سلطانہ نے سادگی اور بھولپن نے حسن کو مزید مسکرانے پر مجبور کردیا۔

"اگر آپ قبول کریں تو آپ کو تو مل بھی چکا۔" اس نے کہا۔

"ارے، وہ کیسے؟" سمعیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ایسے.....!" حسن نے سر جھکا کر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ار......رے۔" سمعیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا ایسا تو وہ خواب میں بھی سوچ نہیں سکتی تھی۔ حسن کمال ایسا ٹیلنٹڈ اور ذہین صحافی اس کا پروموٹر بن سکتا تھا۔ وہ شخص جس کی سوچ اور تحریر ہی اتنی اونچی ہوتی کہ عام قاری کے فہم میں نہیں آسکتی تھی وہ شخص آرٹ کی دنیا میں اس کو متعارف کروائے گا تو کیا اس کے کیریئر کو چار چاند نہیں لگ جائیں گے۔ انکار کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس روز سمعیہ سلطانہ اور حسن کمال کے درمیان ایک خاموش معاہدہ طے پا گیا۔

......•......

مہ پارہ بیگم کے بارے میں لکھے جانے والے مضمون کی دوسری قسط خالصتاً کرن فاطمہ کی انفرادی کوشش کا نتیجہ تھی۔ مضمون لکھے جانے، پروف ریڈنگ اور پرچہ پریس میں جانے کے دوران بھی مہرین کیانی حسن کمال کا انتظار کرتی رہی لیکن اب یہ خبر کنفرم ہو چکی تھی کہ حسن کمال، مہرین کو آگاہ کیے بغیر بلال ظفر کا نیا اخبار آبزرور جوائن کر چکا تھا۔ بلال ظفر کا پیسہ اور حسن کمال کا تجربہ مل کر کوئی معرکے کی چیز سامنے لانے والے تھے۔ اس اخبار کا مستقبل کیا ہوسکتا تھا یہ بات ابھی غیب میں تھی لیکن حسن کمال یقیناً اس ڈیل سے فائدہ میں رہا تھا، اپنے ماموؤں کے مکان کا وہ سیڑھیوں والا بوسیدہ کمرہ چھوڑ کر اس نے ایک خوبصورت گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں بطور پے انگ گیسٹ رہنا شروع کردیا تھا۔ اس کے لباس اور ظاہری وضع قطع میں زمین آسمان کا فرق آچکا تھا اور اب وہ پہلے سا حسن کمال قطعی نہیں لگتا تھا۔ یہ ساری خبریں انہیں ادھر ادھر سے ہی ملتی تھیں خود حسن کمال نے اب تک ان میں سے کسی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

کرن فاطمہ کو مہرین کا مایوس چہرہ تکلیف دیتا تھا لیکن وہ اس سلسلے میں اسے کوئی تسلی نہیں دے سکتی تھی سوائے اس کے کہ وہ اپنی ہمت سے زیادہ اون لکر کے لیے محنت کر کے اس نے پرچے کے فنانشل معاملات بھی اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ ایک دو نئے لڑکے بھی اس نے اپائنٹ کرلیے تھے اور اب وہ سب کے سر پر کھڑی ہو کر کام کروا رہی تھی۔ یقیناً اس کی اتنی محنت اور توجہ نے اون لکر میں نئی روح پھونک دی تھی مگر مہرین کیانی کے لیے حسن کمال کا اون لکر چھوڑ جانا یقیناً ایک اچانک اور بڑا صدمہ تھا۔ جس پر وہ فی الحال خاصی رنجیدہ تھی۔ کرن نے عمیر بھائی کی مدد سے مہ پارہ بیگم کے ریکارڈز کی سی ڈیز بنوانے کے لیے ایک کمپنی سے معاہدہ بھی کرلیا تھا مہ پارہ بیگم کی ہدایت کے مطابق ان سی ڈیز کی رائلٹی ایس او ایس ولیج کو دی جانی تھی۔ حیرت انگیز طور پر ان سی ڈیز میں کئی پارٹنرز کو دلچسپی پیدا ہو رہی تھی اور وہ ان سی ڈیز کے تیار ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ یہ سب خبریں سن کر اس روز مرزا صاحب اور حکیم صاحب، مہ پارہ بیگم کے پاس آئے اور ان سے اس نئی پروگریس کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

"یہ روزہ کیسے ٹوٹا عمر بھر کا یہ سمجھ میں نہیں آیا بیگم صاحبہ؟" حکیم صاحب کہہ رہے تھے۔

"ایک روز آپ نے ہی کہا تھا حکیم صاحب کہ نوجوان نسل ذہین بھی ہے اور سمجھ دار بھی، یوں سمجھ لیجیے کہ اس ذہین اور سمجھ دار و جوان نسل نے ہی میرا دل اس بات پر مائل کردیا کہ عمر بھر کی اگر کچھ نقدی تجربے کی ہاتھ میں ہے تو اسے تقسیم کردیا جائے، جس، جس کے مقدر میں ہوگا وہ اس سے فیض پالے گا۔" مہ پارہ بیگم اس روز خوشگوار موڈ میں تھیں اس لیے مسکراتے ہوئے بولیں۔

"یہ آپ نے اچھا کیا بلکہ بہت ہی اچھا کیا۔" مرزا صاحب نے باچھیں کھلاتے ہوئے کہا۔ "ہم تو عرصے سے آپ پر زور دے رہے تھے کہ بیگم صاحبہ اس خود ساختہ تخلیے سے نجات پایئے اور منظر پر آکر لوگوں کو بتایئے کہ گنج ہائے گراں مایہ، کیسے رہتے ہیں اس سے پہلے کہ وہ خاک میں مل جائیں۔"

"کون جانے کہ گنج ہائے گراں مایہ ہیں کہ سنگ خاک نشیں، مرزا صاحب۔" مہ پارہ بیگم نے سنجیدہ ہوتے ہوئے آہ بھری "جو بھی ہے عمر بھر کی نقدی حاضر کردی ہے، دیکھیے کس کو فائدہ دیتی ہے اور کس کو متضاد کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

"ہم تو اس بات پر بھی شکر ادا کر رہے ہیں کہ آپ کے گائے گیت اور غزلیں ہمیں موسیقی سننے کے جدید آلت پر سننے کو ملیں گی، آپ جانتی ہیں آواز کی اٹھان اور موسیقی کی لے اور زیر و بم

جتنے واضح ان نئے آلات پر سنائی دیتے ہیں پہلے کے ریکارڈ پلیئرز اور گراموفون ریکارڈ پر کہاں سنائی دیتے تھے۔"

"میں دیکھتی ہوں مرزا صاحب آپ کو نئی چیزوں کا خوب سواد پڑنے لگا ہے۔" مہ پارہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"جب تک زندہ ہیں بیگم صاحبہ جو نئی نئی ایجادات ہو رہی ہیں ان کو خریدیں گے بھی، برتیں گے بھی، خدا تعالیٰ مہلت دے رہا ہے تو کیوں نہ ان کرشموں کو آزما کر دیکھیں۔" مرزا صاحب قہقہہ لگا کر بولے۔

"آج آپ کے دستر خوان پر کیا موجود ہے بیگم صاحبہ، عرصہ بعد دل چاہ رہا ہے کہ اس دستر خوان سے تناول کیا جائے۔" حکیم صاحب نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "کیوں مرزا صاحب؟"

"کیوں نہیں۔" مرزا صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا "موقع بھی ہے، دستور بھی ہے بیگم صاحبہ کے متعلق مضمون شائع ہو رہے ہیں اور انکے ریکارڈز بھی مارکیٹ میں آنے والے ہیں اچھا کھانا کھلانا تو بنتا ہے ان کی طرف۔"

"یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے تھا کہ جب ہی آج ہم نے جہانگیری بریانی اور نرگسی کوفتے تیار کروائے ہیں کچھ ہاتھ میرا اپنا بھی ہے ان کی تیاری میں، بہت دن سے دل چاہ رہا تھا نرگسی کوفتے کھانے کو مگر پہلے طبیعت خراب تھی پھر دو دن درمیان میں ناغے کے آ گئے، آج فتح خان سے تازہ قیمہ منگوایا اور تیار کیے۔" مہ پارہ بیگم نے سونف کا پھنکا لگاتے ہوئے کہا۔

"یہی تو حیرت کی بات ہے کہ آپ ناغے کے دن نکلنے کا انتظار کرتی رہتی ہیں، ارے بیگم صاحبہ یہ ڈیپ فریزرز کام کے ہیں جو بندہ اکٹھا سودا ڈلوالے اور کم از کم ہفتے بھر کا گوشت، قیمہ اسٹور کر لے۔" مرزا صاحب نے کہا۔

"یہ جمے ہوئے گوشت، قیمے کے پتھر نما ڈھیر آپ کو مبارک ہوں مرزا صاحب، میں نے عمر بھر اس قسم کی باسی اشیا سے پرہیز کیا ہے جو بھی کھایا تازہ کھایا، ان باسی اشیاء میں ذائقہ نام کی کوئی شے نہیں ہوتی، ہم تو آج بھی سل بٹوں پر مسالہ پیسنے والے اور تازہ ترکاری، گوشت کھانے والے لوگوں میں سے ہیں۔"

"جب ہی تو آپ کے ہاں کے کھانے میں اب بھی وہ ذائقہ محسوس ہوتا ہے جس سے کبھی

زبان کی آشنائی رہی ہے۔" حکیم صاحب نے مہ پارہ بیگم کی طرف داری کرتے ہوئے کہا "ہمارے ہاں، ہماری بہوبیٹیں ہفتے بھر کا ہی نہیں کم از کم پورے مہینے کا گوشت، قیمہ فریز کر کے رکھتی ہیں اور دہی بند مسالے استعمال کرتی ہیں، دیسی گندم کے آٹے کی چپاتیوں کا تو سوال ہی کیا تھیلے کا آٹا استعمال ہوتا ہے اکثر پیکٹ بند روٹیاں اور جمے ہوئے پراٹھے گھر میں آتے ہیں، وقت کے وقت اودن میں رکھ کر گرم کیے اور کھانے والے کے سامنے لا پٹخے، اللہ جنت نصیب کرے ہماری بیوی مرحومہ کو جب تک دم میں دم رہا ہمارے لیے تازہ آٹا گوندھ کر چپاتی بناتی رہیں اور تازہ سبزی بھی۔ جب سے وہ گئی ہیں سب ذائقے، نفاست اور سلیقے بھول سے گئے ہیں۔"

"جی، وقت کہاں ہوتا ہے آج کل کے بچوں کے پاس ان چونچلوں کا۔" مرزا صاحب جدید سہولتوں کے دلدادہ تھے سو چہک کر بولے "وہ بے چارے نوکریاں کریں، بچے پالیں، دوسری ذمے داریاں نبھائیں کہ تازہ باسی، اصلی نقلی کے فرق معلوم کرتے رہیں، یہ سب جدید سہولتیں اس مصروف زندگی کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ہی تو ایجاد ہوئی ہیں۔"

"بس تو پھر ایسا کیجیے کہ بیگم صاحبہ کے ہاں کے کھانے کی تعریف اور خواہش کرنا چھوڑ دیجیے کیونکہ یہاں آج بھی ان سہولتوں سے استفادہ نہیں کیا جاتا۔" حکیم صاحب نے ہنس کر کہا۔

"نہیں، ہم ایسا بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ہم ان دم توڑتے طور طریقوں کی افادیت اور سلیقے سے ہرگز انکاری نہیں ہیں۔" مرزا صاحب نے بات ہاتھ سے جاتے ہوئے دیکھ کر اقرار کیا۔ وہ تینوں اسی قسم کی گفتگو میں مصروف تھے جب بسنتی نے مہ پارہ بیگم کو کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔

"کون ہے؟" انہوں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"ایک مرتبہ پہلے بھی یہ صاحب آئے تھے مرزا صاحب کے ساتھ۔" بسنتی نے بتایا۔

"ارے بھئی، اس کا نام وام پوچھ کر آئی ہوتیں۔" مرزا صاحب نے کہا۔ بسنتی واپس دروازے پر گئی اور آ کر مہمان کا نام حسن بتایا۔

"اوہو وہی نوجوان جس نے آپ کے فنکارانہ عہد پر مضمون لکھنے کا آغاز کیا۔" مرزا صاحب نے بتایا۔

"بلا لاؤ بھئی، اسکو یہیں بلا لاؤ۔" حکیم صاحب نے یہ سن کر کہا اور چند ہی لمحوں بعد مہمان ان کے روبرو تھا۔

"ابھی چند روز پہلے ہی تمہارے میگزین کی طرف سے ایک لڑکی اور کوئی دوسرا لڑکا میرے

پاس آئے تھے اس مرتبہ کی قسط کا مواد دکھانے۔'' حسن کمال نے کہا ''گزشتہ دنوں نے اپنے ذاتی مسائل میں الجھا رہا، میری جگہ پر وہ لڑکی ہی کام کر رہی تھی مگر اب میں نے اپنا کام دوبارہ سنبھال لیا ہے اور میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔''

''ہم تو تم لوگوں کے مشکور ہیں میاں کہ تم نے اس محاذ پر سے برف پگھلانے کا مشکل ترین کام شروع کیا۔'' حکیم صاحب نے کھلے دل سے کہا ان کا اشارہ مہ پارہ بیگم کی جانب تھا۔

''اگر تم ایسا نہ کر پاتے تو فن کا یہ عظیم باب اس میدان کے دیگر خزینوں میں سے ایک خزانہ تھا جس کا سراغ کسی نے نہیں لگایا، تم نے جو توڑا..... ہم ایسے قدر دانوں کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی ورنہ اس ناقدری پر اکثر دل بہت دکھتا تھا۔''

''شفقت ہے آپ کی جناب۔'' حسن کمال آداب بجالاتے ہوئے بولا ''بڑی ذرہ نوازی ہے، ہم خود بھی اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرتے ہیں کہ جن کو میم نے اجازت مرحمت فرمائی کچھ لکھنے کی ورنہ ہم سے پہلے بھی لوگوں نے کوشش کی ہوگی۔''

''وہ کوششیں، بیان بازی اور فسانہ طرازی کے محاذ کھولنے کے لیے کی جاتی تھیں، سو میں نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ تم لوگوں کے کام میں مجھے خلوص نظر آتا ہے اور خصوصاً وہ لڑکی، اس کے اندر تو مجھے ایک سچا فنکار شناس مزاج نظر آیا۔ اس نے اس موضوع پر بہت محنت کی ہے اور وہ خلوص دل سے یہ چاہتی ہے کہ تاریخ فن کے یہ چند ابواب کھل کر سامنے آئیں۔'' مہ پارہ بیگم نے کرن فاطمہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ''یہ بتاؤ، تم آج کس خاطر ادھر آئے ہو۔''

''یہ چند سوالات ہیں جو مضمون کی اگلی قسط کے لیے ہمارے ذہنوں میں آئے تھے اور کچھ باتیں ہمارے قارئین نے بھی پوچھیں ہیں۔ اگر آپ ان کا جواب دینا پسند فرمائیں تو یقیناً آئندہ قسط اور بہتر اور حقائق سے پر ہوگی۔''

''کیسے سوالات.....؟'' ماہ پارہ بیگم نے نظریں اٹھا کر تیکھے انداز میں پوچھا، حسن کمال نے انتہائی مودب انداز میں ایک کاغذ پر لکھے سوالات ایک کے بعد ایک سنانے شروع کیے۔ ان سوالات میں کوئی قابل اعتراض بات مہ پارہ بیگم کو نظر نہیں آئی لہٰذا انہوں نے ان کے جوابات انتہائی تحمل سے دیے۔ حسن کمال نے مہارت کے ساتھ ان کے جواب قلم بند کیے۔ مرزا صاحب اور حکیم صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور مہ پارہ بیگم کے ذوق وسلیقے کی تعریف کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

''بس یہی عادت ان بچوں کی مجھے بھائی، نوجوان نسل کے بپا کیے طوفانِ بدتمیزی میں ایسے شائستہ، مہذب اور باادب بچے خال خال دیکھنے کو ملتے ہیں ان کے انداز واطوار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے کام اور پیشے سے مخلص ہیں۔ آپ دیکھیے حکیم صاحب کہ اس مضمون کی دونوں اقساط میں کوئی بھی قابل اعتراض یا نامناسب بات کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی، جب ہی تو میں نے بھی قرنطینہ سے نکل آنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' مہ پارہ بیگم نے حسن کمال کے جانے کے بعد کہا وہ اپنے دونوں مہمانوں کے لیے خاص پان لگا رہی تھیں۔

''آپ نے دیکھا، آپ کے اس مراد آبادی نقشین پان دان کی تعریف اس نوجوان نے کتنے دل نشین انداز میں کی۔ آجکل کے نوجوانوں کو ایسی نایاب اشیا کی قدر کہاں۔'' حکیم صاحب نے پان منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''جو بھی کہیے، یہ ذہن میں رکھ کر کہیے کہ یہ بچہ میری دریافت ہے، ہم ہاشا کو تو اپنی صحبت میں بیٹھنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔'' مرزا صاحب نے فخرانہ انداز میں کہا۔

''آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں ورنہ مرزا صاحب ہم نے آپ کی صحبت میں گگا پہلوان کو بھی بیٹھے دیکھا ہے اور کاکا ٹرانسپورٹر کو بھی، یقیناً وہ آپکے ذوقِ دوستاں پر پورے اترے ہوں گے جب ہی ان کو یہ اجازت خاص مرحمت فرمائی آپ نے۔'' حکیم صاحب نے شرارت سے بھرپور لہجے میں کہا اور واپسی کے لیے کھڑے ہو گئے۔

.....

''حسن کمال کی محبت میں سمیہ سلطانہ کی گرومنگ شروع ہو چکی تھی۔ اسے کس موقع پر کیسے ہنسنا چاہیے، کس قسم کی بات کا کیسا جواب دینا چاہیے، کن باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے، کس فیشن ڈیزائنر کے بنائے کلاتھ خریدنے چاہییں، کس بیوٹیشن کی مستقل کلائنٹ بن جانا چاہیے۔ پروڈیوسر، ڈائریکٹرز اور صحافیوں کے ساتھ کیسا رویہ رکھنا چاہیے۔ یہ سب اسے حسن کمال سکھا رہا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں سمیہ سلطانہ کا گرومنگ گرو بن چکا تھا۔ سمیہ سلطانہ اس اعزاز پر نازاں تھی۔ مختلف اشتہارات اور ڈراموں میں کام کرنے کے بعد جو معاوضہ اسے حاصل ہوتا تھا اس میں سے تقریباً آدھا چیک سے حسن کمال کے والٹ میں منتقل ہو جاتا اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا وہ اسے اپنا قیمتی وقت دیتا تھا، اب تو اس نے اسے انگریزی زبان بھی سکھانا شروع کر دی تھی، شوبزنس سے متعلقہ لوگوں کے لیے اب انگریزی زبان پر عبور ایک اضافی خصوصیت بن چکا تھا سو حسن کمال سمیہ کو اس

میدان میں بھی پیچھے نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ کبھی کبھار اسے خود بھی حیرت ہوتی کہ سمعیہ کیسے بلا چوں وچراں اس کی کہی ہر بات مانے چلی جاتی تھی۔ پھر اس نے اسے لوئر مڈل کلاس کمپلیکس خیال کر کے اس معاملے پر سوچنا چھوڑ دیا۔ وہ سمعیہ کے یوں اپنے دام میں الجھنے کو اپنی ایک بڑی کامیابی سمجھتا تھا۔ دوسری طرف سمعیہ کی آپا تھیں جنہیں حسن کی ممانی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ان کے سسرال میں سمعیہ اور حسن کے بڑھتے ہوئے تعلق کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں جبکہ امی کی آنکھوں پر پیسے اور سہولتوں کی پٹی بندھ چکی تھی۔

''یہ سارا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب ایسی جگہوں پر کام کرنے لگیں تو۔ تو شکر کر بے وقوف تیری بہن کسی ایرے غیرے کے ساتھ پھرتی نظر نہیں آتی یہ تیری نند کا لڑکا تو اپنا دیکھا بھالا ہے۔ اپنے ہی اپنوں کی عزت بناتے ہیں، بگاڑتے تو بیگانے ہیں۔'' وہ بے پروائی سے جواب دیتیں۔

''وہ کہاں سے اپنا ہو گیا؟'' آپا نے بگڑ کر کہا ''ادھر رہتا تھا ہمارے پاس کمرے میں تو کبھی جو اس نے ہمیں منہ لگایا ہو، اپنا کھانا اپنا پہننا، اپنے آپ میں مگن پاس کوئی بیمار مریض مر جاتا اس نے کبھی پوچھا نہیں تھا۔ اب وہ کمرہ جو چھوڑ کر چلا گیا ہے تو بھی اسے باہر سے تالا لگا گیا ہے، کہتا ہے اتنا تو حق ہے میرا اس مکان میں، میں نے سوچا تھا چلا جائے گا تو میں اپنا کچھ سامان اس کمرے میں رکھ لوں گی، اتنا ہی اپنا ہوتا تو کچھ تو خیال کرتا۔

''چلو، اب کے آئے گا تو اس سے کہوں گی کہ وہ کمرہ تمہیں دے، دے، اس کی چابی دے، دے گا۔'' امی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''دے گا ضرور.....!'' آپا نے ان کی بات پر مزید بپھر کر کہا ''وہ آپا زبیدہ اور مشتاق کا بیٹا ہے امی، آپ نہیں جانتیں کیسے خود غرض اور مطلب پرست تھے وہ دونوں میاں بیوی یہ بھی انہی کا خون ہے کبھی جو کسی کا دھیلے کا بھی فائدہ کر جائے، یہ جو سمعیہ سلطانہ کے آگے پیچھے پھر رہا ہے نا وہ تو مجھے یقین ہے کہ اس میں بھی ضرور اس کی کوئی چال یا مطلب ہے، یونہی کسی کا بھلا کرنے والوں میں سے تو وہ ہرگز نہیں ہے۔''

''تم ساری تو نا.....'' امی نے ناراض ہو کر کہا ''تم ساری کی ساری بہنیں کیا، بھابیاں کیا سب اس بے چاری بچی سے جلنے لگی ہو، وہ اٹھتی کیسے ہے بیٹھتی کیسے ہے، چلتی کیسی ہے، بات کس سے کرتی ہے، کیوں کرتی ہے، ملتی کس سے ہے..... ہر بات کی پکڑ کرنے کی عادت ہو گئی ہے تمہیں۔ میری مانو زبان بند کر کے دیکھتی جاؤ، بہن تمہاری کہاں پہنچتی ہے، وہ اور اوپر جائے گی تمہارا

ہی بھلا ہو گا تمہیں بھی فائدہ پہنچے گا۔''

''آپ ایسی تو کبھی ہرگز نہیں تھیں امی، اللہ جانے آپ پر کیا تعویذ کر دیا ہے سمعیہ نے اپنی عاقبت بھی خراب کر رہی ہیں ساتھ۔'' آپا نے ماں کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے کہا۔ جواب میں اماں ہونہہ کہہ کر چپ ہو گئیں۔ اس قسم کی باتیں جاننے والے دوسرے لوگ بھی کر رہے تھے مگر وہاں پرواہ کسی کو بھی نہیں تھی۔

.....●.....

جس روز فیضان شازیہ کے ساتھ میگزین لینے کے لیے ڈاکٹر عبدالصبور کے کلینک پر گیا تھا، اسی روز مہ پارہ بیگم ڈاکٹر صاحب سے ٹائم لینے کے بعد پہنچی تھیں۔ شازیہ نے کلینک میں پہنچ کر میگزین اس کے حوالے کیا اور ابھی وہ اس کے چند صفحات ہی دیکھ پایا تھا کہ جب مہ پارہ بیگم دروازہ کھول کر کلینک میں داخل ہوئی تھیں۔ شازیہ نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا اور کن انکھیوں سے فیضان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے آنکھ کے اشارے سے اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کس بات پر حیران ہو رہی تھیں۔ شازیہ اس سوال کا جواب بہ آواز بلند نہیں دے سکتی تھی سو اس نے ایک چھوٹی سی چٹ پر کلینک میں مہ پارہ بیگم کی موجودگی کے متعلق لکھ کر اس کی طرف سرکا دی تھی۔ پہلی نظر میں فیضان بھی اکثر لوگوں کی طرح ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد اس کا دل چاہا کہ وہ ان سے براہِ راست ہی پوچھ لے کہ وہ سلمان کے متعلق ڈاکٹر صبور سے بات کرنے کیوں آئی تھی مگر پھر اسے شازیہ کا خیال آیا۔ اس کی یہ عجلت پسندی شازیہ کے لیے مسئلہ بھی بن سکتی تھی، کچھ سوچ کر اس نے میگزین کو رول کر کے اٹھا لیا اور شازیہ کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے باہر نکل آیا۔

اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ان خاتون کو دیکھا تھا۔ ان کی شکل صورت اس کے خاندان کے کسی بھی فرد سے مشابہ نہیں تھی، یقیناً ان کا اس خاندان سے رشتے داری کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنے والد کے قریبی دوستوں اور تعلق داروں کی اکثریت کو جانتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلمان کی بیماری کے متعلق جتنی راز داری سے کام لیا جا رہا تھا اس کے پیش نظر کسی شخص کا اس کے والد سے کتنا بھی قریبی تعلق کیوں نہ ہوتا، وہ اسے اس بات میں شریک نہیں کر سکتے تھے۔ پھر اس نے اون لکر میں شائع ہونے والا مضمون پڑھا۔ مہ پارہ بیگم ایک مغنیہ تھیں اور ان کا عمر بھر تعلق گلوکاری کے میدان سے ہی رہا تھا۔

اپنے والد کے متعلق وہ یہ بھی جانتا تھا کہ موسیقی سے انہیں اچھا خاصا شغف تھا مگر وہ زیادہ تر رفیع، طلعت محمود، امانت علی خان، غلام علی اور ثریا خانم کو سنتے تھے۔ اس نے اپنے گھر میں اپنے والد کی زبان پر کبھی مہ پارہ بیگم کا نام نہیں سنا تھا۔ دوسری طرف اسے یہ بھی یقین تھا کہ کوئی بھی شخص بغیر کسی انتہائی گہرے تعلق کے سلمان کے متعلق پوچھنے کے لیے ڈاکٹر صبور کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ کئی ہفتوں تک اس معاملے میں الجھا رہا تھا۔ اپنے والد سے یہ بات پوچھنے کی ہمت اسے نہیں ہو سکی تھی۔ وہ انتہائی سخت مزاج انسان تھے، اکثر معمولی سی بات پر بھی مشتعل ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے مزاج کی اس سختی اور اشتعال کا سلمان کی ذہنی صحت کی خرابی سے گہرا تعلق تھا۔ وہ سونے کا نوالہ اور شیر کی نگاہ والے فارمولے پر گہرا یقین رکھتے تھے۔

.....

مہ پارہ بیگم والے معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس نے کئی مرتبہ بہانے سے سلمان سے پوچھنے کی کوشش کی تھی کہ کیا اس سے کبھی کوئی خاتون ملنے آئی تھیں۔ سلمان گو اب ذہنی صحت کی بہتری کی طرف رواں تھا مگر ایسی کسی بات کا جواب اسے اس سے مل نہیں پایا تھا۔ ایسی بات کے جواب میں وہ اسے نرس کے متعلق بتاتا جو چوبیس گھنٹے اس کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس موجود رہتی تھی یا پھر ایسی بات کے جواب میں اسے اپنی پھپھو اور تائی اماں یاد آنے لگتیں جو بتاتے وہ اس معاملے کا کوئی سرا پکڑنے میں ناکام ہو رہا تھا اتنا ہی اس کے متعلق اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

اس تجسس نے اسے مہ پارہ بیگم کی رہائش کا پتا لگانے اور ان تک پہنچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ مہ پارہ بیگم پنج کے وقت دو چار لڑکے لڑکیوں کو گلوکاری کی تربیت دیتی تھیں۔ وہ اسی بہانے ان تک پہنچا اور اس وقت ان کے روبرو بیٹھا تھا۔

''میں نے تمہارا جائزہ لے لیا ہے برخوردار، تمہارے گلے میں سر کا فقدان ہے ہر فنکار ضروری نہیں کہ پیدائشی فنکار ہو مگر اس کے اندر ایسے جراثیم ضرور موجود ہوتے ہیں جو اسے فن کی طرف لے جاتے ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمہارے اندر ایسا کوئی عنصر مجھے نظر نہیں آیا۔'' اس سے تفصیلی بات کر لینے کے بعد انہوں نے فیصلہ سنایا تھا۔ فیضان جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔

''مگر میم یقین جانیے کہ مجھے بہت شوق ہے گانا سیکھنے کا، آپ مجھے کوشش کر کے سیکھنے کا موقع تو دے دیں۔'' اس نے التجائیہ انداز میں ایسے کہا جیسے گانا سیکھنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔

''تم نے بتایا کہ تم نوکری کرتے ہو اچھی خاصی، پھر تمہیں اتنا کیا شوق ہے وقت اور روپیہ

ضائع کرنے کا جبکہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ محنت اور وقت کے زیاں اور پیسہ گانے کے بعد بھی تم سیکھ نہیں پاؤ گے۔'' مہ پارہ بیگم نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

''پھر آپ مجھے ستار بجانا سکھا دیں، اس میں تو گلے کے سر کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' فیضان کو فوری طور پر ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا اور کوئی بہانہ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے ان کے قریب دھرے ستار پر نظریں جما لیں۔

''میں کوئی ستار نواز نہیں ہوں، نہ ہی مجھے اس کو بجانے میں بہت مہارت حاصل ہے یہ تو سر کے ساتھ سنگت خصوصاً ریاض کے دوران کی خاطر یہاں رکھا ہے۔'' انہوں نے فیضان کو سمجھایا۔

''جتنی شد بد آپ کو اس کی ہے، اتنی مجھے بھی سکھا دیں۔'' فیضان نے اصرار کیا۔

''میں تمہیں ایسے ستار نواز کا پتا دے دیتی ہوں جن سے سیکھ کر اس ساز کے ماہر بن سکتے ہو۔''

''میم، میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے آپ کو دیکھ کر فن موسیقی سے متعلق کچھ سیکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے، اس سے پہلے مجھے ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔'' اب کے فیضان نے ذرا واضح انداز میں بات کی۔

''مجھے کہاں دیکھ لیا تھا تم نے؟'' وہ متعجب ہوئیں۔

''اس رسالے میں آپ کے متعلق دو مضمون پڑھ چکا ہوں، آپ کی اس حویلی کی تصاویر بھی دیکھیں میں نے تو میرا دل خود بخود مائل ہوا کہ میں آپ سے ملوں، یہ حویلی دیکھوں اور آپ سے کچھ سیکھوں۔''

''کمال ہے بھئی!'' انہوں نے مزید حیرت کا مظاہرہ کیا ''ملنے اور حویلی دیکھنے کے شوق کی حد تک تو یہ بات مانی جا سکتی ہے مگر مجھ سے کچھ سیکھنے کے شوق والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''دیکھیں، اس مضمون میں لکھا ہے کہ آپ نے عمر بھر اپنے فن کے مظاہرے کے عوض کسی نام و نمود، القاب، شہرت، اعزازات کسی بھی چیز کا لالچ نہیں کیا تو میں نے سوچا کہ ایسا رویہ محض ایک سچے فنکار کا ہو سکتا ہے۔ سو میں نے فیصلہ کر لیا کہ آپ سے سیکھ کر آپ کے فن کو ہی نہیں آپ کے مزاج اور آپ کے رویوں کو بھی آگے منتقل کیا جانا چاہیے، جب ہی موسیقی کا شعبہ اپنی آب و تاب کے ساتھ زندہ رہ سکے گا۔'' فیضان نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔

''بھئی بڑی انوکھی بات کر رہے ہو تم، مہ پارہ بیگم نے کچھ کچھ متاثر ہوتے ہوئے کہا'' اس مضمون کو پڑھ کر میرے پاس آنے والے تم دوسرے شخص ہو، پہلا شخص ایک نجی ٹی وی چینل کا

نمائندہ تھا جو اپنے چینل کے لیے میرے انٹرویو کا خواہشمند تھا، ساتھ کے ساتھ وہ یہ بھی چاہ رہا تھا کہ میں کسی نوجوان گلوکار کے ساتھ مل کر کوئی ایسا گیت گاؤں جس سے کلاسیکی اور پاپولر میوزک کا امتزاج ہو سکے اور اس پروہ کوئی ویڈیو بھی بنا سکیں۔ ایسے لوگوں سے ہی میں نے عمر بھر پرہیز کیا ہے جو فنکار کو اس کے فن سمیت بیچ کر اپنا پیٹ پالنے کی کوشش کرتے ہیں، سو میں نے منع کر دیا سختی سے دوسرے تم ہو..... تم اس سے بھی انوکھی سنا رہے ہو، کیا یہ بھی کوئی نیا ٹرینڈ چلا ہے۔"

"میں تو ٹرینڈ وغیرہ سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوں، سیدھا سادہ آدمی ہوں، بس یونہی دل میں خیال آیا کہ نامور اور بڑے فنکار تو بہت دیکھے ایک ایسے فنکار کو بھی دیکھا جائے جو فن کی عظمت کو بحال رکھنے پر یقین رکھتا ہے اور اس عظمت کو بحال رکھنے کے لیے اگر اسے گوشہ گمنامی میں بھی جانا پڑے تو اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا۔"

"تمہاری گفتگو اچھی ہے، یقیناً کسی اچھے ہاتھ کے پالے ہو۔" مہ پارہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ وہ تنک مزاج اور رعب و دبدبے کی حامل شخصیت کی مالک ضرور تھیں مگر اتنی ہی سادہ دل بھی تھیں۔ کسی کے دل کی سچائی کو فوراً پا جاتی تھیں اور پا جانے کے بعد اس کا اعتراف کر لینے میں حرج محسوس نہیں کرتی تھیں۔

"یقیناً، مجھے بہت اچھے ہاتھوں نے پالا ہے۔" فیضان نے مسکین صورت بنا کر کہا "مگر افسوس وہ ہاتھ اس دنیا میں نہیں رہے۔"

"اوہ، اس کا مطلب ہے کہ تمہاری والدہ کا انتقال ہو چکا۔" مہ پارہ بیگم کو افسوس ہوا۔

"ضروری تو نہیں کہ اچھے ہاتھ صرف والدہ ہی کے ہوں، یہ ہاتھ والد کے بھی تو ہو سکتے ہیں مگر یہ ویسن لاٹ" فیضان نے مایوسی سے سر ہلایا "ہمیشہ اچھائی کو اپنی ہی صنف کی خوبی تصور کرتی ہیں....."

"بات ہاتھوں کی نہیں برخوردار، پرورش کی ہے۔" مہ پارہ بیگم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں "پرورش کرنا مرد کے بس کی بات نہیں وہ محض بچے کو عمر کے مختلف ادوار میں سے گزرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ پرورش کا مادہ خدا نے عورت کے اندر پیدا کیا ہے اور یہ وہی کر سکتی ہے۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوگا۔" فیضان نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ وہ اس بات کو مزید طول دینا نہیں چاہتا تھا

"پھر آپ بتائیے کہ آپ مجھے سکھا رہی ہیں ستار بجانا یا نہیں؟"

"برخوردار ایسے کام عجلت میں نہیں سیکھے جاتے، ایک سانس میں تم نے گانا سیکھنے کی بات کی، اس سے میں نے منع کر دیا تو تم نے دوسری سانس میں ہی ستار بجانا سیکھنے کی بات کر دی، تمہیں اپنی ترجیحات کے متعلق یقین ہونا چاہیے۔" انہوں نے سکون سے کہا۔

"ترجیح تو میں نے پہلے ہی واضح کر دی ہے، میں آپ سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کا فن منتقل ہو سکے، آپ مجھے محض یہ بتائیے کہ کیا آپ مجھے سکھائیں گی یا نہیں؟" اس کی بات سن کر مہ پارہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں جتنا جتنا وقت وہ سوچنے میں لگا رہی تھیں اتنی دیر فیضان امید و بیم کی کیفیت میں رہا وہ یہاں آیا تو کسی اور معاملے کا سراغ لگانے تھا لیکن مہ پارہ بیگم کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر تھا کہ اس کا دل کچھ وقت ان کے قریب گزرانے کی خواہش کرنے لگا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے۔" سوچنے کے بعد وہ محبت سے بولیں "یہ ایک انوکھی سی بات ہے مگر چلو یہ بھی کر لیتے ہیں، تمہارا دل توڑنے پر من نہیں مانا گو ستار محض میرا شوق رہا ہے عمر بھر لیکن جتنا اس کو بجانا مجھے آتا ہے اتنا تو تم کو سکھا سکتی ہوں۔"

"پھر کب آؤں میں سیکھنے کے لیے؟" فیضان ان کے جواب پر خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"یہ محض ایک نشست میں نہیں سیکھا جاتا، اس کو سیکھنے کے لیے تمہیں بار بار آنا پڑے گا، جب تک تمہیں اس کی صحیح شد بد حاصل نہ ہو جائے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے میں بار بار آؤں گا اور اس فسوں خیز حویلی میں زیادہ دیر رہنے کی خواہش پوری ہو جائے گی۔" فیضان کا دل کھل اٹھا۔

"اچھا، یہ بتاؤ کہ تم رہتے کہاں ہو؟"

"پہلے یہ بتائیے سیکھنے کا معاوضہ کیا ہوگا؟" وہ دانستہ یہ سوال گول کر گیا۔

"معاوضہ پہلے سے طے نہیں کریں گے اگر تم نے کچھ سیکھ لیا تو معاوضہ منہ مانگا ہوگا ورنہ کچھ بھی نہیں۔"

"یہ اچھی شرط ہے، میں سیکھ کر بھی کہوں گا کہ نہیں سیکھا۔"

"تم جتنا چھپو گے اتنا ہی پکڑے جاؤ گے۔" وہ ہنسیں۔

"اس کا مطلب کہ جو جتنا چھپتا ہے اتنا ہی پکڑا جاتا ہے؟" فیضان نے کہا۔

"یقیناً!"

"اچھا تو پھر آج سے میں پکڑنے کا کام شروع کرتا ہوں، دیکھتے ہیں چھپنے والا کتنا چھپتا ہے

اور کہاں تک چھپتا ہے۔'' فیضان نے مسکراتے ہوئے کہا اس کی اس بات نے انہیں چونکا دیا ''میرا مطلب ہے کہ ستار بجانے کا فن سیکھنے کی کوشش بھی تو چھپن پکڑائی کا کھیل ہے نا، میں اسے پکڑنے کی کوشش کروں گا، یہ مجھ سے چھپے گا، دیکھتے ہیں کون کامیاب رہتا ہے۔'' اس نے فوراً بات بنائی۔

''چلو دیکھتے ہیں!'' وہ اس کی بات کو سچ مانتے ہوئے بولیں۔

.....

''اوہ مائی گاڈ، دیکھیں تو حسن کمال نے کس کس طریقے سے سمعیہ سلطانہ کو ہائی لائٹ کیا ہے اپنے ریویو میں۔'' کرن نے اخبار پڑھتے پڑھتے مہرین کو مخاطب کیا۔

''تم نے پھر اس کا نام لیا!'' مہرین ناراض ہوتے ہوئے بولی۔

''آئی ایم سوری میم۔'' کرن شرمندہ ہوئی ''دراصل میں اس صفحے پر یہ ریویو پڑھ رہی تھی اور زمین آسمان کے یہ قلابے ملتے دیکھ کر بولے بغیر رہ نہ سکی۔''

''وہ اپنا قلم بیچ چکا ہے کرن، اب وہ جو بھی لکھے گا جس پر بھی لکھے گا کسی معاوضے کی خاطر لکھے گا، جو جتنا زیادہ معاوضہ اس کے قلم کا دے گا اس کے لیے وہ اتنا ہی اچھا لکھے گا، ایسے ہی زمین آسمان کے قلابے ملائے گا۔'' مہرین کے لہجے میں مایوسی اور دکھ تھا۔

''انسان کی شخصیت پر اس سے بڑا ڈاؤن فال اور کیا آسکتا ہے کہ وہ یوں گرے اور اس کا چہرہ اتنا مسخ ہو جائے کہ آئینہ دیکھنے پر وہ خود کو بھی نہ پہچان سکے۔'' کرن نے بے دلی سے اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہ حسن کمال ہے جس کا قلم ضمیر فروشوں کے گریبان پکڑتا تھا اور جو سچی اور بے لاگ صحافت کا علم بردار تھا۔''

''روکڑا، کرن فاطمہ، روکڑا۔'' نعیم سلطان نے اپنی سلائیڈز پر سے سر اٹھا کر کہا۔ ''یہ روکڑا بول رہا ہے، روکڑا جس کے بغیر زندگی لعنت محسوس ہوتی ہے۔''

''تمہیں بھی.....!'' کرن نے اپنی ریوالونگ چیئر کو اس کی جانب گھماتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا ''مجھے جو مل رہا ہے نا وہ میرے قدبت کے مطابق ہے میں اتنا ہی ڈیزرو کرتا ہوں۔''

''اور جو حسن کو مل رہا تھا وہ اس سے زیادہ ڈیزرو کرتا تھا کیا.....؟''

''یقیناً کیونکہ اس کا قد بت اس سے بڑا تھا۔ اس کا ٹیلنٹ اور علم اتنا بڑا تھا کہ اس کو ملنے والا معاوضہ صرف مونگ پھلیوں کے برابر تھا۔''

''تو پھر کیوں وہ اکتفا کرتا رہا مونگ پھلیوں پر اتنا عرصہ.....؟'' کرن نے غصے سے کہا۔

''چانس نہیں ملا تھا پہلے!'' نعیم نے اس کی ناراضی پر مسکرا کر کہا ''پہلے وہ کچھ نہیں کرتا تھا تو اون لکر نے اسے سینے سے لگا لیا، اس وقت اس کے لیے یہ بھی بہت تھا مگر اندر سے وہ جانتا تھا کہ اس کا مول اس سے زیادہ ہے۔ وہ مول بڑھنے کا انتظار کرتا رہا جیسے ہی مول بڑھا اس نے اسے حاصل کر لیا۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ کتنا احسان فراموش ہے وہ.....وہ میم کے سارے احسان بھول گیا، وہ پرکشش معاوضہ دیکھ کر۔''

''احسان، مروت، تعلق کا احترام یہ سب باتیں ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔ اب تو لوگ وہیں کا رخ کرتے ہیں جہاں سے انہیں زیادہ فائدہ حاصل ہونے کی امید ہو۔'' نعیم نے کرن کو سمجھایا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے اس بات کا علم نہیں۔'' کرن نے نعیم کی باتیں سن کر کہا ''مگر خیال اغلب یہ تھا کہ حسن کمال ایسے لوگوں میں سے نہیں ہو سکتا تھا۔''

''زندگی توقعات کے غلط ثابت ہونے کا نام ہے، اس لیے اس پر اتنا افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیا بات ہے نعیم، تم آج بڑی پریکٹیکل قسم کی گفتگو کر رہے ہو؟'' مہرین نے اس گفتگو میں پہلی بار حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''اس دفتر کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھ کر میرا ذہن بھی پریکٹیکل باتیں سوچنے لگا ہے۔'' نعیم نے ہنوز سنجیدہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''اس دفتر کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھ کر میرا ذہن بھی پریکٹیکل باتیں سوچنے لگا ہے۔'' نعیم نے ہنوز سنجیدہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا موجودہ صورتِ حال کو دیکھ کر میرا ذہن بھی پریکٹیکل باتیں سوچنے لگا ہے۔'' نعیم نے ہنوز سنجیدہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا موجودہ صورتِ حال کو یونہی ہم سب نے ایک فضول بات کو سر پر سوار کر رکھا ہے اور کچھ نہیں۔'' کرن نے اس موضوع سے تنگ آتے ہوئے کہا ''تم فیڈ بیک چیک کراؤ مجھے پچھلے شمارے کی، ہارون اور تانیہ ابھی تک کیوں نہیں آئے چیک کرو۔'' اس نے کام کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''تمہارے جیسی لڑکی کے ہوتے ہوئے بھلا یہاں فضول باتیں کیسے ذہنوں پر سوار رہ سکتی ہیں، یہ تو اہم قسم کے خطوط اور لکھوبیٹھ کران کے جواب ویسے ہی لچھے دار جیسے حسن کمال لکھتا تھا، ویسے ہی گرما گرم جیسے حسن کمال نے سمعیہ سلطانہ پر ریویو لکھا ہے۔'' نعیم نے اٹھ کر کاغذات کا ایک پلندا کرن کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

ڈونٹ واری، میں اس سے بھی زیادہ لچھے دار اور گرما گرم جواب لکھ سکتی ہوں، تم بس مجھے ایک کپ کافی اور ایک سینڈوچ لادو نیچے سے، میں نے آج ناشتہ نہیں کیا پیٹ کی بھوک ختم ہوگی تو میرا قلم فراٹے بھرنے لگے گا، تم دیکھنا۔'' کرن نے مسکرا کر کہا اور کن انکھیوں سے مہرین کی طرف دیکھا جواب تک ویسا ہی مایوس چہرہ بنائے بے دھیانی میں اپنے سامنے رکھے کاغذ پر قلم سے آڑی ترچھی لائنیں لگا رہی تھی۔

''کہیں حسن کمال کے ساتھ کام کے ساتھ ساتھ کوئی دل کا معاملہ تو نہیں اٹک گیا تھا ان کا.....'' کرن کو پہلی مرتبہ خیال آیا ''یقیناً ایسا ہی کچھ ہوگا ورنہ محض کسی کولیگ کے چلے جانے کا افسوس اتنی دیر تو نہیں منایا جاسکتا۔''

''بات صرف اس کے چلے جانے کی نہیں ہے۔'' مہرین نے اسے اپنی طرف دیکھتا محسوس کر کے نظریں اٹھائیں اور اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھتے ہوئے کہا ''بات اس بات کی ہے کہ حسن نے مجھے لیٹ ڈاؤن کیا ہے، مجھے ہرٹ کیا ہے بری طرح کل تک وہ جس قسم کے خودغرض اور لالچی لوگوں کیخلاف تقریریں کرتا تھا اور جس سیٹ اپ کو گالیاں دیتا تھا، وہ راتوں رات اس کے لیے اچھا کیسے ہوگیا اور وہ بھی اتنا اچھا کہ اس نے اسے جوائن کرنے میں پل نہیں لگایا۔ وہ کہتا ہے کہ میں مہرین سے بات اس لیے نہیں کرتا کہ میں اب کسی اور ادارے سے منسلک ہوں اور مہرین سے بات کرنا میرے پروفیشنل اصولوں کے خلاف ہوگا۔ بات یہ نہیں ہے کہ اچانک پروفیشنل ازم کی بیداری جاگ گئی اس کے اندر، بات یہ ہے کہ وہ جس طرح مفاد پرست ٹولے اور خودغرضانہ صحافت کے خلاف بات کرتا تھا میرے سامنے اب وہ کس منہ سے مجھ سے بات کرے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ اب اس موضوع کو بھول جانا چاہیے، ہر اہم بات وقت گزرنے کے ساتھ ماضی کا حصہ بن جاتی ہے اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کچھ عرصے بعد بھولے سے بھی اس کا خیال نہیں آتا۔'' کرن نے کہا اور اٹھ کر چند خطوط مہرین کے سامنے رکھے ''ان کو پڑھ

لیجیے اور ایڈیٹوریل لکھنے کی تیاری کیجیے، اب آپ کی فرنچ لیو ختم ہوگئی اب سے یہ کام آپ خود کیا کریں گی، اپنے قلم کا رنگ اتار لیجیے آپ تا کہ جانے والوں کو بھی اندازہ ہو کہ ان کے جانے سے کسی کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔'' مہرین نے ایک سرد آہ بھری اور پھر سیدھی ہو کر کرن کے دیے خطوط پڑھنے لگی۔

.....

''تمہیں ڈراموں میں کام کرنے کا شوق چرایا کیسے، یہ تم نے ابھی تک نہیں بتایا؟'' حسن کمال نے اس روز گفتگو کے دوران اچانک سمعیہ سے پوچھا۔ وہ اس وقت ڈنکن ڈونٹس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔

''مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔'' سمعیہ نے اپنے ریشمی بالوں کو پنوں میں جکڑتے ہوئے کہا۔

''پھر، یہ ادھر آمد کیسے ہوئی، ویسے جب پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ میری ممانی کی بہن جو اس پرانے محلے کی مکین ہے شوبزنس جوائن کرنے والی ہے تو مجھے بھی شدید حیرت ہوئی تھی۔'' جواب میں سمعیہ نے مختصراً مہ پارہ کی حویلی میں نواز وڈائچ سے اپنی ملاقات کے بارے میں اسے بتایا۔

''مہ پارہ بیگم.....!'' حسن کے کان کھڑے ہوئے ''تم مہ پارہ بیگم کے پاس کیا کرنے گئی تھیں؟''

''اپنی ایک دوست کے منہ سے ان کی حویلی اور ان کی شخصیت کی تعریفیں سن کر مارے اشتیاق کے ان سے ملنے گئی تھی۔'' سمعیہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا وہ اس وقت ایک لمبی شوٹنگ کے بعد فارغ ہوئی تھی۔

''پھر کیسی لگیں وہ تمہیں؟''

''بڑی سخت مزاج اور اونچے دماغ والی خاتون ہیں۔'' سمعیہ نے ناک چڑھا کر کہا ''میرے تو وہاں جانے پر سخت معترض ہوئیں وہ کہنے لگیں کہ والدین سے پوچھ کر آئی ہو یا نہیں پھر خود ہی نصیحت کرنے لگیں پھر خود ہی اجازت دینے لگیں حویلی دیکھ لینے کی۔ نواز صاحب نے اپنے پاس آنے کا کہا تو مشورہ دینے لگیں کہ ہرگز نہ جانا، لوگ اپنے لیے ہر بات کو جائز سمجھتے ہیں کسی دوسرے کو موقع ملتے دیکھ کر نصیحتیں کرنے لگ جاتے ہیں اور مشورے دینے پر تل آتے ہیں۔'' سمعیہ نے بیزار سے لہجے میں کہا۔

”تمہیں پتا ہے کہ وہ ایک نامور مغنیہ رہ چکی ہیں ماضی کی۔“ حسن نے کہا۔

”ہاں معلوم ہے، اون لکر میں ان پر ایک مضمون بھی دیکھا تھا میں نے وہ تھیں اب تو نہیں ہیں نا!“ سمعیہ اس موضوع سے اکتا گئی تھی۔

”یہی تو تمہیں یاد رکھنا چاہیے، فنکار کی سب قسمیں ہی ایک مخصوص وقت تک ہوتی ہیں پھر وہ تھیں بن جاتی ہیں، لہٰذا اپنے ”ہے“ کو ایسا بنانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جب ”تھا“ بن جائے تو زیادہ تکلیف نہ ہو۔“ حسن نے ایک گہری بات کی جو سمعیہ کو کچھ خاص سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے جواب میں اپنے شانے اچکا دیے۔

”تم نے کل کے اخبار میں خود پر لکھا ہوا میرا ریویو پڑھا۔“ حسن نے موضوع بدل ڈالا۔ سمعیہ کو وہ مضمون یاد آ گیا جو اس کے خوابوں کے ہیرو حسن کمال نے اس کے لیے لکھا تھا اور وہ لکھا ہوا خواب نہیں حقیقت تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

”لوگ کہتے ہیں کہ معجزے نہیں ہوتے، غلط کہتے ہیں۔“ اس نے سوچا تھا۔

.......•.......

”آپ کا نام آج کل خبروں کی زینت کچھ زیادہ ہی نہیں بننے لگا۔“ مہ پارہ بیگم کے سامنے بیٹھے چوہدری صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”میرا نام خبروں کی زینت بننے کا زمانہ تو اب گزر چکا چوہدری صاحب یہ تو کسی فن شناس کی مہربانی ہے جو مجھے ایسے ماضی کے ایک کردار پر مضمون لکھ ڈالا۔“ مہ پارہ بیگم نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

”عرصہ پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کو شہرت سے زیادہ گمنامی پسند ہے۔“

”یقیناً کہا تھا لیکن آپ شہرت کے ساتھ ایک لفظ سستی لگانا بھول گئے، مجھے سستی شہرت سے زیادہ گمنامی پسند تھی اور اب بھی ہے۔“

”پھر یہ سب کیا ہے؟“ چوہدری صاحب نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ سستی شہرت نہیں، عزت افزائی ہے، پتھر اگر ہیرا بھی ہو تو خاک میں رُلا پڑے رہنے پر پتھر ہی خیال کیا جاتا ہے کہ چاک پر رُلے ہیروں کو تلاشنے کا کام کوئی قدر دان ہی کر سکتا ہے ایسے عمل کو عزت افزائی کہتے ہیں۔“

”دل کی تسلی ہے محض ورنہ بات ایک سی ہے۔“ چوہدری صاحب نے تمسخرانہ انداز میں

کہا ”بہر حال، آپ کو یہ یاد دلانے کے لیے زحمت دی تھی کہ محتاط رہیے گا، خاک نشین پتھروں کو ڈھونڈ نکالنے والے کبھی کبھار ان کو چمکانے کی خاطر خوب رگڑتے ہیں انہیں، ایسے ہی رگڑائی میں ان کا ہر پہلو چمکنے لگتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا قدر دان بھی آپ کی ذات کے کچھ ایسے پہلو چمکا ڈالنے کی کوشش کرنے لگے جن کا چمکنا آپ کو بھی گوارا نہ ہو اور آپ کے علاوہ کچھ اور لوگوں کو بھی......“

”آپ خاطر جمع رکھیے، ایسی کوئی بات کچھ اور لوگوں سے زیادہ خود میرے اپنے لیے اہم ہو گی اور عزت وقار کو کس طرح بحال رکھتے ہیں یہ مجھے خوب معلوم ہے۔“

”ایسا معلوم ہونا ہی آپ کے لیے بہتر ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ مہ پارہ بیگم مہمان خانے سے نکل کر صحن میں آ گئیں، ان کے چہرے پر حزن کی کیفیت تھی۔ فتح خان انہیں چوہدری صاحب کو رخصت کر کے واپس آتے ہوئے ملال کی کیفیت میں دیکھ کر چونک گیا۔

”یقیناً ہر بار کی طرح کچھ تکلیف دہ بات ہو گئی ہو گی۔“ اس نے سوچا اسے اپنی بیگم صاحبہ کے دل کے سب موسموں کی خبر تھی۔ یہ خبر گیری اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ ایک پل کی تاخیر کیے بغیر ایک کمرے کی طرف بڑھا اور جب وہ وہاں سے نکلا تو اس کے ساتھ ایک سفید بالوں اور ہلتے سر والا بوڑھا شخص بھی تھا جسے وہ سہارا دے کر بیگم صاحبہ کی طرف لا رہا تھا۔

”بیگم صاحب، استاد جی آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔“ اس نے اس بوڑھے شخص کو بیگم صاحبہ کے سامنے نیچے موڑھے پر بیٹھاتے ہوئے کہا۔ مہ پارہ بیگم اپنے خیالات سے چونکیں اور انہوں نے جلدی سے اٹھ کر بوڑھے شخص کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

”جیتی رہو، خدا عمر دراز کرے۔“ ہلتے سر والے شخص نے لرزتی آواز میں کہا۔

”آپ خود کیوں آئے استاد جی مجھے بلایا ہوتا میں حاضر ہو جاتی۔“ انہوں نے احترام سے کہا۔

”مجھے باہر کی ہوا یاد آ رہی تھی، پرانی اور بوسیدہ چیزوں کو تازہ ہوا لگنی چاہیے ورنہ وہ گل سڑ جاتی ہیں۔“ بوڑھے شخص نے جواب دیا۔

”فتح خان، کیا بات ہے استاد جی کو اندر ہی گھسائے رکھتے ہو کیا یہاں کسی کو بھی اتنی فرصت نہیں کہ انہیں صبح شام باہر کی کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے باہر لے آئے۔“ مہ پارہ بیگم نے فتح خان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''استاد جی خود ہی ہمت نہیں کرتے بیگم صاحبہ۔'' فتح خان نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''اب بھی میں بصد منت لے کر آیا ہوں۔''

''ایک فرمائش کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔'' بوڑھے آدمی نے کہا۔

''حکم کیجیے!'' مہ پارہ بیگم نے سر جھکا کر کہا۔

''بہت دن ہو گئے آپ کی آواز میں غالب کی غزل سنے ہوئے، اگر چند اشعار سنا دیں تو بڑی کرم نوازی ہو گی۔'' مہ پارہ بیگم کے لیے استاد غریب سلطان کی یہ فرمائش ٹالنا ناممکن سا تھا۔ سو وہ چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اٹھ کر سنگ مرمر کے تخت نما چبوترے پر جا بیٹھیں اور اپنا ستار سنبھال لیا۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

مہ پارہ بیگم کی مخروطی انگلیاں ستار کے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں اور ان کے ہونٹ الفاظ اگل رہے تھے۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کچھ دیر بعد انہوں نے دوسری غزل کا شعر گنگنایا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور ستار کے تار سر پھیلا رہے تھے۔ اسی وقت ان سے ملاقات کی غرض سے آیا فیضان صحن میں داخل ہوا۔ وہ خاموش فضا، مہ پارہ بیگم کا فسوں خیز وجود اور آواز ستار کے سر اور اشعار کا انتخاب وہ اس منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔

''اوہ گاڈ، یہ انوکھا تجربہ ہے بالکل انوکھا۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ اس کے تجسس نے اسے ایک بالکل مختلف دنیا میں لا کھڑا کیا تھا۔

......o......

شازیہ کا فیضان سے کافی دنوں سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی روٹین میں مصروف تھی مگر اس کا دل اور آنکھیں لاشعوری طور پر فیضان کی منتظر رہتی تھیں۔ اس نے ایک دو مرتبہ فیضان کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر اس کا نمبر بند ملا۔ اس دن کے بعد جب فیضان اس سے میگزین لے کر گیا تھا، مسز گورائیہ بھی ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے آئی تھیں۔

''وہ امیر آدمی ہے لاابالی اور بے فکرا، شاید بھول بھی گیا ہو کہ کوئی لڑکی شازیہ بھی تھی جس سے وہ چند دن ملاقات کا خواہش مند رہا تھا۔'' کبھی کبھار اسے خیال آتا اور پھر وہ خود ہی اس خیال کو جھٹک دیتی ''اس نے کب یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ایک مستقل تعلق بنا رہا ہے دوستی کا۔'' ایسے تمام خیالات ذہن سے جھٹک کر وہ اپنے کام میں دل لگانے کی کوشش کرتی مگر پھر انہی مخصوص کلائنٹس کے چہروں، مخصوص باتوں اور مخصوص روٹین سے تنگ آ کر اس کا ذہن پھر انہی باتوں میں کھو جاتا۔

وہ بھی ایک مخصوص اور اکتا دینے والی شام تھی جب شازیہ کلائنٹس کو ان کی باری پر مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیج رہی تھی اور اس کی اگلی اپائنٹمنٹ کی تاریخ اپنے ریکارڈ میں انٹر کر رہی تھی۔ جب وہ ایک قطعی نیا چہرہ ریسپشن روم میں داخل ہوا۔ وہ ایک بارعب شکل اور بڑی بڑی مونچھوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور اس کے چہرے پر سختی کا تاثر تھا۔ شازیہ کو اس کا چہرہ شناسا محسوس ہو رہا تھا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔

''جی سر......؟'' اس نے مسکرا کر اس سے پوچھا تھا۔

''ایم اے گورائیہ۔'' رعب دار آواز میں اس نے کہا تھا ''ڈاکٹر صاحب کو اطلاع کر دیں۔''

شازیہ نے اپائنٹمنٹ لسٹ چیک کرنے کی کوشش کی ''میری اپائنٹمنٹ نہیں تھی ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی انہوں نے کہا تھا کہ آ جائیں۔'' اس شخص نے شازیہ کو اس دردِ سری سے بچانے کے لیے کہا۔

''آپ ڈاکٹر صاحب کو بتا دیں کہ میں آ گیا ہوں۔''

''مگر سر......؟'' شازیہ آؤٹ آف ڈیٹ اس ملاقات پر متامل تھی۔

''میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے خود بلایا ہے آپ کہہ کر تو دیکھیں۔'' اب کے اس شخص نے اونچی آواز میں کہا شازیہ خوفزدہ ہو گئی۔

''مگر سر، ڈاکٹر صاحب جب کسی کلائنٹ کے ساتھ مصروف ہوں تو ڈسٹرب کیے جانے پر سخت خفا ہوتے ہیں۔ اس بات سے انہوں نے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔'' وہ اپنی ہمت جمع کر کے بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلایا اور اپنا موبائل آن کیا، وہ غالباً ڈاکٹر صاحب کے پرسنل سیل نمبر پر رابطہ کر رہا تھا مگر شازیہ جانتی تھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ڈاکٹر صاحب کسی کے

ساتھ مصروف ہوتے تھے تو اپنا سیل فون آف رکھتے تھے اور ایسا ہی ہوا کیونکہ کچھ دیر بعد وہ شخص ایک مرتبہ پھر شازیہ سے مخاطب تھا۔

"آپ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع تو دیں بی بی وہ ناراض ہوئے تو میں سنبھال لوں گا، مجھے بیس منٹ میں ایئرپورٹ پہنچنا ہے اسلام آباد کے لیے فلائٹ پکڑنی ہے آپ بے کار ضد کر رہی ہیں۔"

"یہ سارا کا سارا آواہی بگڑ ہوا ہے جو بھی آتا ہے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ تہذیب نام کی کوئی شے ہی نہیں ان میں....." شازیہ کو غصہ آنے لگا۔

"میرے متعلق نہ بتائے جانے پر میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب زیادہ ناراض ہوں گے آپ چیک کر کے دیکھ لیں۔" اب کے اس شخص نے اسے تنبیہہ کرنے کی کوشش کی۔ شازیہ نے جھنجلا کر انٹر کام ریسور اٹھالیا۔

"جی مس شازیہ کیا گورائیہ صاحب پہنچ گئے۔" ڈاکٹر صاحب نے دوسری جانب دیکھا جو اپنا کان سہلاتے اسے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو اب بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہا تھا۔

"جی سر۔" شازیہ نے کہا۔

"آپ انہیں بھیج دیں، سعید صاحب فارغ ہو کر باہر آنے والے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب کی آواز آئی۔

"جی سر۔" شازیہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ وہ جب سے یہاں جاب کر رہی تھی بغیر اپائنٹمنٹ کے کوئی نواب کا بچہ بھی ڈاکٹر صاحب سے نہیں مل سکا تھا "اس شخص میں کیا بات ہے خاص۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے سوچا اور اس شخص کو اندر جانے کو کہا۔

"مس شازیہ اٹ از مائی ٹرن ناؤ۔" (مس شازیہ اب میری باری تھی) اس کے سامنے بیٹھے مسز سہگل نے پہلو بدل کر کہا۔ وہ اتنی دیر سے شازیہ اور اس شخص کے درمیان ہونے والی بحث سن رہی تھیں۔

شاید ان صاحب کو کوئی ایمرجنسی ہے اسی لیے ڈاکٹر صاحب نے اجازت دے دی ورنہ آپ جانتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی ایسی بے اصولی نہیں کی۔" شازیہ نے ایک بودی سی بات بنائی جبکہ دل میں وہ خود بھی اس بات پر حیران تھی۔

.....

"ہمارے کچھ قارئین آپ کی نجی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، آپ اب اس عمر

میں کیسی زندگی گزار رہی ہیں، آپ کی روٹین کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیا آپ ان سوالات کے جواب دینا پسند کریں گی؟" حسن کمال مہ پارہ بیگم سے پوچھ رہا تھا۔

"اس عمر میں روٹین کیا ہو سکتی ہے.....؟ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔" مہ پارہ بیگم نے نیچی آواز میں کہا۔

"آپ سوشل تقریبات میں شرکت کرتی ہیں؟"

"صرف بہت قریبی تعلق داروں کے بلاوے پر جاتی ہوں۔"

"اس حویلی کی مینٹیننس کیسے ہوتی ہے، آپ اپنا کتنا وقت اسے دیتی ہیں یہ عمارت خاصی پرانی ہے اس کو درست حالت میں رکھنے کے لیے وقت اور پیسہ دونوں ہی وافر مقدار میں ہونا چاہیے..... ہے نا؟" حسن نے تیسرا سوال پوچھا۔

"یہ تو ہے..... اللہ کا شکر ہے کہ اب تک کام چل رہا ہے۔"

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی، تمام عمر تنہا کیوں گزار دی؟" حسن کے چوتھے سوال پر ایک طرف بیٹھ کر ستار کے تاروں کے ساتھ نبرد آزما فیضان کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ حسن نے اس سوال پر مہ پارہ بیگم خاموش رہیں۔

"میم، آپ کو میرا سوال برا لگا؟" حسن نے پوچھا۔

"نہیں۔" مہ پارہ بیگم نے کسی خیال سے چونکتے ہوئے جواب دیا "یہ برا لگنے والا سوال نہیں مگر انتہائی ذاتی ہے، کیا یہ ضروری ہے کہ اس کا جواب دیا جائے۔"

"نہیں کچھ اتنا بھی ضروری نہیں۔" حسن نے سر ہلایا۔

"لیکن اب چونکہ نوجوان نسل جو ہمارے پرچے کی قاری ہے کی توجہ آپ کی شخصیت اور فن کی طرف مبذول ہو گئی ہے تو اس طرح کا من سوال ذہن میں آنا ایک فطری سی بات ہے۔ لوگوں کو اس قسم کے سوالات میں خاصی دلچسپی ہوتی ہے نا۔"

"ہوتی ہو گی!" مہ پارہ بیگم نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا "بہر حال میں اس کا جواب نہیں دوں گی۔"

"ایک بات بتاؤں میم.....؟" فیضان اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے آ گیا "جب آپ یہ کہیں گی کہ آپ اس سوال کا جواب نہیں دیں گی کیونکہ یہ ایک انتہائی ذاتی سوال ہے تو پھر کئی طرح کے سوال اور شکوک سر اٹھائیں گے، بہتر ہے کہ آپ اس کا کوئی مختصر سا جواب دے دیں کیونکہ

جواب نہ دینے کی صورت میں پڑھنے والے زیادہ متجسس ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ کوئی بات ضرور ہے۔"

"تمہارے ذہن میں بھی یہ تجسس پیدا ہوا۔" مہ پارہ بیگم نے اس سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا "اور تمہارے ذہن میں بھی....." اب کے انہوں نے حسن کو مخاطب کیا۔ اس نے بھی سر ہلایا۔

"یقیناً!"

"بس، اسی قسم کے سوالات اور تجسس سے میں گریزاں رہی عمر بھر۔" انہیں تاؤ آ گیا "بات اگر فن اور فنکاری تک محدود رہے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر بات بڑھ کر ذات، گھر بار، شادی بیاہ، بال بچے تک پہنچ جاتی ہیں اس ذہنیت کو کوئی انقلاب بھی بدل نہیں سکتا۔"

"یہ ایک فطری سی بات ہے جب ہم کسی شخصیت کو کسی خاص حوالے سے پسند کرتے ہیں۔ آئیڈیلائز کرنے لگتے ہیں تو یقیناً ہمیں اس کی ذاتی زندگی کے متعلق جاننے کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔" حسن نے تحمل سے کہا۔

"تم اسی قسم کے سوالات کو میرے سامنے نہیں اٹھاؤ گے۔" مہ پارہ بیگم نے انگلی اٹھا کر حسن کو تنبیہہ کی "ورنہ میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔" ان کے سخت لہجے کے ردِعمل کے طور پر حسن نے فیضان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک سے سوال تھے اور ذہنوں میں ایک سے جواب۔

"جیسا آپ پسند کریں۔" حسن نے اپنی ڈائری میں لکھی ایک سطر پر قلم سے لکیر پھیرتے ہوئے کہا۔

.....

"سلمان اب 85 فیصد فٹ ہے ذہنی طور پر، اس کے بہت سے خوف، اندیشے اور ری ایکشنز ختم ہو گئے ہیں لیکن میں باقی 15 فیصد کے بارے میں پر یقین نہیں ہوں۔" ڈاکٹر عبدالصبور نے فیضان سے کہا۔ وہ اس وقت اس فارم ہاؤس کے لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کچھ دیر قبل ہی انہوں نے سلمان کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹے کا سیشن کیا تھا۔

"یہ پندرہ فیصد کیا ہے اور کس چیز کے متعلق ہے؟" فیضان نے مضطرب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اس کے ذہن سے یہ بات کسی طرح واش نہیں ہوتی کہ اس کا باپ ایک قاتل ہے جس

نے اس کی آنکھوں کے سامنے دو قتل کیے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب، جس سیٹ اپ سے ہمارا تعلق ہے وہاں ایسے واقعات روٹین کا حصہ ہوتے ہیں، سلمان بھی اسی سیٹ اپ میں بڑھا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس شدید ردِعمل کا شکار کیسے ہو گیا۔" فیضان کی بے بسی دیدنی تھی۔

"بات یہ ہے کہ فیضان میاں کہ سیٹ اپ کی روٹینز کے بعض اوقات بھگتان بھی بھگتنے پڑ جاتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس قسم کے نتائج کی سب سے بڑی صورت ہے جو سلمان کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ کوئی باپ بھی اپنے جوان بیٹے کو اس طرح کی کنڈیشن کا شکار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا مگر شاید اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔" ڈاکٹر صبور نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ کیا مشورہ دیتے ہیں، ابا کا ایک کلین امیج کس طرح سلمان کے ذہن میں اتارا جا سکتا ہے۔"

"میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر صبور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن بیٹا امیج بلڈنگ کمرشل لیول پر میڈیا کے ذریعے عوام کے ذہنوں میں اتارنا تو شاید اتنا مشکل کام نہیں ہے مگر بہت قریبی تعلق رکھنے والوں سے انسان اپنا اصل چھپانے میں بہت حد تک کامیاب کبھی بھی نہیں رہتا وہ اپنے پیاروں کی اکثریت کے سامنے اکثر پوری طرح ایکسپوزڈ ہوتا ہے۔"

"اکثر ایسے لوگوں کے اپنے پیارے ہی تو ان کا پردہ رکھتے ہیں۔" فیضان نے دکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ڈاکٹر صاحب آپ پلیز اس کا کوئی حل نکالیے سلمان کی عمر ہی کیا ہے اتنا ذہین اور ٹیلنٹڈ لڑکا کیا یونہی ضائع ہو جائے گا؟"

"میرے ذہن میں ایک حل ہے مگر آپ کے والد اس حال پر رضامند نہیں ہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"آپ بتایئے پلیز.....!" فیضان بے صبری سے بولا۔

"میں نے آپ کے والد سے اس کے متعلق تفصیل سے ڈسکس کیا تھا مگر انہیں یہ حل پسند نہیں آیا، نہ ہی وہ اس پر رضامند ہوں گے۔ آپ اگر کوشش کریں تو شاید وہ مان جائیں گے۔" فیضان اپنے ابا کی ہٹ دھرم طبیعت اور سخت مزاجی سے اچھی طرح واقف تھا مگر سلمان کے لیے وہ ان سے ہر قسم کی بحث کے لیے تیار تھا۔

''صرف مسز گورائیہ، وہ کون ہیں؟'' فیضان کچھ کچھ سمجھتے ہوئے بھی بڑبڑایا۔

''مسز گورائیہ سلمان کی والدہ ہیں۔'' ڈاکٹر صبور نے دوسرا انکشاف کیا۔

''سلمان کی والدہ.....؟'' فیضان کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ ''اور میری..... میری.....؟''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''یہ انتہائی کانفیڈنشل معاملہ ہے فیضان، آپ سے صرف اس لیے شیئر کیا ہے کہ آپ کے بھائی کی ذہنی صحت مکمل بحال ہونے کا اس سے گہرا تعلق ہے۔'' ڈاکٹر صبور کی آواز سے کہیں دور آتی محسوس ہو رہی تھی۔

.....o.....

''گرما گرم بھئی گرما گرم بلکہ انتہائی گرم۔'' جہانگیر اخباروں کا پلندا اٹھائے آفس میں داخل ہوتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔

''کیا گرم؟'' کرن نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''حسن کمال ہماری والی اسٹوریاں اور خاکے چرا کر آبزرور، کو چار چاند لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔'' جہانگیر نے آبزرور کا کلچرل ایڈیشن اس کے سامنے رکھا جس کے پہلے صفحے پر مہ پارہ بیگم کا انٹرویو معہ تصاویر کے موجود تھا۔

''شادی نہ کرنے کا معاملہ ایسا ہے کہ اس پر پوچھے گئے کسی سوال کا جواب میں نہیں دینا چاہوں گی۔''

''مہ پارہ بیگم کا مبہم جواب'' کرن نے ایک شہ سرخی پڑھی۔

''قارئین کو چاہیے کہ فنکار سے سوالات اس کے فن اور فنکاری تک محدود رکھیں، ذاتیات کے متعلق سوالات پوچھنے سے گریز کریں۔'' دوسرا کیپشن اور اس کے ساتھ انٹرویوز کے اپنے تاثرات بھی درج تھے ''مہ پارہ بیگم کا یہ جواب اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کے زندگی میں رومانس اور شادی سے متعلق کچھ ایسا ضرور موجود ہے جس کو ظاہر کرنے سے وہ گریزاں ہیں۔''

''گرم کیک، گرم کیک۔'' جہانگیر پھر گنگنایا۔

''یہ ایڈیشن گرم کیک کی طرح بکے گا۔''

''گھٹیا تھرڈ کلاس، بے ہودہ.....'' جبکہ کرن کا دماغ تپ رہا تھا۔

.....o.....

شازیہ سے ملیے فیضان کے مسلسل غیر حاضری اور کسی قسم کے رابطے میں نہ ہونا ایک پریشان کن صورت حال تھی۔ فیضان کے ساتھ اس کا تعلق قلبی اور روحانی درجہ اختیار کر چکا تھا۔ وہ ایک کم آمیز لڑکی تھی، اس نے بالا وجہ کبھی کسی سے تعلق نہیں بڑھایا تھا۔ اپنی معروفیت کی وجہ سے اس کا میل جول بھی بہت کم لوگوں سے تھا۔ ایسے میں فیضان نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ خود بڑھایا تھا۔ اسے شروع شروع میں فیضان کی گرم جوشی اور خلوص عجیب اور دھوکا سا لگتا تھا لیکن اب وہ اس تعلق سے مانوس ہو گئی تھی اور جب اس نے اس تعلق کو دل سے قبول کر لیا تھا تو فیضان ایک دم منظر سے کہیں غائب ہو گیا تھا۔

اس نے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس خود فیضان سے کئی بار موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کا موبائل ہمیشہ بند ملتا تھا یا پھر شاید اس نے اپنا نمبر ہی بدل لیا تھا۔ اوائل سردیوں کے مختصر ہوتے دن اور دھندلی پڑتی شامیں شازیہ کے لیے اداسی اور دکھ کی کیفیت لے کر آئی تھیں۔ ڈاکٹر صبور کے کلینک پر کام کے دوران اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اکثر اسے ایسا لگتا کہ دروازہ کھول کر جو کوئی بھی اندر آیا ہے وہ فیضان ہی ہوگا۔ اسے اکثر چہروں پر اس ہنستے مسکراتے چہرے کا گمان ہوتا۔ پھر اس کے کانوں میں اس کی بھاری آواز گونجتی ''کیسی ہو؟''

''ارے، میں غالباً بہت دن بعد ادھر آیا۔''

''میں جتنے دن بھی یہاں نہیں آیا میں نے تمہیں بہت مس کیا۔'' وہ نظریں کمپیوٹر کے مانیٹر کی

اسکرین پر جمائے جمائے سوچتی۔ ''میری طرف دوستی کا ہاتھ بھی خود ہی بڑھایا اور اچانک غائب بھی خود ہی ہو گیا۔'' پھر اسے یاد آتا وہ کہتا تھا ''مجھے تمہارے ایسے سادہ اور معصوم لوگ اچھے لگتے ہیں تمہارا چہرہ کتنا سادہ ہے اور تم میں بناوٹ تو نام کو بھی نہیں، آج کل ایسے چہرے کہاں نظر آتے ہیں۔ کم بہت ہی کم۔'' وہ ایک سرد آہ بھر کر اپنا دھیان کسی اور بات میں لگانے کی کوشش کرتی مگر تھوڑی دیر بعد ہی اس کا خیال پھر فیضان کے تصور میں بھٹک جاتا۔ وہ کئی مرتبہ اگلے پندرہ دن کی اپائنمنٹ لسٹ چیک کرتی، شاید کہیں فیضان، مسز گورائیہ کے متعلق کچھ معلوم کر لیا ہوگا۔ اُن کا ان لوگوں سے کیا تعلق ہوسکتا ہے، آج کل تو وہ مہ پارہ بیگم کے نام سے خبروں میں خاصی ان نظر آ رہی ہیں۔'' اسے خیال آتا۔

کلینک پر آئے اخبارات و رسائل میں اسے کبھی مسز گورائیہ کی تصویر یا انٹرویو نظر آ جاتا تو اسے فیضان اور بھی شدت سے یاد آتا۔ دو ایک مرتبہ وہ ڈاکٹر عبدالصبور سے سلمان یا مسز گورائیہ کے متعلق کوئی سوال کرتے کرتے رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے سوالات کے جواب میں اسے صرف ڈاکٹر صبور کی ڈانٹ ہی سننے کو مل سکتی تھی۔ شہر کی سڑکوں اور راستوں پر بھی اس کی متلاشی نظریں فیضان کا چہرہ ڈھونڈتی رہتیں۔ شاید کبھی کہیں وہ اچانک ہی نظر آ جائے اس کا دل اچھی خاصی کشمکش اور بے چینی کا شکار ہو گیا تھا اور دن اسی بے چینی کی وحشت پالتے ہوئے گزر رہے تھے۔

''اون لکر'' میں آنے سے پہلے، بلکہ بہت پہلے طالب علمی کے زمانے میں، میں نے ایک لفظ سنا تھا ''زرد صحافت'' مجھے اس کے مفہوم سے ناآشنائی تھی، مگر الحمدللہ اب میں اس کے مفہوم بلکہ اس کے ہر پہلو سے واقف ہو چکی ہوں بذریعہ حسن کمال'' کرن فاطمہ نے برگر کے کنارے دانتوں سے کترتے ہوئے بلند آواز میں اعلان کیا، وہ حسن کمال کے متعلق بہت دن بعد کوئی بات کر رہی تھی وہ بھی اس لیے کہ اس وقت مہرین دفتر میں موجود نہیں تھی۔

''وہ جسے صحافت کہتے تھے، وہ مرحومہ اب پائی کہاں جاتی ہے محترم'' جہانگیر نے اپنے کیمرے کے لینس چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے ہاں۔'' کرن نے فخریہ انداز میں کہا۔

''جبھی تو حسن کمال ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔'' جہانگیر نے استہزائیہ انداز میں کہا ''تمہیں معلوم

بھی ہے کہ اب اس کی پہنچ کہاں تک ہے۔''

''کہاں تک ہے؟'' کرن نے سوال کیا۔

''اقتدار کے ایوانوں تک اور خفیہ کے دیوانوں تک، اس نے خود اپنے آپ کو، اپنے ٹیلنٹ کو اور تجربے کو خوب کیش کروایا ہے، وہ شخص جو کچھ ہی عرصہ پہلے قسطوں پر موٹر سائیکل لے کر اترا رہا تھا، آج اس کے نیچے زیرو میٹر سینٹرو ہے، اس کے پاس ہر بڑے فنکشن، اہم میٹنگ اور کانفرنس کا انویٹیشن ہوتا ہے اور بے شمار پاسز، اب تو وہ اپنے ملنے ملانے والی کو مختلف جگہوں پر ایڈجسٹ کروانے کی پوزیشن میں بھی ہے۔''

''وہ شہرت کی یہ سیڑھی یکدم یعنی ایک ہی جست میں کیسے چڑھ گیا؟'' کرن کو خود اپنا آپ یہ سوال کرتے ہوئے انتہائی احمق محسوس ہوا۔

''سارے وہ تمام راستے اختیار کیے جو ایک ہی جست میں سب سے اوپر والے ڈنڈے پر پہنچا دینے میں معاون ثابت ہوئے، تمہیں معلوم ہے کہ اہم شخصیات اور سلیبریٹیز کی شان اور مدح میں کالم کس بھاؤ چڑھتے ہیں۔'' جہانگیر نے سرگوشی کے سے انداز میں یہ آخری بات اسے سنائی۔

''تین سو روپیہ فی کالم۔'' کرن نے اطمینان بھرا جواب دیا۔

''وہ اور ہوتے ہیں۔'' جہانگیر نے اس کی بات کی نفی کی۔ ''وہ تو کالم لکھوانے والے کالم ہوتے ہیں، میں ان کی بات کر رہا ہوں جو خصوصی فرمائش پر لکھے جاتے ہیں اور جو شاہوں کے وفادار لکھواتے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم!'' کرن نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''ہزاروں میں، کبھی کبھار لاکھوں میں بھی۔'' جہانگیر نے دایاں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔'' حسن شہرت کی اس بلندی تک پہنچنے کے سارے راز جانتا تھا صرف اسے سیڑھی میسر نہیں تھی، بلال ظفر نے یہ سیڑھی اس کے سامنے رکھی اور حسن نے اس پر چڑھنے میں دیر نہیں لگائی۔

''اس معاملے میں اندازاً کتنے حسن کمال ہوں گے جہانگیر۔'' کرن نے اچانک سوال کیا۔

''گنے نہیں جا سکتے، یہ جو بڑے بڑے نام ہیں نا جن کو ہم سب آئیڈیلائز کرتے ہیں یہ سب حسن کمال کے آئینے ہیں، ملک و قوم کے نام پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے والے ملک و قوم کا نام بیچنے والوں کے چٹو، یہ سب مرحومہ صحافت بی بی کی فاتحہ پڑھ کر سوئم، دسواں، چالیسواں تک کر چکے اس کا۔ اب تو اتنی برسیاں گزر چکیں محترمہ کی کہ سب اس کا نام بھی بھول گئے اب انہوں نے اس

مرحومہ کے اوپر زرد غلاف جو چڑھا رکھا ہے۔'' جہانگیر کا تلخ ہوتا لہجہ اس کے اندر موجود کشمکش اور ڈپریشن کا غماز تھا۔

''تم ایک مٹھی بھر لوگوں کے گروہ کی بات سنا رہے ہو جہانگیر، تم بھول گئے شاید کہ برائی کا تناسب اچھائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔'' کرن نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔'' جہانگیر نے اپنے تلخ لہجے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''مگر جو بھی ہے تمہیں ماننا پڑے گا کہ اس کا تناسب بھلے کم ہو یہ اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ زیادہ تناسب بھلے کم ہو زیادہ تناسب والی اچھائی پر غالب آجاتی ہے اور ہر جگہ اسی کا عکس نمایاں ہو جاتا ہے۔ اب تم دیکھو، تم نے مہ پارہ بیگم اور ان کے خاندان پر لکھے جانے والے مضامین کا سلسلہ اس نیک نیتی کے ساتھ شروع کیا تھا کہ فن کی اتنی خدمت کرنے والے اس خاندان کا نام زندہ اور روشن کیا جاسکے۔ اس وقت تک کسی اور صحافی، پرچے، اخبار یا چینل کو ان کا نام تک یاد نہیں تھا، مگر ایک بار تمہاری کاوش سامنے آنے پر ان کی شخصیت پر لکھنا جیسے ایک ٹرینڈ بننے لگا ہے۔ معاملہ ان کی ذات کی ایکسپلائٹیشن تک چلا گیا ہے اور اس کو سب سے زیادہ ایکسپلائٹ حسن کمال نے کیا ہے، تم جس نیہ سلسلہ انتہائی خلوص نیت سے شروع کیا تھا پس منظر میں جا چکی ہو جبکہ حسن کمال جس نے اپنے آرٹیکل نما انٹرویو میں ان کی شخصیت پر چھینٹے اڑانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اس حوالے سے پہچانا جانے لگا ہے کہ اس نے ایک کلاسیکل داستان کو اتنے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے کہ لطف آگیا۔''

''ارے ہاں۔'' کرن جو اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھی پیچھے کی طرف ہو رہی تھی اچانک کچھ یاد آنے پر سیدھی ہوئی۔ ''مہ پارہ بیگم کے ملازم خاص ''فتح خان'' کی جانب سے کئی فون آچکے ہیں کہ ہم نے جو کچھ ان کے انٹرویو اور رسمی گفتگو کے ساتھ سلوک کیا ہے اس کے نتائج ہمیں بھگتنے پڑیں گے میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ یہ سب لغویات اون لکر کے بجائے آبزرور میں پڑھنے کے باوجود وہ ہمیں کیوں دھمکیاں دے رہے ہیں۔''

''اس لیے کہ وہ حسن کمال کا نام پڑھ چکے ہیں اس مضمون کے ساتھ اور حسن کمال کو وہ اون لکر کے ساتھ ہی منسوب سمجھتے ہیں۔'' نعیم نے اس ساری گفتگو میں پہلی مرتبہ حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''اور یہ بھی مت بھولو کہ اون لکر میں شائع ہونے والے اس مضمون کی پہلی قسط کے نتیجے میں مہ پارہ بیگم کے حضور اسی نے پیشی دی تھی۔ کوئی پتا نہیں کہ وہ اس انٹرویو نما آرٹیکل کے لیے مہ پارہ

بیگم سے دوبارہ اون لکر کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ایک رکن کی حیثیت سے ہی ملا ہو۔'' جہانگیر نے خیال ظاہر کیا۔

''مگر انہیں اس سے بات کرنے سے پہلے یہاں سے تصدیق تو کرنی چاہیے تھی۔'' کرن نے صورت حال کو کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

''انہیں تصدیق کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ انہیں اس بات کا سو فیصد یقین تھا۔'' نعیم نے مسکرا کر کہا۔

''اوہ میرے خدا.....؟'' کرن نے اپنی پیشانی ہاتھ سے مسلتے ہوئے کہا ''کیا اتنا کچھ، اور اتنا زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔''

''آپ کیا سمجھتی ہیں مس کرن فاطمہ کہ جتنی پرخلوص اور نیک نیت آپ ہیں باقی سب بھی ایسے ہی ہیں۔'' جہانگیر نے طنزیہ یا مذاز اختیار کیا ''آپ اب اپنے اس پوٹو طیارے سے نکل آیئے، یہاں سب کے سب اپنے لیے چانس بننے اور پھر اس سے فائدہ اٹھانے کے وقت کے انتظار میں لائن میں لگے کھڑے ہیں، جس جس کو موقع ملتا ہے وہ لائن سے نکل جاتا ہے۔ اسے اوپر جانے کا، ترقی کرنے کا چانس اور ٹکٹ جو مل جاتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ بھی اس سے مبرا نہیں ہو۔'' کرن نے مشکوک انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یقیناً۔'' ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر شانے اچکا کر ایک ساتھ کہا۔ ''اس زمانے میں ان وسائل کے ساتھ جو ہمیں یہاں میسر ہیں ایک فیملی کو سپورٹ کرنا بہت مشکل ہے، ہمیں اس دائرے سے باہر نکلنے کا چانس ملا تو ہم ضرور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔'' جہانگیر نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''اور پھر جب بہتر زندگی گزارنے کے مواقع میسر ہوں تو پھر ہم ان سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں؟'' نعیم نے اس کی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو تم۔'' کرن نے کچھ دیر بعد آنکھیں بند کر کے اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگاتے ہوئے سوچا ''موقع میسر ہو اور مقصد کو الٹی لائٹ گزارنا ہو تو کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔'' اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔

.....

''تو چپ چپ کیوں ہے پا؟'' سلمان نے اپنے لیے سیب کاٹتے ہوئے فیضان کو مخاطب کرتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں یار، لے تو سیب کھا۔'' فیضان نے اسے ٹالتے ہوئے پلیٹ اس کے سامنے کی۔

''نہیں، کوئی بات ضرور ہے پا؟ تو، تو ایسے چپ چپ کبھی نہیں رہتا۔'' سلمان نے پیٹ اس کے ہاتھ سے پکڑ کر میز پر رکھتے ہوئے اپنی بات کا جواب لینے پر اصرار کیا۔ ''اب تو میں ٹھیک ہو گیا ہوں میں واپس اپنے کالج بھی جاؤں گا اور خوب پڑھوں گا۔ پھر تو کیوں چپ چپ ہے، تو تو، کہتا ہے کہ جس دن سلمان ٹھیک ہو گیا اس دن تو پورے علاقے میں مٹھائیاں بانٹے گا، تو، تو ذرا بھی خوش نہیں ہے میرے ٹھیک ہونے پر ہے نا پا!''

''میں بہت خوش ہوں سلمان، مجھے ایسے ہی محسوس ہو رہا ہے۔'' فیضان نے اپنے لہجے کے کرب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تیرا، اس باجی سے اس ڈاکٹر والی باجی سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا، اس روز تو اس کے بارے میں کتنے پیار سے باتیں کر رہا تھا، وہ تجھے بہت اچھی لگتی ہے نا پا.....؟'' سلمان نے اچانک ایک ایسی بات کی جس نے فیضان کو چونکا دیا اور اسے سلمان کی ذہنی صحت کی بحالی والی رپورٹ پر یقین آنے لگا..... اسے اچانک شازیہ کی یاد بھی بری طرح ستانے لگی۔ مہ پارہ بیگم کی شاگردی کے چکر میں وہ کافی عرصے سے شازیہ سے رابطہ نہیں کر پایا تھا اور پھر ڈاکٹر عبدالصبور کے انکشاف نے اسے ایک ایسے قلبی دکھ سے ہمکنار کر دیا تھا کہ وہ خواہش کے باوجود اب تک نارمل نہیں ہو پایا تھا۔

اسے شروع سے ہی سلمان سے بے حد پیار تھا۔ وہ اس سے چار پانچ سال چھوٹا تھا اور باپ کی سرد مزاجی اور ماں کی ممتا سے محرومی کے سبب فیضان سے ذہنی طور پر بے حد قریب تھا۔ اس کے سامنے سلمان کا رویہ ہمیشہ بچوں کا سا ہوتا تھا اور وہ خود بھی کم عمری کے باوجود اس کے لیے بڑا بن جاتا تھا۔ اس نے سلمان کے بہت ناز اٹھائے تھے اور اس کی فرمائشیں اور ضدیں پوری کرنا اپنا اولین فرض سمجھا تھا۔ سلمان کے ذہن کے عدم توازن پر وہ عرصے سے پریشان چلا آ رہا تھا۔

مگر جب وہ ذہنی صحت کی مکمل بحالی کے بالکل قریب نظر آیا تو ڈاکٹر صبور کے انکشاف نے اسے سلمان کے دل سے اور احساسات سے دور کر دیا تھا۔ اسے اپنے اور سلمان کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہوتی نظر آنے لگی تھی۔ مہ پارہ بیگم اگر سلمان کی والدہ تھیں اور اس کے علاج معالجے میں ان کی دلچسپی کی وجہ بھی یہی تعلق تھا تو پھر وہ خود کون تھا، وہ کس ماں کی اولاد تھا، اس کی

ماں کہاں تھی، زندہ تھی یا مر چکی تھی، اس کے ذہن میں متعدد ایسے سوال اٹھتے تھے مگر اس کی بے بسی کا عالم یہ تھا کہ وہ یہ سوال کسی سے کر نہیں سکتا تھا، ماسوائے اپنے اس باپ کے جس کے دل میں بقول سلمان کے دل نہیں پتھر دھڑکتا تھا۔ اچانک ہی اسے اپنا آپ سلمان کے سامنے چھوٹا اور حقیر معلوم ہونے لگا تھا۔ وہ کتنا خوش قسمت تھا کہ اس کی ایک ماں تھی، جو زندہ اور موجود تھی، جس کا دل سلمان کی محبت سے لبریز تھا۔ ایسی محبت سے جس کے ہاتھ مجبور ہو کر وہ بہت سی نادیدہ پابندیوں کے باوجود اس کی خبر گیری بھی کرتی تھیں اور یقیناً اس کے لیے دعا گو بھی رہتی ہوں گی۔

جبکہ وہ خود کیا تھا۔ وہ کس سے متعلق تھا۔ بعض اوقات تو اسے ایسا لگتا کہ وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا خود بھی کسی ذہنی بحران کا شکار ہو رہا تھا۔ کبھی اسے مہ پارہ بیگم کا خیال آ جاتا۔ وہ ضعدار خوش گفتار خوش گلو اور آن بان رکھنے والی خاتون سلمان کی والدہ ہو سکتی تھیں تو اس کی کیوں نہیں تھیں۔ اسے اپنے باپ کی پراسرار شخصیت پر غصہ آنے لگتا۔ خدا معلوم وہ عمر بھر کس قسم کے مشاغل میں مصروف رہے اور اب بھی کیا کرتے پھر رہے تھے۔ کیسی ابنارمل زندگی تھی خود ان کی بھی اور ان دونوں بھائیوں کی بھی۔ عمر بھر خود بھی گھر والی کے بغیر زندگی گزاری اور اپنی اولاد کو بھی ماں کی محبت سے محروم رکھا۔

اگر انہوں نے مہ پارہ بیگم سے شادی کی ہی تھی تو اسے سب لوگوں کے سامنے تسلیم کرنے میں کیا حرج تھا اور جب سلمان کی والدہ زندہ تھیں تو اسے ان سے محرومی کی سزا کیوں دی گئی۔ وہ جتنا ان خطوط پر سوچتا اتنا ہی الجھتا جاتا تھا اور انہی الجھنوں کا شکار ہو کر وہ اپنی روزمرہ کی روٹین کے بہت سے کام بھولنے لگا تھا۔ اب وہ آفس سے واپسی پر زیادہ وقت گھر پر یا سلمان کے پاس گزرنے لگا تھا۔ اس انکشاف کے بعد وہ مہ پارہ بیگم کے پاس بھی نہیں گیا تھا، نہ جانے اسے ایسا کیوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان سے نظریں ملا نہیں پائے گا اور ان سے وہ استادی شاگردی والا رویہ بھی قائم نہیں رکھ پائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اتنے عرصے سے اس نے شازیہ سے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔

اس روز سلمان کے یاد دلانے پر اسے اپنی اس زیادتی کا شدت سے احساس ہوا اور اسی رات اس نے شازیہ کو فون کیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ خفا تھی اور افسردہ بھی۔ اس نے شازیہ سے معذرت کر لی۔ اور اپنی دوستی کے بدستور قائم رہنے کا یقین بھی دلایا تھا۔ وہ اپنی طبیعت کے مطابق فوراً ہی مان بھی گئی۔ فیضان کو اس کی سادگی اور معصومیت پر پہلے سے زیادہ رشک آیا۔ ''یہ کتنا اچھا ہے کہ انسان فوراً دوسروں کی بات کا اعتبار کر لے۔ ہاں شکوک تو زندگی کو تلخ بنانے کے سوا کچھ اور کر

ہی نہیں سکتے۔" اس نے سوچا اور جلد ہی شازیہ سے ملاقات کا ارادہ کرتے ہوئے اس نے اسے خدا حافظ کہا تھا۔

.....

"آپ بضد تھیں کہ یہ نوجوان نسل پر خلوص اور قدر دان ہے، آپ نے اپنی اس خوش گمانی کا نتیجہ دیکھ لیا۔" مہ پارہ بیگم کے کانوں میں چوہدری صاحب کی آواز گونجی۔ اس وقت وہ اپنی حویلی کے بیرونی مہمان خانے میں صوفے پر تنہا بیٹھی تھی۔ کمرے میں چوہدری صاحب کے پرفیوم اور سگار کی ملی جلی خوشبو ابھی تک بکھری تھی۔ ان کے سامنے رکھی میز کی براؤن چمکتی سطح پر آبزرور کے تین ایڈیشن بکھرے تھے۔ ان تینوں ایڈیشنز میں قسط وار ان کا وہ انٹرویو شائع ہوا تھا جو انہوں نے کبھی کسی کو دیا ہی نہیں تھا مگر ان انٹرویوز کے مندرجات میں ان کی شخصیت اور زندگی کے وہ پہلو درج تھے جن سے خود انہوں نے اب تک نظریں چرائے رکھی تھیں اور دوسروں کو تو خبر تک نہیں ہونے دی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اب تک انہوں نے جو صحافیوں کے بارے میں سن رکھا تھا اور جتنا وہ خود جانتی تھیں وہ سچ ثابت ہوا تھا۔

"صحافی اگر کسی شخص کی زندگی کے بخیے ادھیڑنے پر اتر آئے تو وہ ٹانکا ٹانکا ادھیڑ دیتا ہے جو نادانستگی میں لگ جاتا ہے اور وہ بھی بظاہر کہیں نظر بھی نہیں آتا" یہ بات انہیں عرصہ پہلے رشید خان صاحب مرحوم نے کہی تھی جو ریڈیو پاکستان لاہور کے میوزک کے پروگرام ترتیب دیا کرتے تھے اور انہوں نے اب تک خان صاحب کی اس بات کو پلے سے باندھ رکھا تھا لیکن اب اس عمر میں ان کی عقل پر نہ جانے کیوں پردہ پڑ گیا تھا جو وہ اس صحافی لڑکے اور لڑکی کی باتوں میں آ گئی تھیں انہیں وہ دونوں محنتی اور پرخلوص کیوں محسوس ہوئے تھے انہیں یہ گمان کیوں گزرا تھا کہ یہ نوجوان نسل فن کی صحیح قدر دان اور فنکاروں کو ان کے مرتبے کے مطابق عزت و احترام سے دیکھنا جانتی تھی۔ وہ چوہدری صاحب کے چلے جانے کے بعد سے لے کر اب تک اسی قسم کی باتیں سوچ رہی تھیں اور جوں جوں سوچتی جا رہی تھیں ان کے ذہن پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا انہوں نے خالی نظروں سے اپنے سامنے رکھے اخباروں پر نظر دوڑائی۔ ان سطور پر ان کا ماضی اور حال کھنگال دیا گیا تھا۔ "مہ پارہ بیگم نے ایک معاہدہ کے تحت فن گائیکی سے ناتا توڑا" ایک شہ سرخی کہہ رہی تھی۔ "ایک مشہور و معروف سیاست دان سے نکاح کے نتیجے میں انہیں فن کی دنیا چھوڑ دینا پڑی۔ وہ شرافت کی زندگی گزارنے کا عوضانہ تھا۔"

"ماضی کی یہ مشہور مغنیہ اپنے اخراجات اور الللے تللے پورے نہ ہو سکنے کی وجہ سے دوبارہ روشنیوں کی دنیا میں قدم رکھنے کے لیے پر تول رہی ہے۔ اپنے پرانے ریکارڈز کو جدید سی ڈیز پر منتقل کرنے کا معاہدہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔"

"حویلی میں موجود قیمتی نوادرات اور سامانِ آسائش و زیبائش میں سے بیشتر مہ پارہ بیگم کے حسن و فن کا عوضانہ ہیں لیکن بہر حال یہ سب قیمتی اثاثہ بننے کے قابل ہیں جن کو حکومتی سرپرستی ملنی چاہیے۔"

وہ ایک کے بعد ایک شہ سرخی پڑھتی گئیں اور ان کی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کی تعداد بڑھتی گئی۔

برسوں کی ریاضت کے بعد بنائی گئی۔ وہ عزت، سر اٹھا کر جینے کے عہد، نام و پتہ پل کے پل میں خاک ہوئے۔ انہوں نے سوچا۔ کتنے ہوں گے جو وضاحتوں پر یقین کریں گے، کتنے ہوں گے جو ان سے وضاحت طلب کریں گے، بہت کم یا شاید کوئی بھی نہیں، سب اپنی اپنی جگہ پڑھیں گے اور تسلیم کر لیں گے کہ مہ پارہ بیگم درحقیقت ایک دوہری شخصیت کی مالک لالچی، خود غرض اور دھوکے باز خاتون کا نام ہے۔

"اوہ میرے خدا، ایسی خوفناک سوالیہ نظروں کا سامنا کرنے سے تو بہتر ہے کہ مجھے موت آ جائے اور خاک مجھے اپنے سینے میں چھپا لے۔" انہوں نے کرب زدہ آنکھیں میچ لیں۔ اسی دم ان کے عقب میں کھٹکا ہوا۔ انہوں نے فوراً اپنے ہاتھ میں پکڑے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ حسب توقع وہ فتح خان تھا وہ خاموشی سے چلتا ان کے سامنے بچھے قالین پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"تم خوب جانتے ہو فتح خان۔" مہ پارہ بیگم نے اپنے بھاری پپوٹے اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم اگرچہ یہ سب پڑھ نہیں سکتے کیونکہ یہ انگریزی زبان میں لکھا ہے لیکن یہ ضرور جانتے ہو کہ یہ سب کیا لکھا ہوگا۔ جب ہی تو پچھلے دنوں اس پرچے کے دفتر میں فون کرتے رہے ہو۔"

"وہ دفتر والی بی بی کل کہہ رہی تھی کہ وہ آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتی ہیں، وہ ان اخباروں اور مضمونوں سے لاتعلقی کا اظہار کر رہی تھی۔" فتح خان کو یاد آیا۔

"جھوٹ بولتی ہے وہ!" مہ پارہ بیگم نے گرج کر کہا۔ "اسی قسم کی باتیں کر کے اس نے مجھے پہلے خود پر یقین کرنے پر مجبور کر دیا اور اب وہ یہی چال دوبارہ چلنا چاہتی ہے وہ کیسا خود کو فن شناس

اور قدروان ظاہر کررہی تھی جو کہانی اس نے اپنے کسی عزیز کے متعلق مجھے سنائی تھی اسی نے مجھے یقین دلایا کہ یہ لڑکی فنکار دوست گھرانے سے تعلق رکھتی ہوگی جبھی اتنا کچھ جانتی ہے مگر حقیقت میں وہ بھی اسی مکار ٹولے کی فرد نکلی جو دوسروں کی شخصیتوں اور کرداروں کے چیتھڑے اڑاتے پھرتے ہیں۔ سختی سے منع کردو اس کو یہاں آنے سے، میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔''

''جیسا آپ حکم کریں۔'' فتح خان نے سر جھکا کر کہا'' آپ ان لوگوں کو نوٹس کیوں نہیں دیتی، ان کو عدالت میں گھسیٹ لائیں، تاکہ آئندہ کوئی جرات بھی نہ کرے ایسی حرکت کرنے کی۔''

''جرات تو آج تک کسی نے کی ہی نہیں تھی یہ جرات تو ہم نے خود انہیں دی کہ وہ ہمارے بارے میں سوچیں اور اس طرح نکتہ طرازیاں کریں۔'' مہ پارہ بیگم نے مضبوط آواز میں کہا۔

''پھر آپ ان پر کیس کروادیں۔'' فتح خان نے اپنی عقل کے مطابق مشورہ دیا۔

''نہیں۔'' مہ پارہ بیگم کے لہجے میں قطعیت تھی۔''ایسا وہ کرتا ہے جس کے من میں چور ہو اور جو چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح پھنکارتا پھرتا ہو ایسا وہ کرتا ہے جو جوش جذبات میں آجاتا ہے ہماری عمر اب ایسے دور سے بہت آگے نکل چکی ہے ہماری عمر کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسی اوچھی باتوں کے جواب میں مکمل خاموشی اختیار کرلیں۔ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ ساری لن ترانیاں اپنی موت آپ مرجائیں گی۔''

''آپ بہتر سمجھتی ہیں۔'' فتح خان نے ہولے سے سر جھکا کر کہا۔

''بیگم صاحبہ فون آیا ہے ان بی بی کا جو رسالے کے دفتر سے آتی ہیں۔'' بسنتی ہاتھ میں کارڈ لیس فون پکڑے اندر داخل ہوئی۔

''مجھے ان بی بی سے کوئی بات نہیں کرنی منع کردو ان کو۔'' مہ پارہ بیگم نے کہا۔

''وہ کہہ رہی ہیں کہ انہیں آپ کی غلط فہمی دور کرنی ہے، اسی لیے وہ آپ سے یہاں آنے کی اجازت مانگنا چاہتی ہیں۔'' بسنتی نے فون کان سے لگا کر منع کرنے کے جواب میں یہ بات سن کر کہا۔

''نہ تو مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، نہ ہی مجھے اسے دور کرنا ہے ان بی بی سے کہہ دو کہ یہ تجربہ اس عمر میں خوب رہا۔ کم سے کم مجھے معصومیت کے اندر چھپی منافقت کا تو بخوبی اندازہ ہوگیا۔''

مہ پارہ بیگم نے کہا بسنتی نے ان کا جواب ریسیور پر دہرا کر آف کا بٹن دبایا۔

''معذرت کرنے کی آڑ میں کوئی اور بات سن کر اس کو کوئی نئی کہانی بنا دیں گی محترمہ۔''

مہ پارہ بیگم دل میں سوچ رہی تھیں۔

''وہ ستار سیکھنے کا شوقین لڑکا تو نہیں آیا۔'' فتح خان کو اٹھتے دیکھ کر انہیں خیال آیا۔''

''نہیں حضور۔''

''بہت سمجھایا تھا اس کو میں نے وقتی شوق کی خاطر وقت اور پیسہ برباد مت کرو۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ دیکھو چند دن کی آمد کے بعد غائب ہوگیا۔''

''ویسے لڑکا تھا خوش مزاج بیگم صاحبہ، اس نے چند دنوں میں ہی اپنی باتوں سے آپ کا دل موہ لیا۔'' فتح خان نے ان کا موڈ بہتر ہوتے دیکھ کر مسکرا کر کہا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔'' مہ پارہ بیگم کو اب وہ لڑکا یاد آنے لگا جو خوش شکل بھی تھا اور خوش مزاج بھی۔ ستار سیکھنے سے زیادہ وہ انہیں ادھر ادھر کی باتوں میں لگائے رکھتا تھا اور ستار بجانے کے دوران اکسا اکسا کر ان سے کسی غزل کا ایک آدھ شعر، کسی گیت کا کوئی بول یا کوئی مشہور دھن ضرور سن لیتا تھا اور پھر شارت سے آنکھ دبا کر کہتا تھا''خدا کی قسم، اگر میں آپ کی جوانی میں آپ سے ملا ہوتا تو فوراً آپ کی شکل صورت، آواز اور انداز اطوار پر جی جان سے عاشق ہوجاتا۔''

وہ ان کا انوکھا شاگرد تھا، جسے وہ واقعی دل سے یاد کررہی تھیں۔

.....

سمعیہ سلطانہ کا پہلا ڈرامہ آن ایئر گیا اور اسے اپنی توقع سے بڑھ کر پذیرائی ملی کیونکہ وہ اس ڈرامے کے آن ایئر ہونے سے پہلے ہی اتنی پبلسٹی اور شہرت پا چکی تھی کہ لوگوں نے اسے ایک ابھرتی ہوئی ہنرمند فنکارہ کے طور پر قبول کرلیا تھا۔ اس نے چند اشتہاروں میں ماڈلنگ کی تھی۔ وہ بھی دیکھنے والوں کو پسند آئے تھے۔ خصوصاً سوفٹ ڈرنک کا وہ اشتہار جس میں وہ اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہتی تھی''ہیوات فادری ایکشن'' اس اشتہار کے بڑے بڑے بورڈ شہر کے مختلف علاقوں میں لگے تھے جن پر سمعیہ سلطانہ کی تصویر پینٹ کی گئی تھی۔ رات کے وقت مصنوعی روشنیوں میں جب یہ بورڈ چمکتے تھے تو سمعیہ کے گھر والوں اور قریبی رشتے داروں کو عجیب سی خوشی اور فخر محسوس ہوتا تھا۔ وہ لڑکی کتنی مشہور ہوچکی تھی، جسے کل تک خاندان میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ خاندان کی لڑکیاں اپنے اسکولوں اور کالجوں میں ہم جولیوں کے سامنے بڑے تفاخر سے اپنے اور سمعیہ کے درمیان رشتے داری کی نوعیت اور قربت کو بیان کرتیں۔ خاندان کے لڑکے امید لگا کر پھلنے لگے تھے کہ سمعیہ کی نظر انتخاب یا نظر عنایت ان پر پڑے اور وہ انہیں اپنے لیے یا پھر کسی

ڈرامے میں کام کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے جائے۔

ایسے میں سمعیہ کی والدہ کو سمعیہ کے پہلے ڈرامے کی کامیابی کا جشن منانے کا خیال سوجھ گیا جس میں وہ دور و نزدیک کے تمام رشتہ داروں اور پرانے محلے داروں کو بلانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ سمعیہ نے بخوشی یہ تقریب بپا کرنے کی رضامندی دے دی تھی اور اب اس کی امی جان جان سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ''دو من چاول، چار من گوشت، پیاز، مسالے، لہسن، ادرک، گھی'' اس روز وہ اپنے حساب سے سامان کی فہرست تیار کر رہی تھیں جب سمعیہ نے ناخن فائل کرتے ہوئے انہیں ٹوکا ''یہ کیا امی، آپ اتنا سامان کا ہے کو منگوانے کا ارادہ رکھتی ہیں؟''

''اے تو دعوت میں کیا لوگوں کو ہوا کھلواؤ گی؟''

امی یوں ٹوکے جانے پر برافروختہ ہو گئیں۔

''یہ میں نے کب کہا؟'' سمعیہ نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا ''میں نے تو محض یہ پوچھا ہے کہ یہ سارا سامان منگوا کر کیا خود دیگیں ٹھنٹھنائیں گی۔''

''میں کیوں ٹھنٹھناؤں گی، کیا شہر بھر کے نائی مر گئے ہیں؟''

''آپ میری بات کا مطلب سمجھے بغیر خفا ہوئے جا رہی ہیں۔'' سمعیہ نے اب کے آواز کی پچ کم کرتے ہوئے کہا ''آپ شاید بھول رہی ہیں کہ اب لوگ ذرا ذرا سی دعوت پر یوں سامان منگوا کر دیگیں نہیں چڑھاتے اب یہ کام کیٹرنگ سروس والوں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ جگہ جگہ نت نئے ناموں والے پکوان سینٹر کھل چکے ہیں۔ اب تو اموات پر بھی لوگ یونہی کھانا منگوا کر کھلا دیتے ہیں۔''

''اے لو۔'' امی نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ میز پر پھینکتے ہوئے کہا: ''خاک ذائقہ ہوتا ہوگا ان نام کے نائیوں کے پکائے کھانوں میں۔ ہمارے ہاں تو شروع ہی سے ایک ہی خاندان نسل در نسل تقریبات پر کھانا پکاتا چلا آیا ہے ان کی آج کی نسل کے بچے بھی یہی کام کرتے ہیں اور جو ذائقہ ان کے ہاتھ اور ترکیبوں میں ہے وہ مجھے تو کہیں اور نظر نہیں آیا۔''

''آپ ذرا ان کے متعلق معلوم تو کریں۔'' سمعیہ نے دوبارہ سے ناخن فائل کرنا شروع کرتے ہوئے کہا ''یقیناً انھوں نے بھی اپنا کوئی کیٹرنگ اور ڈیکوریشن سینٹر کھول لیا ہوگا۔ یہ تو زمانے کا دستور ہوتا ہے امی جسے سب ہنرمند لوگوں کو اپنانا پڑتا ہے۔ یہ جگہ جگہ جو لوگ ایسے سینٹر کھول کر بیٹھے ہیں نا ان کے آباؤ اجداد یہی کام کرتے رہے تھے یہ ان کا خاندانی پیشہ ہے بس اس

کے انداز بدل گئے ہیں۔''

''میں تمھارے ابا سے کہوں گی خود جا کر غلام حسین نائی کے بیٹے کا پتا کریں اگر اس نے بھی یہ سینٹر ویںٹر کھول لیا ہے تو ٹھیک ہے سارا انتظام وہی کر لے گا، ورنہ یہاں آ کر دیگیں پکائے گا پرانے طریقے سے، میں خاندان برادری کو بلا کر اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتی۔'' امی نے فیصلہ دیا۔

''ارے میری بھولی امی، خاندان برادری والوں کو مرعوب کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جدید قسم کی کیٹرنگ سروس والوں سے سارے انتظام کیے جائیں تاکہ لوگوں کو پتا چل سکے کہ ہمارا اسٹیٹس کتنا بدل گیا ہے۔ غلام حسین نائی اور اس کے بیٹے کے ہاتھ کا ذائقہ تو ان سب کو معلوم ہے کوئی نئی چیز چکھائیں ان کو۔''

''میں تو پہلے ہی کہتی ہوں سمعیہ اتنی سیانی نہ ہوتی تو بھلا اتنی ترقی کیسے کرتی۔'' امی کو یکدم ہی بیٹی کی عقل مندی پر ناز ہوا۔ ''تیری بہنوں اور ان کے بچوں کے جوڑے بھی بنوانے ہیں میں نے ابھی، اپنے ڈرائیور سے کہہ کر مجھے بازار تک تو لے چل۔'' پھر انھیں یاد آیا۔ ''وہ لڑکا حسن نہیں آیا اتنے دنوں، اس روز اس کی وجہ سے تیری آپا کے ساتھ خوامخواہ ہی منہ ماری ہو گئی میری۔''

''حسن کی وجہ سے؟'' سمعیہ کو حیرت ہوئی۔ ''وہ کیوں؟''

''بس۔'' امی نے ہاتھ اٹھا کر کہا ''وہی جاہلوں والے سیاپے، جوان لڑکے کے ساتھ سمعیہ سلطانہ کیوں پھرتی ہے، سسرال میں میری عزت خراب ہوتی ہے۔''

''عزت کیا ہوتی ہے یہ ان کے سسرال والے جانتے ہیں کیا؟'' سمعیہ نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

''آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں کہ یتیم مسکین بھانجے کو کس حال میں وہاں رکھا ہوا تھا ان لوگوں نے، اس سلوک سے ان کی عزت بڑھ رہی تھی کیا؟''

''ہاں پر وہ حسن کو تو اپنا لڑکا سمجھتے ہیں، اس کی آڑ میں ہمیں نیچا دکھانے کا موقع خوب ہاتھ آیا ان کے۔

تیری ترقی سے سب جلتے جو ہیں۔'' امی نے خیال ظاہر کیا۔

''اس اپنے لڑکے کو اتنی سی بھی پروا نہیں ہے ان کی۔'' سمعیہ نے انگلیوں سے اشارہ کیا۔ ''وہ تو صرف ہمارے ساتھ تعلق میں خوش رہتا ہے۔''

''جیتا رہے، میں تو صرف اس لیے پوچھ رہی تھی کہ وہ ملے تو اس سے کہوں کہ اس کبوتر کے

کا بک جیسے کمرے کو تالا لگائے رکھ کر اسے کیا کرنا ہے، چھوڑے پرے دفع کرے اسے اللہ اتنا دے رہا ہے تالا کھول کر کمرہ تیری بہن کے حوالے کردے تو وہ تو میرے پیچھے سے اترے۔'' امی نے اصل بات اب بتائی تھی۔

''مجھے امید نہیں کہ وہ ایسا کرے گا۔ اس کے بقول اس نے وہ کمرا اپنی زندگی کے اس دور کی یادگار کے طور پر اپنی ملکیت میں رکھا ہے جب وہ انتہائی مشکل زندگی گزار رہا تھا۔ آپ کو تو یاد ہوگا اس کا رہنا سہنا، حال حلیہ۔'' سمعیہ نے ناخنوں پر بیس کوٹ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو، کیسا باؤلا سا لگا کرتا تھا، اب اسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ وہی لڑکا ہے۔'' امی نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ انتہائی ذہین ہے اور ٹیلنٹڈ بھی، بس اسے اپنا ہنر استعمال کرنے کے لیے فورم اب ملا ہے، دیکھیے گا وہ کتنی ترقی کرتا ہے۔''

''چلو جیسا بھی ہے، تمہاری تو مٹھی میں ہے اب، اس سے اپنی بہن کے لیے کمرے کی بات ضرور کرنا، بے شک وہ بعد میں جب چاہے قبضہ اس سے واپس لے لے۔'' امی زمانے کی نئی چالیں دیکھ بھی رہی تھیں اور سیکھ بھی رہی تھیں۔ سمعیہ کو حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔

''تمہاری مٹھی میں ہے۔'' امی کے کمرے سے جانے کے بعد سمعیہ نے دل میں ان کی کہی بات دُہرائی۔ ''کون کس کی مٹھی میں ہے آپ کیا جانیں میری بھولی امی۔'' اس نے سوچا، اسے حسن کمال کی مسحور کردینے والی گفتگو اور شخصیت یاد آنے لگی۔ اپنی کچھ عرصے پہلے کی زندگی میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حسن کمال جیسی آئیڈیل شخصیت یوں اس کے قریب آجائے گی اور جو وہ قریب آیا تھا تو سمعیہ نے سوچا تھا کہ اس سے بہتر شخص اس نے دنیا میں کوئی دوسرا کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔

''یہ تو طے ہے کہ برادری والوں کی دعوت میں سب سے پہلے تمہیں مدعو کیا جائے گا، کیونکہ تم برادری کے ممبر بھی ہو اور دل پر بھی تمہارا قبضہ ہے۔'' اس نے سوچا اور مسکرادی تھی۔

.....o.....

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم اتنے الجھے ہوئے اور پریشان کیوں ہو۔'' شازیہ نے فیضان کو غور سے دیکھتے ہوئے تیسری مرتبہ یہ بات کہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صبور کے ساتھ کام کرکر کے تم بھی سائیکولوجسٹ بننے کے چند

مراحل طے کر چکی ہو جب ہی تمہیں میرے رویے اور کیفیت میں الجھاؤ اور پریشانی نظر آرہی ہے۔'' فیضان نے مسکرا کر اسے ٹالا تھا ''تم آج صرف اپنی بات کرو، یہ بتاؤ کہ میرے عدم رابطے پر تم نے کیا سوچا تھا، میں کہاں غائب ہوگیا ہوں گا۔''

''وہی عام سی سوچ جو کوئی بھی ایسی صورتِ حال میں سوچ سکتا ہے۔'' شازیہ نے سادگی سے اعتراف کیا۔

''مثلاً.....؟'' فیضان کو اس کی گھبراہٹ پر مزہ آنے لگا۔

''مثلاً یہی کہ امیر آدمی ہے، دو چار ملاقاتوں کی دل لگی کے بعد غائب ہوگیا۔''

''میں نے دل لگی کب کی سچ بتاؤ؟'' فیضان کو اس کی بات پر بے اختیار ہنسی آگئی۔

''دوستی کی بات بھی تو دل لگی ہوسکتی ہے۔'' شازیہ نے اس کے ہنسنے پر جھینپ کر کہا۔

''دوستی کے سلسلے میں میری ایک ہی پالیسی ہے۔'' فیضان نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ''اول تو کرو نہیں لیکن اگر کرو تو زندگی بھر نبھاؤ۔'' اس کی اس بات سے شازیہ کو عجیب سا اطمینان محسوس ہوا۔

''لیکن اس سلسلے میں تمہاری دلیل کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ تم پریشان ہو کسی بات پر یہ اور بات ہے کہ مجھے بتانا نہیں چاہتے۔''

''تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں کس بات پر الجھا ہوا ہوں؟''

''سلمان کی وجہ سے۔'' شازیہ نے اپنا اندازہ بتایا۔

''وہ تو اب بہت بہتر ہے۔''

''پھر جاب کا کوئی مسئلہ ہے؟''

''نہیں۔'' فیضان نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر؟'' شازیہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ''بہتر ہے کہ تم خود ہی بتادو۔''

''میری پھوپھو اور تائی اماں نے میرے لیے ایک لڑکی پسند کرلی ہے اور وہ میری شادی اس سے کرنا چاہتی ہیں۔'' فیضان نے اچانک اپنی الجھن کی توجیہہ گھڑی۔ شازیہ اپنا ردعمل اس سے چھپا نہیں سکی۔ وہ یکدم خاموش ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''میں سوچتا ہوں کہ کسی انجانی لڑکی، کسی اَن دیکھی لڑکی سے شادی کر کے میں خوش رہ سکتا ہوں۔'' فیضان نے یہ بات دانستہ کہی تھی اسے شازیہ سے اسی ردعمل کی توقع تھی۔ یہ وہ دیکھنا چاہتا

تھا کہ شازیہ اس کے معاملے میں سنجیدہ تھی یا نہیں۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس کی خاموشی پر فیضان نے اسے بولنے پر اکساتے ہوئے کہا۔

''مجھے کیا معلوم.....؟'' شازیہ نے نظریں چراتے ہوئے کہا ''میرا خیال ہے کہ مجھے دیر ہو رہی ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔'' وہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اچانک تمہیں دیر ہو جانے کا خیال آ گیا۔'' فیضان اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہونے لگا۔ ''بیٹھو ابھی مجھے تم سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں۔''

مگر شازیہ اس کی بات سن کر جس کیفیت کا شکار ہو چکی تھی اس کا اظہار اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا وہ فیضان کی نظروں سے دور ہو جانا چاہتی تھی، اس کے دل کی دنیا آباد ہونے سے پہلے ہی مسمار ہو گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ فیضان نے اپنی ٹانگ ذرا سی بڑھا کر اس کا راستہ روک دیا۔

''شازیہ، مجھے تم سے اس احمقانہ حرکت کی توقع نہیں تھی، بیٹھ جاؤ اور میری پوری بات سن لو۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ وہ دونوں اس وقت ایک ریستوران میں بیٹھے تھے شازیہ نے اردگرد نظر ڈالی سب لوگ اپنی باتوں میں مشغول تھے وہ بے بسی کے عالم میں دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''کمال ہے، ڈاکٹر صبور کے ساتھ کام کر کے بھی تمہیں تو دوسروں کے متعلق اندازہ لگانا بھی نہیں آیا، میں تو یونہی خوش گمان ہو رہا تھا۔'' فیضان نے مسکراتے ہوئے کہا ''ارے احمق کوئی میرے لیے لڑکی وڑکی نہیں دیکھ چکا، یہ تو میں نے یونہی تمہیں تنگ کرنے کو کہا تھا اور دیکھ لو تم پکڑی گئیں۔'' شازیہ کو یکدم ہی اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہوا۔

''اگر میرے دل میں تمہارا خصوصی خیال نہ ہوتا تو میں کبھی بھی تم سے اتنی مرتبہ نہ ملتا، مجھے دوسروں کے خصوصاً لڑکیوں کے جذبات سے کھیلنے کا کوئی شوق نہیں۔'' پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں جانچ لیا اور پرکھ بھی لیا اس معاشرے میں کم ہی لڑکیاں تمہاری طرح ورکنگ کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی باحیا اور پرخلوص نظر آتی ہیں۔ میں تمہارے کردار، معصومیت اور سادگی کو سلیوٹ کرتے ہوئے تمہیں پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔''

اگر فیضان کی پہلی بات شازیہ کے لیے سرپرائز تھی تو یہ دوسری بات بھی اتنی ہی غیر متوقع تھی۔

''میرے اور تمہارے درمیان حیثیت کی ایک بہت بڑی دیوار کھڑی ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔'' اس کا اعتماد بحال ہوا تو اس نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''سب ہمارے اپنے تصورات ہیں جس نادیدہ دیوار کا ذکر تم کر رہی ہو وہ بھی وہم کا کرشمہ ہے، سوچیں تو ہے نہ سوچیں تو کہیں نہیں ہے۔ میں نے اس کے بارے میں نہ کبھی سوچا ہے نہ سوچوں گا۔ مجھے اس شخصیت سے غرض ہے جس کے ساتھ مجھے زندگی گزارنی ہے۔'' فیضان نے اعتماد سے کہا۔

''تمہارے لیے نہ ہو، مگر تمہارا بیک گراؤنڈ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنے کا متقاضی ہے۔ تم نہ سہی، تم سے متعلق لوگ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔'' شازیہ نے کہا۔

''مجھ سے متعلق لوگ.....؟'' فیضان نے ابرو چڑھا کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''خصوصاً تمہارے والد۔'' شازیہ اپنی رو میں کہے گئی۔

''ہیل وِد متعلقین!'' وہ جھلا کر بولا ''خود تو وہ جگہ جگہ نکاح کر کے ان کی نشانیاں پیدا کرتے پھرے اور میری دفعہ حیثیت کی دیوار کھڑی کریں گے۔ تم اس وہم کو دل میں مت لاؤ میں نے یہ فیصلہ تمام سیاق وسباق سوچ کر ہی کیا ہے، مجھے کچھ وقت کی مہلت دو، میں تمہیں اسی عزت کے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں گا جس عزت کی تم مستحق ہو۔'' شازیہ کا دل خدا کے حضور شکر گزار ہوا۔ اس کے دل میں تفاخر کا جذبہ ابھرا اور فیضان کے لیے احترام بھی۔

''چلو، اب میں تمہیں چھوڑ آؤں۔'' کچھ دیر بعد فیضان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور اس کے ساتھ چلتا ریستوران سے باہر آ گیا۔

کلینک تک پہنچنے کے دوران فیضان نے اسے مہ پارہ بیگم کے سلسلے میں ہونے والی پروگریس سے آگاہ کیا۔

''مجھے بھی یہ شک گزرا تھا، وہ اتنے اعتماد سے اپنے نام کے ساتھ مسز گورائیہ کیسے لگا سکتی تھیں، مگر پھر تمہاری والدہ؟'' شازیہ اپنی بات کہتے کہتے تذبذب کا شکار ہو کر خاموش ہو گئی۔

''مجھے زندگی میں اس بارے میں کبھی تجسس نہیں ہوا لیکن اب ہے، بہت ہے اور یقیناً میرا تجسس مجھے میری والدہ تک لے ہی جائے گا۔'' فیضان نے گاڑی کلینک کے سامنے روکتے ہوئے کہا ''اور یقین جانو کہ میری الجھن اور پریشانی کی وجہ بھی یہی بات تھی وہ ہرگز نہیں جو میں نے تم

سے کہی تھی۔'' شازیہ کے اترنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ شازیہ اب اس کی الجھن کی تہ تک پہنچ چکی تھی اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

.....

''ایک ملاقاتی آئے بیٹھے ہیں حضور، ان کے متعلق کیا حکم ہے؟'' مہ پارہ بیگم اپنے معمول کے ریاض سے فارغ ہوئیں تو فتح خان نے اطلاع دی۔

''کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، ایک تو تم ہر تھوخیرے کے بارے میں اطلاع دینے چلے آتے ہو۔'' مہ پارہ بیگم نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''رشید طاہر نام بتاتے ہیں جی، ان کے ساتھ عمیر نام کا ایک نوجوان بھی ہے اور آپ کو اطلاع اس لیے دی جی کہ'' فتح خان نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا'' وہ صاحب نابینا ہیں حضور، ان کے ہاتھ میں سفید چھڑی ہے اور وہ وہیل چیئر پر آئے ہیں گاڑی میں ساتھ رکھی تھی، وہیل چیئر۔''

''اوہ.....!'' مہ پارہ بیگم کو آنے والے کے متعلق سن کر تعجب بھی ہوا اور ہمدردی بھی محسوس ہوئی'' تم مہمان خانہ کھول کر انھیں بٹھاؤ، میں آتی ہوں۔''

''میرا نام رشید طاہر ہے، یہ میرا بھتیجا ہے عمیر زاہد۔'' وہ مہمان خانے میں آئیں تو آنے والے ملاقاتی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا'' میں آپ کا ایک پرانا پرستار ہوں۔ عرصے سے خواہش تھی آپ سے ملاقات کی مگر اپنی معذوری کی وجہ سے آ نہ سکا۔''

''ذرہ نوازی ہے آپ کی۔'' مہ پارہ بیگم نے انکسار سے کہا'' آپ نے اس ملاقات کی خاطر اتنا تردد کیا۔'' جواب میں آنے والے نے اپنی جوانی میں ان کی محافل موسیقی میں شرکت کی کئی باتیں سنائیں۔ ان باتوں نے مہ پارہ بیگم کو اور بھی متاثر کیا۔ پھر آنے والے نے اپنی آمد کا اصل مقصد بیان کیا۔

''شاید میں ہمیشہ کی طرح ارادہ باندھتا ہی رہ جاتا مگر اب بات ہی کچھ ایسی ہوگئی کہ مجھے آئے بنا چارا نظر نہیں آیا۔'' رشید صاحب نے متانت سے کہا۔

''فرمایئے، کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' آنے والے کے مودب لہجے نے انھیں متاثر کیا تھا۔

''میری بھتیجی کرن فاطمہ ماہنامہ اون لکر میں کام کرتی ہے، آپ سے ملاقات کے لیے غالباً ایک یا دو بار یہاں آ بھی چکی ہے۔''

''اوہ!'' مہ پارہ بیگم کو یاد آ گیا اور ان کی آمد کی وجہ بھی سمجھ آ گئی۔'' اس سلسلے میں آپ کیا

بات کرنے آئے ہیں؟'' ان کی آواز درشت ہوگئی اور پیشانی پر بل بھی پڑ گئے۔ رشید صاحب نے ان کے لہجے میں در آنے والے فرق کو فوراً محسوس کر لیا۔ وہ اس کی وجہ بھی سمجھتے تھے۔

''دراصل ایک بڑی غلط فہمی کی وجہ سے آپ کرن فاطمہ اور اس کے میگزین سے بدگمان ہو گئیں۔ کون فاطمہ نے آپ کی غلط فہمی کو دور کرنے اور آپ سے ملاقات کی اجازت طلب کرنے کے لیے کئی مرتبہ آپ کو فون کیا مگر آپ اس درجہ ناراض تھیں کہ آپ نے سختی سے منع کر دیا۔''

''تو آپ کا کیا خیال ہے مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟'' مہ پارہ بیگم کا رویہ اب کے تو یکسر ہی بدل گیا'' میں تو معاف کیجئے گا اگر یہ جانتی ہوتی کہ آپ کس سلسلے میں یہاں تشریف لائے ہیں تو آپ کو بھی منع کر دیتی۔ مجھے ایسی مروت دکھانے کی عادت نہیں جس میں خود پر جبر کرنا پڑے۔''

''آپ کی ناراضی بالکل بجا ہے۔'' رشید صاحب نے تحمل سے کہا'' آپ جو سمجھ رہی ہیں اس کے مطابق آپ کا رویہ بھی درست ہے، لیکن کیونکہ ہمارا خاندان فن کا قدردان ہے اور بطور خاص ہم سب آپ کے فن کے پرستار ہیں اس لیے جیسے بھی ممکن ہوتا ہم آپ کی غلط فہمی دور کرنا اور آپ کو جس ذہنی کوفت سے گزرنا پڑا اس کے لیے معذرت کے لیے ضرور حاضر ہوتے۔''

''آپ کی بھتیجی معاف کیجئے گا ٹھہری اس دور کی صحافی جسے ہر چہ بیچنے سے سروکار ہے نا کہ صحافت کی اعلیٰ روایات اور اخلاقی اقدار سے۔'' مہ پارہ بیگم نے طنزاً کہا۔

''آپ چونکہ معاملے سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اس لیے یوں برہم ہیں۔'' رشید صاحب نے بدستور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ جو بھی سمجھ لیں، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ بہتر یہی ہوگا کہ آپ اس موضوع پر بات نہ ہی کریں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ہم بات ہی یہ کرنے آئے ہیں۔'' رشید صاحب مسکرا کر بولے اور مختصراً اون لکر اور آبزرور کا فرق اور حسن کمال کے ایک جگہ سے دوسری جگہ اچانک اور خاموش سفر کی کہانی ان کے گوش گزار کرنے لگے۔

''آپ کی طرح خود میرا اور میری بھتیجی کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ نوجوان جتنا ذہین اور اپنے کام کا ماہر ہے یہ اپنے پیشے میں کسی قسم کی بے اصولی کر ہی نہیں سکتا مگر اس قسم کے یقین، توقعات اور امیدیں اب ہمارے آپ جیسے چند گنے چنے لوگوں کا خاصہ ہی بن کر رہ گئی ہیں، جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دور خود غرض، بے اصول اور مطلب پرست لوگوں کا ہے۔ وضعدار اور با اصول لوگوں کی شرافت اور سادگی

سے فائدہ اٹھانا ان کا وطیرہ بن کر رہ گیا ہے۔'' رشید صاحب نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بھتیجی کے بارے میں اس سے ملاقات کے بعد میرا پہلا خیال یہی تھا کہ وہ فن شناس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔'' مہ پارہ بیگم یہ تفصیل سننے کے بعد کچھ نرم پڑتے ہوئے بولیں۔ ''ورنہ جہاں اتنے برس یونہی گزر گئے تھے خاموشی اور گمنامی کی زندگی گزارتے گزارتے وہاں چند مزید بھی گزر جاتے تو کچھ حرج نہ تھا لیکن آپ کی بھتیجی کی گفتگو سننے کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا کہ ایک دور کی ثقافت کے امین ہم بھی ہیں اپنا تو شاید چل چلاؤ کا زمانہ ہے، کیوں نہ ثقافت کی اس تاریخ کو اگلی نسل کے گوش گزار کر دیا جائے، شاید کل کسی کو اس تاریخ کے رقم کرنے میں آسانی ہو، مگر یہاں تو صاحب معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ یقین جانیے جتنی ذہنی کوفت اور دلی تکلیف مجھے اس سارے معاملے میں پہنچی ہے وہ میں شاید بیان نہ کر سکوں۔ میں نے ایک عمر عوام کے لیے گاتے گزاری۔ تب بھی فنی اور ذاتی زندگی میں فرق قائم رکھا اور کسی کو جرأت نہ ہو سکی میرے کسی ذاتی معاملے پر قلم اٹھانے کی، مگر اب جرأت اور ہمت کا لفظ تو صحافت کی لغت سے ہی نگل گیا اب تو صحافت بے باکی اور لغویات کا نام بن کر رہ گئی ہے۔''

''آپ درست فرما رہی ہیں، میں ایک مرتبہ پھر..... اپنی بھتیجی اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ یقین کیجیے جو بھی ہوا اس میں کرن فاطمہ کی کوئی بدنیتی شامل نہیں بلکہ حسن کمال کے اس اقدام سے تو خود اون لکر کے سارے ادارے کو شدید دھچکا پہنچا ہے۔''

''ہم تو آپ کے ریکارڈز پر کام کے آخری مراحل تک پہنچ چکے تھے اور آپ کی سی ڈیز مارکیٹ میں آنے ہی والی تھیں جب یہ سارا واقعہ ہو گیا، ہم نے اپنا کام وہیں روک دیا کیونکہ ہمیں علم نہیں تھا کہ اس سب کے ردعمل کے طور پر آپ کیا کرنے والی تھیں۔'' رشید صاحب کے ساتھ آنے والے نوجوان نے کہا۔

''جبکہ ہمارے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ آپ نے بغیر کسی پرانی شناسائی کے ہمیں اس اختیار سے نوازا کہ آپ کے ریکارڈز پر کام کر سکیں۔'' رشید صاحب نے عسیر کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ لوگوں کے اصول اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کے اس عمل سے بے حد متاثر ہوئی ہوں۔ یقین کیجیے کہ آپ کے اس عمل اور وضاحت سے میری بیشتر کوفت رفع ہو گئی۔'' مہ پارہ بیگم نے ایک دم ہی اپنے پرانے ٹریک پر آتے ہوئے کہا ''رشید صاحب آپ سے ملاقات کر کے

طبیعت خوش ہو گئی۔ فن کی تاریخ سے اس قدر شناسائی رکھنے والے آپ ایسے لوگ تو اب شاذ و نادر ہی ملتے ہیں بلکہ میرا خیال تھا کہ جو چند گنے چنے ایسے لوگ رہ گئے ہیں اس شہر میں ان سے میری واقفیت ہے، لیکن آپ نہ جانے کہاں چھپے رہے اب تک جو آپ سے ملاقات اتنی دیر سے ہوئی۔''

''گویا آپ کے دل میں اب کرن فاطمہ سے کوئی ناراضی باقی نہیں رہی۔''

''یقیناً ایسا ہی ہے۔ اس سے کہیے گا کہ وہ مجھے آ کر ملے۔ اس لڑکے حسن کمال کی لکھی بلبل ہزار داستان ایسی کہانی کے منہ توڑ جواب دینے کا ایک طریقہ یہی ہے کہ میں خود ''اون لکر'' کے لیے مکمل انٹرویوؤں تاکہ پڑھنے والوں کو غلط اور صحیح کا فرق معلوم ہو جائے۔ اس سلسلے میں اب مجھ سے جو بھی بن پڑا میں ضرور کروں گی۔'' مہ پارہ بیگم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

.....

''تم یہ ضرور لکھو کہ یہ جو اس لڑکے حسن کمال نے دال میں کچھ کالا ہونے کی اختراع استعمال کی ہے یہ محض اس کے شیطانی ذہن کا شاخسانہ ہے، دراصل مہ پارہ بیگم نے ایک صاف ستھری بے داغ زندگی گزاری ہے، جس کے گواہ ان کے ناقدین بھی رہے ہیں یہ جو دال میں کالے والی سنسنی خیزی پیدا کی گئی ہے یہ محض بیمار ذہن کی پیداوار ہے۔'' مہ پارہ بیگم نے کرن فاطمہ سے اپنے خصوصی انٹرویو کے دوران ایک موقع پر زور دے کر کہا۔ کرن نے سردیوں کی پھیلی دھوپ میں ان کا روشن چہرہ دیکھا جو خفگی اور غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور قلم دانتوں میں دبا کر مسکرا دی۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ قدیم حویلی کا وہ وسیع صحن اس کے ایک طرف بنا گھاس کا قطعہ، سنگ مرمر کا تخت، ''کیسا رومینٹک منظر ہے۔'' اس نے ایزی چیئر پر جھولتے ہوئے سوچا۔

''آبزرور کے تازہ ایڈیشن میں آپ پر چھپنے والے مضمون میں لکھا ہے کہ ماضی میں آپ کا کسی فیوڈل لارڈ سے زوردار قسم کا معاشقہ چلا۔'' جہانگیر نے بغل میں دبا تازہ اخبار نکال کر پھیلاتے ہوئے کہا ''افوہ، یہ جہانگیر۔'' کرن نے اپنے ردمینڈم سے نکلتے ہوئے دانت پیسے۔ بالکل ہی غلط موقع پر یہ نئی اطلاع پہنچانے بیٹھ گیا اور پھر ڈرتے ڈرتے مہ پارہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ ان کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا تھا۔

''وقت گزر جاتا ہے اور شرمناک ترین اسکینڈل دلچسپ تاریخی حقائق میں بدل جاتے ہیں۔'' وہ استہزائیہ انداز میں مسکرا کر بولیں۔ ''صرف معاشقے تک محدود رہے برخوردار کہ اس سے آگے بھی پہنچے کہیں۔''

''جی بات صرف معاشقے تک ہی محدود رہی ہے۔'' جہانگیر نے کرن کے تیور دیکھتے ہوئے بات سنبھالنے کی کوشش کی ''اور آپ کو تو معلوم ہی ہے بیگم صاحبہ کہ اس طریقے سے بڑی شخصیات کو اسکینڈلائز کرنا اب ایک پرانا حربہ بن گیا ہے۔''

''چاہیے تو یہ تھا کہ اس ساری بکواس کے جواب میں کم از کم ایک نوٹس تو آبزرور کی طرف جاتا، یوں خاموش رہنے پر ہی تو وہ شہہ پکڑتا جا رہا ہے۔'' فہیم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''نوٹس بھجوانے کا کوئی فائدہ نہیں، اس ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں جو ایسی ہرزہ سرائی کرنے والے کی گردن دبوچ لے۔ الٹا نوٹس بھجوائے جانے پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے والے نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ نوٹس تو دال میں کالے کو مزید کالا بنانے کا باعث بنے گا۔''

مہ پارہ بیگم نے اپنی عینک آنکھوں پر جماتے ہوئے جہانگیر کو اخبار پکڑانے کا اشارہ کیا۔

''چھوڑیں مہم، اس مضمون کا قصہ ذہن سے نکال ہی دیں۔ آپ اپنی بات جو ہمیں لکھوا رہی ہیں وہ سمجھئے کہ اس کا جواب بھی ہوگی اور من وعن ہی شائع ہوگی۔'' کرن نے اخبار ان کے ہاتھ میں آنے سے پہلے جلدی سے کہا۔

''تعلقات کس انسان کی زندگی میں نہیں بنتے۔'' مہ پارہ بیگم نے دوبارہ سے اپنی گفتگو کا سلسلہ پہلی بات سے جوڑتے ہوئے کہا ''مگر وہ لوگ جو عوام میں مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں ان کے لیے تعلقات بھی ایک آزار بن جاتے ہیں۔ وہ جتنا بھی پھوک پھوک کر تعلق بنائیں۔ انھیں بخشا نہیں.....''

''میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ آپ سے درخواست کی تھی بیگم صاحبہ'' ان کی بات کو عقب سے آنے والی آواز نے کاٹ دیا۔ ان سب نے بیک وقت گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ ایک لمبی اونچی شخصیت ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ ''یہ کون ہیں'' کرن نے سوچا، ہاں وہ انھیں جانتی اور پہچانتی تھی مگر فوری طور پر ان کا نام اسے یاد نہیں آیا۔

''مگر آپ کو ایک عمر گزارنے کے بعد غالباً اب خیال آیا کہ شہرت کے مزے لوٹے جائیں۔ انٹرویوز دیے جائیں اور غلط بیانیوں کے چسکے لیے جائیں۔'' وہ شخص تقریباً گرج کر کہہ رہا تھا۔

کرن، جہانگیر اور فہیم نے استفہامیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''صحافیوں کے اس ٹولے میں بیٹھی آپ خود کو کیا سمجھ رہی ہیں میں خوب جانتا ہوں، مگر آپ کے اس نئے شوق نے مجبور کر دیا کہ آپ کو براہ راست اس سے منع کر دوں۔ اس صحافی جماعت سے کہیے کہ اپنے کاغذ،

قلم اور کیمرے سمیت یہاں سے عزت سے اور جلد از جلد رخصت ہو جائے۔'' اس شخص نے اپنی بات مکمل کی اور باز و پیچھے باندھ کر بیرونی کمروں کی طرف چل دیا۔

کرن نے ایک مرتبہ پھر جہانگیر اور فہیم کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھیں تقریباً پھیل گئی تھیں۔

''یہ.....یہ.....'' کرن نے تھوک نگلتے ہوئے مہ پارہ بیگم سے پوچھنے کی کوشش کی۔

''تم فکر مت کرو اور اس بے محل بات کو بھول جاؤ، ہم اس انٹرویو کا بقیہ حصہ پھر کسی دن مکمل کر لیں گے، میں تمھیں خود فون کر دوں گی۔'' مہ پارہ بیگم نے خود اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کرن ان کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے اپنی بکھری چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ڈالیں اور جہانگیر اور فہیم کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مہ پارہ بیگم سے رخصت ہونے کی اجازت مانگنے لگی۔

.....

''یہ ناقابل یقین تھا.....اور بہت شاکنگ۔'' واپسی پر جہانگیر نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

''لوگ ٹھیک کہتے ہیں بڑے لوگوں کے سارے معاملات ہی بڑے ہوتے ہیں۔'' فہیم نے رائے زنی کی ''مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔''

''وہ شخصیت تھی کون جس کا اتنا رعب داب ہے اس حویلی کے مکینوں پر سمیت مہ پارہ بیگم کے۔ پہلے تو نظر نہیں آیا تھا نہ ہی اس کی موجودگی کے کوئی آثار تھے وہاں۔'' جہانگیر کہہ رہا تھا۔

''کیوں کرن، تم کچھ نہیں بول رہیں؟''

''ذرا خاموش رہو۔'' کرن نے ڈپٹ کر کہا ''مجھے یاد کرنے دو کہ وہ شخص کون تھا وہ ایک مشہور شخص ہے، اس کا نام کیا ہے بھلا.....؟'' اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا نام چوہدری مقصود احمد گورائیہ ہے۔'' دو دن بعد جب مہ پارہ بیگم نے اسے فون کر کے اکیلے آنے کے لیے کہا تو اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کی الجھن دور کی۔ ''وہ ایک مشہور سیاسی شخصیت ہیں، کئی بار قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور فیڈرل گورنمنٹ کے منسٹر بھی رہے ہیں۔''

''لیکن آپ کا، میرا مطلب ہے ان کی یہاں موجودگی؟'' کرن نے اٹکتے ہوئے کہا ''میرا مطلب ہے کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا، یقین جانیے کہ یہ بہت غیر متوقع تھا۔''

''تمہاری اسی الجھن کو دور کرنے کے لیے تو میں نے تمھیں یہاں بلایا ہے۔'' مہ پارہ بیگم نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''سوچتی ہوں کہ اوپر تلے ایسے واقعات ہو رہے ہیں جن سے

بچنے کی عمر بھر کوشش کرتی رہی۔ میں نے یہ عزت اور اس پس منظر کی آن بان سنبھالے رکھنے کے لیے بہت کچھ قربان کر دیا، لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ زندگی کے وہ پہلو جن پر ہم پردہ ڈالے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی نہ کبھی ظاہر ہو کر ہی رہتے ہیں۔ میں مطمئن رہتی تھی کہ ایک عمر تو گزر گئی اب میری زندگی تھوڑی ہی باقی رہ گئی ہے یہ بھی کٹ جائے گی تو میرے مرنے کے بعد لوگ بے شک جیسی مرضی آئے نکتہ آرائیاں کرتے رہیں مگر ایسا ہونا شاید ممکن نہیں ہے جبھی قدرت نے اس لڑکے حسن کمال کو جستجو پر لگا دیا۔''

کرن نے محسوس کیا کہ اس روز وہ بہت مایوس اور بجھی بجھی سی نظر آ رہی تھیں۔

''پرسوں سے سوچ رہی ہوں کہ دل میں چھپائی بات کہہ ڈالوں۔'' وہ پھر گویا ہوئیں۔ ''مگر کس سے، بہت سوچا پھر تمہارا خیال آیا، تم جو فنکار کی حساسیت کو سمجھتی ہو اور اخلاقی اقدار اور روایات کی پاسداری بھی کرنا جانتی ہو، قدرت نے شاید تمہیں بھی ادھر اسی لیے بھیجا۔''

''میں.....'' کرن نے کہنا چاہا ''الفاظ میرا ساتھ نہیں دے پا رہے میم، میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔''

''مگر یاد رہے کہ جو میں تمہیں بتانے والی ہوں وہ تم تک ہی محدود رہے گا، ہاں کیونکہ تم اسی میدان صحافت کی کھلاڑی ہو، میری سنائی بات کو کسی ایسے رنگ میں ضرور اپنے الفاظ میں کہہ دینا کہ اس لڑکے حسن کمال کا قلم پھر دوبارہ کسی کی چادر تک نہ پہنچ پائے۔''

''کاش ایسا ممکن ہو سکے۔'' کرن نے دل میں دعا مانگی۔

''اس روز وہ شخص جو تم لوگوں کے سامنے ایک مختصر تقریر کر کے گیا تھا وہ چوہدری مقصود احمد گورائیہ تھا۔'' انھوں نے دوبارہ سے بتایا۔ کرن کو بالکل ٹھیک طرح سے یاد آ گیا تھا کہ وہ شخص کون تھا۔

''یقیناً یہی وہ فیوڈل لارڈ ہے جس کو تاریخ کے صفحات سے حسن کمال نے کھنگال کر نکالا تھا، مگر بات معاشقے کی نہیں تھی۔ معاشقہ ایک عام سا نام ہے اور یہ ہر جگہ پر نہیں ہوتا۔ کچھ تعلقات اس سے ماورا ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک تعلق میرے اور مقصود احمد گورائیہ کے درمیان بندھا تھا۔'' وہ کہہ رہی تھیں اور ان کی نظر دور کہیں ماضی میں جھانک رہی تھی۔

''یہ آج سے تقریباً اٹھائیس انتیس سال پہلے کی بات ہے جب یہ شخص مقصود احمد گورائیہ اسی حویلی میں بپا ہونے والی ایک محفلِ موسیقی میں غزل سننے کے لیے آیا تھا۔ اس وقت یہ گورنر پنجاب کا مشیر تھا۔ نئی نئی فوجی حکومت قائم ہوئی تھی اور ہر طرف ایک ہراس کا سماں تھا۔ حکومتیں بدل

جائیں تو براہِ راست نہ سہی بالواسطہ فنکار کے فن پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں اور وہ تو تھی بھی فوجی حکومت، جس نے ایک جمہوری حکومت کا خاتمہ کر کے اپنے آہنی ہاتھ ہر طرف پھیلا رکھے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب چوہدری مقصود جیسے کئی اور بھی سامنے آئے تھے۔ ہمیں ہمارے استاد اور مخلصین بطورِ خاص مشورہ دیتے تھے کہ اپنے فن کو اور ذریعہ معاش کو زندہ رکھنا ہے تو اس حکومت کے چند خاص لوگوں کو اپنی مٹھی میں کرنے کی کوشش کرو۔

میرا معاملہ باقیوں سے ذرا مختلف اس لیے تھا کہ میں نے شروع ہی سے کبھی اس قسم کے ہتھکنڈے اپنے فن کو ترقی دینے کے لیے اختیار نہیں کیے تھے سو میں نے بطورِ خاص یہ کوشش اس وقت بھی نہیں کی تھی۔ چوہدری مقصود اور گورنر پنجاب کے چند اور ساتھی اس رات خود سے ہی ادھر آ گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس رات کو ہمارے استاد صاحب غلام حسین زندہ نے ''ایک شب بیادِ خسرو'' کا نام دے رکھا تھا اور میں نے پوری رات امیر خسرو کا کلام سنایا تھا۔ گیت غزل، دو ہے وہ ان یادگار راتوں میں سے ایک رات تھی جو اس حویلی میں جاگی تھی۔ اس وقت..... میری عمر تیس کی دہائی کے وسط میں تھی غالباً۔ وہ رات صبح کی روشنی میں بدلی اور سامعین محفل گھروں کو رخصت ہونے لگے۔ میں بھی بری طرح تھک چکی تھی جب باہر سے کالے خان نے جو ہمارے ان فتح خان کے والد مرحوم تھے، آ کر مجھے اطلاع دی۔

''بیٹا، محفل میں موجود ایک صاحب ملاقات کے متمنی ہیں۔''

''نہ استاد جی۔'' میں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا ''اس وقت کوئی ملاقات نہ ہو گی، رات بیت چکی اور بندی تھکن سے چور ہے ویسے بھی ملاقات کا یہ کونسا وقت ہے۔'' میری یہ بات سن کر استاد کالے خان بستر پر پڑی مہر وخالہ (جن کے نام پر یہ حویلی، ''حویلی مہر وجان'' کے نام سے مشہور ہوئی) کی طرف گئے اور ان کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔ معاملے سے آگاہ ہونے پر مہر وخالہ نے مجھے اپنے قریب بلا لیا۔

''بنو، اب وہ زمانے لد گئے جب محض فنکاری کے بل پر پرستار آ کر دہلیز پر پڑ جایا کرتے تھے، اب تو خود ہاتھ ہلانے کا زمانہ ہے، ہاتھ پر نہیں ہلائے گی تو تیری اس حویلی کی محفلوں میں کتنے لوٹا کریں گے۔'' انھوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا ''تجھے خبر ہے کہ مہمان خانے میں موجود شخص کون ہے؟'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا کہ پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔

''گورنر صاحب کا بندہ ہے، کوئی بہت خاص بندہ، لڑکی زمانہ کون سا جا رہا ہے کچھ معلوم بھی

ہے۔'' وہ ڈپٹ کر بولیں'' ماں تیری تو زمانے بھر کی ملنسار اور خوش اخلاق تھی جبھی لاکھوں کما لیا یہ اور بات کہ ایک ہاتھ سے کما اور دوسرے ہاتھ سے لٹا بھی دیا، تو کہاں سے اپنی نانی پر پڑ گئی جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیا کرتی تھی۔ بی بی رانی یہ فوجی حکومت کا زمانہ ہے، گورنر بھی فوجی ہے اور اس کی انتظامیہ بھی فوجی، تو جان فوجی من موجی، اگر ان کے من کی موج نے جوش مار دیا تو یہ تیری فنکاری اور تیرا سُر یلا پن سب کا سب پڑا رہ جائے گا۔''

''تو کیا کروں میں.....؟'' میں جو نیند اور تھکن سے بے حال ہوئے جا رہی تھی الجھ کر بولی۔

''اٹھ اپنا آپ سنبھال، منہ پر پانی کے چھینٹے مار، کوئی سرخی غازہ مل اور مہمان سے مل لے۔ اچھا تعلق جوڑ لینے کا اس سے اچھا موقع تجھے پھر نہیں ملے گا۔ ارے، کیوں اپنے ساتھ ان بیسیوں معصوموں کی روزی روٹی کے پیچھے پڑی ہے، فوجی کا ایک بید چل گیا تو سمجھ سب بند، دماغ داری کا خناس سر سے اتار اور جامیری بات مان کر چپ چاپ باہر مہمان خانے میں جا کر مہمان سے مل لے۔''

غرض مہر و خالہ نے آنے والے نادیدہ حالات کی ممکنہ سختیوں کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا کہ میں نیند اور تھکن بھول کر اپنا حلیہ درست کرنے کے بعد باہر مہمان خانے میں پہنچ گئی۔ وہاں استاد کالے خان اور استاد غریب سلطان مہمان کے سامنے بچھے جا رہے تھے اور تواضع کے سامان سے مہمان کے سامنے دھری ٹیبل ایک سرے سے دوسرے سرے تک سجی پڑی تھی۔

''بی بی آ گئیں، بی بی آ گئیں۔'' مجھے دیکھ کر دونوں خوشی سے کھل اٹھے۔ میں اپنی مخصوص اکڑ کے ساتھ تین فن کرتی چار دنا چار مہمان کے سامنے جا بیٹھی۔

''جی فرمایئے؟'' مجھے یقین ہے کہ میں نے لٹھ مارنے کے سے انداز میں یہ الفاظ اس شخص سے کہے ہوں گے۔

جواب میں اس نے آنکھ اٹھا کر دونوں استاد صاحبان کی طرف دیکھا جو زمانہ ساز بھی تھے اور تجربہ کار بھی۔ دونوں فوراً بندگی بجالاتے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میری ہی حویلی میں کسی اور کا یہ انداز حکومت مجھے ایک آنکھ نہ بھایا مگر میں کچھ بول نہ سکی کہ مجھے ڈرا ہی اتنا دیا گیا تھا۔

''میرا نام مقصود احمد گورائیہ ہے۔'' اس شخص نے پُرسکون لہجے میں کہا'' خالص پنجابی ہے۔''

میں نے لہجہ پہچان کر دل میں سوچا۔'' میں لاہور کا رہنے والا نہیں ہوں۔ مگر اپنے کام کے سلسلے میں زیادہ تر یہیں رہتا ہوں۔''

''میں کیا کروں؟'' میں نے یہ بات بھی اپنے دل میں کہی۔

''آپ کا نام بہت سن رکھا تھا، گو آپ کو گزری رات سے پہلے کبھی سنا نہیں تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ آج ادھر آنا ہو ہی گیا اور آپ کو سننے کا اتفاق ہوا۔ میں یہاں اس لیے رک گیا کہ بذاتِ خود آپ کے سامنے تعریف کے الفاظ کہنے کو دل چاہا تھا۔'' اس شخص نے کہتے کہتے اپنے کوٹ کی جیب سے نوٹوں کی تین موٹی گڈیاں نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دیں۔'' اور ایک چھوٹی سی فرمائش بھی کرنا تھی۔''

میں اس شخص کے اس اندازِ تحسین پر پہلے ہی پیچ و تاب کھا رہی تھی فرمائش والی بات پر میرا غصہ دوآتشہ ہو گیا، میں نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا'' میں تو سہیلیاں سے نیناں ملا آئی رے۔'' دوبارہ سنا دیجیے یہاں اکیلے میں صرف مجھے.....''

''اوہ میرے خدا!'' میرا دماغ غصے سے پھٹنے لگا۔ کس کمالِ جرأت سے وہ شخص میرے سامنے یہ فرمائش بیان کر رہا تھا جبکہ اس سے پہلے ایسے تمام معاملات استاد کالے خان طے کرتے آئے تھے، دورانِ محفل کسی پرستار کی فرمائش پر میں کوئی چیز روٹین سے ہٹ کر سنا دیا کرتی تھی مگر معاوضہ پہلے سے ہی لیا جا چکا ہوتا تھا، فرمائش کا وہ بازاری انداز اور معاوضے کی ادائیگی کا وہ گھٹیا طریقہ میری تربیت اور مزاج کے عین خلاف تھا میں نے نوٹوں کی وہ گڈیاں اٹھا کر تقریباً اس شخص کے منہ پر دے ماریں اور ہاتھ کے اشارے سے اسے فوراً باہر نکل جانے کا حکم دیا۔

''اوہ، یہ طنطنہ۔'' وہ بجائے خوف زدہ ہو جانے کے مسکرا کر بولا'' کوئی بات نہیں، آپ پر یہ غصہ بھی اچھا لگ رہا ہے یہ کم ہیں۔'' پھر وہ مزید مسکرایا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر اسی طرح کی دو اور گڈیاں نکال کر باہر رکھ کر بولا'' اگر یہ بھی کم ہیں تو۔'' اب کے اس نے جیب سے ایک چیک بک اور قلم نکالا'' یہ لیجیے اپنی پسند کی رقم درج کر دیجیے۔'' انھوں نے بلینک چیک پر سائن کر کے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا میرے لیے یہ ایک انتہائی بات تھی۔ میں نے چیک پکڑ کر اس کے پرزے پرزے کر دیے اور انھیں ایک مرتبہ پھر ہاتھ کے اشارے سے باہر نکلنے کو کہا۔

''فوراً سے پیشتر یہاں سے نکل جایئے۔'' یہ بات سن کر وہ متبسم ہوئے۔

''دیکھ لیجیے اور سوچ لیجیے کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی زبان سے آپ کو مجھے خوش آمدید کہنا پڑے کسی روز۔''

''ہرگز نہیں۔'' میں چلا کر بولی'' وہ کوئی اور ہوں گے جو آپ لوگوں کی ان حرکتوں سے متاثر ہو کر دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیا کرتے ہوں گے یہاں کسی فرد سے ایسی توقع عبث ہے۔''

''آج تو خیر آپ کا مزاج بگڑ گیا۔'' وہ اپنے نوٹوں کی گڈیاں اٹھاتے ہوئے بولے۔ ''پھر کسی دن بات کریں گے۔'' ان کے پُرسکون انداز پر مجھے اور بھی تاؤ آ رہا تھا۔ اپنا سامان اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے ایک اچٹتی نظر انھوں نے مزید مجھ پر ڈالی اور ہولے سے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ باہر حویلی کا سارا منتظم عملہ ہاتھ باندھے منتظر کھڑا تھا کہ معلوم ہو اندر کیا بات ہوئی ہے۔ چوہدری صاحب کے باہر نکلتے اور میری شعلہ بار نظروں کو دیکھتے ہی جہاندیدہ استاد کالے خان سب معاملہ سمجھ چکے تھے اور میرے پہنچنے سے پہلے ہی مہر وخالہ کے گوش گزار بھی کر چکے تھے۔

''بس تیرا راج پاٹھ سمجھ چند دن کا باقی رہ گیا۔'' وہ میری صورت نظر آتے ہی بولیں ''او نچے چوبارے والوں سے ماتھا لڑاؤ گی تو منہ کی کھانا ہی پڑے گی بی بی رانی، کچھ عقل تمھارے پاس نہیں تھی تو اڑوس پڑوس سے ہی ادھار مانگ لیتیں۔ اب مزاج داری تو دکھا ہی چکی ہو، اس کے نتائج سے کیسے نبٹو گی یہ بتاؤ، ہائے میرے خدا تیرا نام لے لے کر رہنے کا یہ ٹھکانا نصیب ہوا تھا اور بٹیا رانی کا کوئی کام اور نام چلا تھا مگر اللہ رے یہ لکھنو والیوں کی تنک مزاجیاں اور ہٹ، اب خدا جانے کہاں کہاں کے دھکے کھانے پڑیں گے، ارے میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ فوجی من موجی اب اس کے من کی موج نہ جانے تمھیں کہاں کہاں بہائے گی اور ساتھ میں ہم اندھے، لولے، لنگڑے بھی بہیں گے، اری کم بخت، ناس پٹی تجھ سے تو خدا سمجھے۔'' غرض وہ فضیحتے کیے مہر وخالہ نے میرے کہ میں کان دبا کر ان کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

''بٹیا، آن بان اور وضعداری اپنی جگہ سہی، مگر موقع محل کے حساب سے اچھا برا سوچنا بھی انسان پر فرض ہے، آپ نے جو کیا اپنے تئیں درست ہی کیا ہوگا مگر ہمارے حساب میں برا کیا، یہ فوجی حکومت جواب کے آئی ہے اس نے پچھلی حکومتوں کے کان کاٹ کر رکھ دیے ہیں۔ مذہبی احکامات کی آڑ میں حکومتی عہدیدار گن گن کر اپنے بدلے لیتے پھر رہے ہیں، ان کے پاس مکمل کنٹرول ہے۔ آپ جانو آمر کی حکومت میں تو یوں بھی مکھی کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں ہوتی۔'' استاد غریب سلطان نے اپنے مخصوص انداز میں بڑے سبھاؤ کے ساتھ مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ مگر اب تو سمجھنے سمجھانے کا وقت بھی گزر چکا تھا، جس تیر کو کمان سے نکلنا تھا وہ نکل گیا تھا واپس کیے نکر آتا۔ اب وہ سب حویلی میں پڑے ہو لیتے رہتے۔ نہ جانے کب کیا پیام آ جائے، نہ جانے کب کس بات کی آڑ میں ہم پر اوچھا وار کیا جائے۔ مگر عجیب بات تھی کہ مجھے نہ ڈر محسوس ہوا نہ ہی میں ہولی۔ جہاں گانے کے لیے بلایا جاتا شوق سے جاتی، کوئی محفل جمانے کو کہتا تو محفل اپنے ہاں بھی جما لیتی۔

یونہی ایک روز شہر کے ایک بڑے رئیس خاندان میں ''شام موسیقی'' منائی گئی۔ ان دنوں محفلیں کھلے عام نہیں سجتی تھیں بلکہ پردے کے پیچھے چھپ چھپا کر منائی جاتی تھیں۔ اس محفل میں بھی حسب روایت حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار موجود تھے۔ اس شام کے لیے میں نے جن دو غزلوں کا انتخاب کیا تھا وہ دونوں غالبؔ کی تھیں، کیونکہ میری وجہ شہرت ہی غالبؔ کی غزلوں کی گائیکی تھی۔ ان محافل میں اکثر حاضرین کی محفل کی جانب سے فرمائشی پرچیاں گلوکاروں کو موصول ہوتی تھیں اب بھی ہوتی ہوں گی۔ اس محفل میں مجھے بھی حسب سابق میرے مشہور گیتوں اور غزلوں کی فرمائش کی پرچیاں موصول ہو رہی تھیں۔ انہی میں سے ایک پرچی پر لکھا تھا ''میڈم، ایک مرتبہ پھر درخواست ہے کہ خسرو کا وہ گیت سنا دیں، وہ گیت یاد رہے میں تو سیاں سے نیناں ملا آئی رے'' مجھے اس انداز پر ایک مرتبہ پھر اشتعال آ گیا۔ میں نے دانستہ طور پر وہ پرچی مروڑ کر پھینک دی، یقیناً لکھنے والے نے میری یہ حرکت دیکھ لی ہوگی اور جس کے دل میں چور تھا اس نے بھانپ بھی لی ہوگی۔ نہ جانے مجھے کیوں اپنی اس حرکت پر دلی مسرت محسوس ہوئی تھی۔ تم بور تو نہیں ہو رہیں'' مہ پارہ بیگم نے یہ کہانی سناتے سناتے کرن فاطمہ کی طرف دیکھا۔ وہ دم لینے کو رکی تھیں یا پھر شاید پانی پینے کے لیے۔ کرن کی محویت ان کے رک جانے پر ٹوٹ گئی تھی۔

''ارے، ان خاتون کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ان کے ساتھ کوئی ایسی بات بھی منسوب ہو سکتی ہے۔'' وہ سوچ رہی تھی۔

''تمھارے لیے کھانا منگواؤں۔'' پانی پی چکنے کے بعد انھوں نے کہا۔ ''چائے مل جائے تو کافی ہے، کھانے کا تو وقت ہی نکل گیا غالباً۔'' کرن نے اپنے بال سمیٹ کر کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

بھئی تمھاری عمر میں تو کھانا کھائے بغیر گزارہ ہو سکتا ہے میری میں نہیں، خصوصاً جب مجھے دوائی بھی کھانی ہے۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا اور اختری کو آواز دینے لگیں۔ کرن نے دیکھا اختری ان کے آواز دینے پر سامنے بنے کمروں سے نکل رہی تھی اور اس کے ساتھ سفید جھلک بالوں اور ملتے سر والا ایک بوڑھا آدمی تھا۔

''اختری، آج پھر استاد جی کو دھوپ لگوانے کے لیے باہر نکال لائی ہے۔'' مہ پارہ بیگم مسکراتے ہوئے اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ یہ میرے استاد غریب سلطان ہیں بوڑھے ہو چکے ہیں اور کان بھی پٹ ہو چکے ہیں مگر یہاں ابھی بھی ان کا وہی احترام اور عزت سب کے دلوں

میں موجود ہے جو اس وقت تھی جب یہ اپنی بھرپور عمر میں تھے۔"

"اور باہر کی دنیا میں ایسے لوگ متروک ہو چکے، انھیں کوئی ملنے نہیں جاتا، بیمار پڑ جاتے ہیں تو حکومت وقت اور امرا سے مالی معاونت کی اپیلیں کرتے رہتے ہیں۔" کرن نے ان کی تقلید میں اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور استاد جی کے قریب آنے پر مہ پارہ بیگم کی طرح ہی ان کے گھٹنے چھو کر ان سے محو گفتگو ہو گئی۔

......٭......

"یہ ایک فنٹاسٹک گیٹ ٹوگیدر تھی۔" تقریب کے اختتام پر حسن کمال لان کے ایک کونے میں کھڑا سمعیہ سلطانہ سے کہہ رہا تھا۔ "سمعیہ یو آر اے رئیل جینئس تمھیں اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ وقت کے گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے لگام اور باگ پر پاؤں اور ہاتھ کیسے رکھتے ہیں۔ تم نے پبلک میں تو جو اپنا اچھا امیج بنایا وہ اپنی جگہ پر ہے، اس تقریب کے بعد تم اپنی برادری اور رشتے داروں کے دل بھی جیتنے میں کامیاب ہو چکی ہو۔" وہ اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا اور سمعیہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

"اب ایسی ہی ایک تقریب میڈیا سے متعلق لوگوں کے لیے بھی منعقد کر ڈالو، ان لوگوں کو مٹھی میں رکھنے کا کامیاب ترین طریقہ یہی ہے، ان کے لیے فنکشن منعقد کرو اور انھیں تحائف بھجواتی رہو، تم میگزینز اور اخبارات کے سینٹر پیجز پر ایک لمبے عرصے تک راج کرتی رہو گی۔" اب وہ اسے نئی حکمت عملی بتا رہا تھا۔

"سمعیہ سلطانہ اگر تم اپنی باتوں سے فارغ ہو چکی ہو تو ذرا ہماری بھی سن لو۔" سمعیہ کو حسن کمال کی فسوں خیز گفتگو کے اثر سے اس کی آپا کی کاٹ دار آواز نے نکالا تھا۔ اس کی یہ آپا حسن کمال کی ممانی تھیں مگر اس روز انھوں نے حسن پر ایک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی تھی نہ ہی حسن نے انھیں کچھ لفٹ کروائی تھی۔

"میں حسن سے آپ کے کمرے کی بات کرنے لگی تھی۔" سمعیہ نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ دے گا کمرا ہمیں!" آپا نے دانت پیس کر کہا "یہ تو سانپ بن کر بیٹھا ہے اس پر۔" حسن کو فوری طور پر بات سمجھ میں نہیں آئی مگر سمجھنے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔

"ایک کمرہ...... وہ بھی بوسیدہ اور گھٹیا سا کمرا۔ ارے ممانی جان سمعیہ کے کہنے پر تو میں اپنی قیمتی ترین چیز بھی آپ کو دے سکتا ہوں۔" اس کی اس بات اور انداز نے آپا اور سمعیہ کو بری طرح چونکا دیا۔

......٭......

اب مجھے یہاں سے باہر بھی نکالو ناپا، میں ایک ہی جگہ پر بند پڑے رہ رہ کر تنگ آ چکا ہوں۔" سلمان، فیضان سے کہہ رہا تھا۔ فیضان نے ایک گہری نگاہ سلمان پر ڈالی۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت کے سائے ختم ہوتے محسوس ہو رہے تھے اور اب وہ دیکھنے میں ایک بالکل نارمل لڑکا نظر آتا تھا۔

"یہاں سے باہر نکل کر تم کیا کرو گے یہ تو بتاؤ؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں واپس کالج جاؤں گا، پڑھوں، لکھوں گا تمھیں پتا تو ہے پہلے ہی میرا کتنا وقت ضائع ہو چکا ہے۔" سلمان نے اپنا ارادہ بیان کیا۔

"مانی تم نے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے، تم ایسا کرو کہ علاقے میں زمینوں پر چلے جاؤ وہاں بھی معاملات کو لک آفٹر کرنے والا کوئی نہیں ہے، ابا کو ادھر کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔" اس نے دانستہ یہ بات کہی تھی، وہ سلمان کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

"نہیں پا، میں نے ادھر نہیں جانا۔" سلمان نے آہستہ آواز میں کہا۔

"کیوں یار......؟" وہ اسے اکسانے لگا۔ "پڑھ لکھ کر تم کیا کرو گے زیادہ سے زیادہ، میری طرح نوکری کرو گے نا، میں تمھیں بتاؤں اس میں بڑی خواری ہے، علاقے کی بات ہی اور ہے، وہاں تو بادشاہت ہے، چودھراہٹ ہے، تمھارے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکے گا، بڑا مزہ ہے یار اس زندگی میں۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ پڑھنے لکھنے کا خیال دل سے نکال دے اور چپ چاپ ادھر چلا جا۔"

"تو ویسے ہی کہتا ہے مانی پڑھ لکھ کر بڑا آدمی نہ بنے، تیری طرح پینٹ شرٹ پہن کر ہینڈسم بن کر نہ پھرے، انگریزی نہ بولے، باؤ صاحب نہ بن جائے۔" سلمان نے خفگی کا اظہار کیا۔ فیضان کو بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ اسے ہمیشہ سے ہی سلمان بہت زیادہ عزیز تھا وہ اس سے چند سال ہی بڑا تھا لیکن اسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کی ذمے داری تھا۔ اس نے اسے ہر معاملے میں ہی بہت سہارا دیا تھا، ماسوائے ان چند سالوں کے جب وہ پڑھنے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تھا اور انہی چند سالوں میں سلمان نے اپنی ذہنی صحت کھوئی تھی۔ اس کی اس حالت پر بھی فیضان کا دل بے چین رہتا تھا لیکن اس کے اسی علاج کے دوران ایک غیر متوقع انکشاف نے اسے اپنے اور سلمان کے رشتے کے متعلق تذبذب اور الجھن میں ڈال دیا تھا اور اب وہ کئی مرتبہ سلمان سے گفتگو کے دوران اپنے دل کو ٹٹولتا رہتا تھا، کیا اس کے دل سے سلمان کی وہ محبت ختم ہو گئی تھی جو شروع سے اس کے دل

میں زندہ تھی۔ کیا اب وہ سلمان کے لیے اپنے دل میں وہ چیز محسوس نہیں کرتا تھا جو پہلے اس کا دل محسوس کرتا تھا۔ اب تک اسے اپنے دل اور جذبات میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہو پائی تھی اور اسے یہ اچھا لگ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ سلمان کے لیے اس کے سے انداز میں سوچنے والا کوئی اور نہیں تھا۔

''بڑا آدمی صرف پڑھ لکھ کر ہی تو نہیں بنا جا سکتا نا، تو خود دیکھ لے، ہمارے اردگرد کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں لیکن بڑے آدمی ہیں، ان کے پاس شہرت بھی ہے، عزت بھی اور پیسہ بھی۔''

''وہ کون ہیں.....؟'' سلمان نے تجسس کا اظہار کیا۔

''دور جانے کی کیا ضرورت ہے، اپنے ابا کو ہی دیکھ لو، کوئی بہت زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں ہیں مگر ان کے پاس کیا نہیں ہے؟''

''ابا نے تو آکسفورڈ سے پڑھا ہے۔'' سلمان نے ہنس کر کہا۔

''آکسفورڈ کا تو صرف چکر ہی لگایا ہے نا، پڑھا تو کچھ بھی نہیں۔ دادا کے مرنے پر انھیں واپس آنا پڑا مگر دیکھ لو علاقے کی زمینوں اور چودھراہٹ کی طاقت نے انھیں کتنا مضبوط بنا رکھا ہے۔''

''ابا کو مضبوط بنا رکھا ہے۔'' سلمان نے ایسے کہا جیسے اسے اس کی بات پر شک ہو ''تو سمجھتا ہے کہ ابا بہت مضبوط ہیں۔ یہ ہیں پانہیں، ابا بہت بزدل ہیں، بہت کمزور، اپنی بزدلی اور کمزوری کو چھپانے کے لیے وہ سب کو ڈرا کر رکھتے ہیں، گولی کی زبان بولتے ہیں، بندوق کی نالی سب پر تانے رکھتے ہیں۔ جو آواز نکالتا ہے اسے مار دیتے ہیں یوں ٹھاہ کر کے'' اس نے فرضی بندوق فیضان پر تانی ''خود میرے سامنے'' اب کے اس نے اپنی جانب اشارہ کیا ''میرے سامنے انھوں نے دو بندے مارے، ایک کو یوں فائر مارا'' اس نے ٹھاہ کی آواز منہ سے نکالی ''دوسرے کو یوں'' اب کے وہ گھوم کر فیضان کی جانب مڑا ''ڈھیر سارا خون نکلا۔ لال لال، دونوں مر گئے وہ دونوں مر گئے پامیری آنکھوں کے سامنے مر گئے، میں کچھ بھی نہ کر سکا۔'' فیضان نے دیکھا سلمان بری طرح رونے لگا۔

''کچھ نہیں ہوتا، علاقہ، زمین، بادشاہت، کچھ نہیں ہوتا پاان سب کو قائم رکھنے کے لیے بندے مارنے پڑتے ہیں، خود کو بہادر ثابت کرنے کے لیے گولی چلانی پڑتی ہے۔ کچھ کو تو گولی نہیں گولی کی دہشت ہی مار دیتی ہے۔ میں نے علاقے نہیں جانا پا، میں نے ابا نہیں بننا۔'' وہ دھاڑیں مار کر روتے ہوئے کہہ رہا تھا اور فیضان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

''یہ آپ کا ہی کارنامہ ہے جو مہ پارہ بیگم نے ہمارا موقف سن لیا اور ہماری بات کو سمجھ بھی لیا ورنہ اگر ہم ایسا نہ کرپاتے تو انہوں نے تو خیر ہمارے خلاف کیا ایکشن لینا تھا کم از کم میں خود اپنے آپ میں ہی شرمندہ ہوتی رہتی۔'' کرن نے اتوار کی چھٹی کے دن ناشتے کی ٹیبل پر چاچیاں کو مخاطب کیا جو بڑے انہماک سے پراٹھا اور آملیٹ کھانے میں مشغول تھے۔

''مجھے خود بھی اس بات کا شدت سے احساس تھا۔ مجھے تجربہ تو نہیں مگر میں نے سنا ہے کہ فنکاروں کے دل بہت حساس ہوتے ہیں۔ پھر ایک ایسی فنکارہ جسے ہم اپنے تئیں پروجیکشن دینے چلے جاتے تھے وہ ہماری وجہ سے عزت پانے کے بجائے اوٹ پٹانگ خبروں میں آرہی تھیں تو معذرت اور وضاحت تو ہمارا فرض بنتا تھا۔'' چاچیاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی ایکسپلائٹیشن کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ اور بھی کئی جرائد اور اخبارات اسی موضوع پر من گھڑت خبریں بنا کر لگانے لگے ہیں۔'' کرن نے تاسف کا اظہار کیا۔

''یہ تو خرابی ہے اس جدید دور کی صحافت میں ایک شخصیت اتنے عرصے تک گمنامی کے اندھیرے میں ڈوبی رہی اور کسی کو یاد نہ آئی۔ اب جو کسی نے اسے روشنی میں لانے کی کوشش کی تو چاروں طرف خبریں بنانے کی دوڑ لگ گئی' میں نے محسوس کیا کہ ایسا صرف مہ پارہ بیگم والے واقعے کے ساتھ نہیں ہوا اور لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔ اچانک کوئی شخصیت لائم لائٹ میں

آتی ہے اور ہر رسالے ہر اخبار کا موضوع بن جاتی ہے۔''

''موضوعات میں تنوع جو نہیں رہا۔ سب ایک قسم کے موضوعات پر لکھ لکھ کر تھک رہے ہوتے ہیں ایسے میں اگر کوئی نئی بات ملے تو وہ کیوں اس کی طرف نہیں متوجہ ہوں گے۔'' کرن نے اپنی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

''آگاہی کے ذرائع اتنے زیادہ ہیں کہ خبر' بحث اور معلومات سیکنڈز میں دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ موضوعات کا تنوع بھی اسی لیے ختم ہو گیا اور اس نئی دنیا کے نئے تقاضوں کی زد میں غریب مہ پارہ بیگم کی شخصیت بھی آ گئی۔'' چامیاں کے لہجے میں دکھ تھا۔

''اس سے تو بہتر تھا کہ ہم ان کی ذات کو چھیڑتے ہی نہیں۔ جہاں ایک عمر وہ گمنام رہی تھیں وہاں باقی دن بھی ان کے یونہی کٹ جاتے۔ اب یہی دیکھیے کہ ان کے دو البم ریلیز ہوئے اور پائریسی کے ماہر لوگ اتنی قیمتی آواز کوکنوں کے مول بیچ رہے ہیں۔'' کرن نے عمیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سی ڈیز تو خیر چیز ہی ایسی ہیں کرن فاطمہ' یہاں بڑی ٹیکسٹائل ملز کے کپڑوں کے ڈیزائن دو سو روپے کے کپڑے میں بک جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ادیبوں' شاعروں کی قیمتی نگارشات بیسٹ بیک میں ایک ہفتے کے اندر اندر شائع ہو جاتی ہیں۔ یہ قوم چھاپے مارنے میں ماہر ہے بھئی.....'' عمیر نے مسکرا کر کہا۔

''جو بھی ہے۔'' کرن نے سر جھٹک کر کہا۔ ''اس سلسلے میں' میں ایک بات کبھی نہیں بھولوں گی کہ ساری گڑبڑ..... اور خرابی کا آغاز اس مطلب پرست' خود غرض اور لالچی حسن کمال نے کیا۔ ہم ایک عہد کی تاریخ دہرانے کے لیے صاف ستھرا مضمون لکھ رہے تھے' اس نے اسکینڈلز کے چھینٹے اس موضوع پر اڑا کر ہر دوسرے صحافی کو اس موضوع کی طرف متوجہ کیا اور اب آپ دیکھیں ہر کوئی اس سلسلے میں انکشاف کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ کوئی کہتا ہے مہ پارہ بیگم نے کئی ناجائز بچوں کو جنم دیا' کوئی انہیں پیدائشی طوائف زادی قرار دے رہا ہے' پرائیویٹ محافل عیش و طرب کی رکھیل اور نامور لوگوں کی پرائیویٹ محافل عیش و طرب کی روح رواں قرار دے رہا ہے..... لاحول ولا قوۃ' کس انتشار اور اضطراب سے دوچار ہوتی ہوں گی وہ یہ سب پڑھ کر' ناحق ہم نے ان کا موضوع چھیڑا اب یہ سلسلہ نہ جانے کہاں جا کر ختم ہو گا۔

''بھئی نیت تو ہماری بری نہیں تھی۔ ہم تو ایک طرف ان کے فن کی پذیرائی کے خواہش مند

تھے' دوسری طرف اون لکر کا نام بڑھانا چاہتے تھے۔ اون لکر تو بہت سی نظروں میں آ گیا مگر مہ پارہ بیگم کے ساتھ زیادتی ہو گئی۔'' چامیاں بھی افسوس سے سر ہلا رہے تھے۔

''مگر فکر مت کرو' یہ خبریں اور تبصرے اپنی موت آپ مر جائیں گے جب تم ان کی داستان خود ان کی زبانی شائع کرو گی۔''

''اس پر بھی کہنے والے کہیں گے کہ پیسے لے کر لکھا گیا ہے یہ انٹرویو.....'' کرن نے تلخی سے کہا۔ ''یہ بہت برا اس لیے بھی ہوا کہ ایک بہت خاص اور خالص خاتون عام اور ناخالص لوگوں کی صف میں کھڑی کر دی گئیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان شب و روز کا چکر اس طرح کیسے واپس پھیر دوں جیسے اس سارے قصے کے شروع ہونے سے پہلے تھا۔''

''ہو جائے گا' وہ نیک خاتون ہیں ان کا یہ وقت دیتے ہوئے کہا۔ مگر کرن کو یہ کام اب بہت مشکل لگ رہا تھا۔''

''آرٹ اینڈ کلچرل فورم کی صحافت میں حسن کمال کا نام بہت اونچا جا رہا ہے۔ اس نے ایک کام بڑی ہوشیاری سے کیا ہے کہ سیاست کے متعلق لکھنے کی بجائے آرٹ اینڈ کلچر فورم کا انتخاب کیا' اس میدان کے کھلاڑیوں کے مل پرودہ سیاسی کھلاڑیوں کا انگلیوں پر نچا رہا ہے کیونکہ ان دونوں میدانوں کے کھلاڑیوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔'' جہانگیر اور نعیم آپس میں گپ شپ میں مشغول تھے۔

''پرسوں شام جب انٹرنیشنل لینگویج کانفرنس کی کوریج کے لیے گئے تھے پی سی میں تو میں وہاں پر حسن کی شان بان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ وہاں پر ایک عام صحافی یا رپورٹر کی حیثیت میں موجود نہیں تھا بلکہ وہ مقررین کی صف میں شامل تھا بطور ایک معروف جرنلسٹ۔'' نعیم نے کہا تھا۔

''اور تم نے اس کا لباس دیکھا تھا' کیسا قیمتی' امپورٹڈ کپڑا تھا اس کے سوٹ کا اور اس کا پرفیوم اور سگریٹس' تم نے اس کی گاڑی دیکھی لیٹسٹ ماڈل ہے اس کے پاس۔'' جہانگیر کے لہجے سے رشک اور حیرت دونوں ٹپک رہے تھے۔

''اچھا گیا ہے وہ یار بہت اچھا' دیکھنا اس کے نام سے یہ بڑے بڑے آرٹسٹ' پروڈیوسر' رائٹر' ڈائریکٹر سب بدکتے ہیں۔ ادیب' صحافی بھی چالو ہیں کیونکہ وہ کھری کھری لکھ ڈالتا ہے سب پر' اس سے بگاڑنے کا رسک کوئی بھی نہیں لیتا یار۔'' نعیم کے لہجے میں بھی اسی قسم کی حسرت ٹپک رہی تھی۔

''ابھی یہ مہ پارہ بیگم والے ایشو کو ہی لے لو اس بحث میں کیسی چنگاری پھینکی اس نے' کیا نئے نئے انکشاف ہو رہے ہیں۔ وہ کون آدمی ہے جس کے بارے میں سنا ہے کہ اس کی داشتہ ہیں یہ اب تک۔'' جہانگیر حسن کے کارنامے پر باچھیں کھلا کر بولا۔

''اور وہ جو چمڑے کا تاجر تھا کوئی اس کے دو بچوں کی ماں ہیں' یار اس عورت کی حویلی میں جا کر اور اس کی آن بان دیکھ کر' اس کی گفتگو سن کر کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ یہ عورت ایسے واہیات کردار کی مالک ہوگی۔'' نعیم نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''یہ کلچرل اوپس ہیں یار' اس دنیا میں کچھ ممکن ہے۔ یہاں تو جس کا سرورق اٹھاؤ سینٹر پیج پر ننگی تصویریں ہی نظر آتی ہیں۔ یہ ساری ایکٹرسز' ماڈلز' سنگرز' سب ہی یہیں اس معاشرے کے ہی کسی شخص کا دیا کھاتی ہیں۔''

''اور کئی ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو ان کا دیا کھاتے ہیں جیسے عزیزی حسن کمال' سمعیہ سلطانہ کی کمائی' بخششیں اور مہربانیوں پر پل رہا ہے وہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر۔'' نعیم نے کہا اور وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنس دیے۔

''سنا ہے کہ سمعیہ سلطانہ جس ڈرامے کی شوٹنگ کے لیے ماریشس جا رہی ہے وہاں حسن کمال بھی جا رہا ہے اس کے ساتھ۔'' جہانگیر کو ایک اور سنی سنائی یاد آ گئی۔

''اس کا نام وہاں ہونے والی کسی سیاحت کانفرنس کے مندوبین میں شامل ہے' یہ معلوم ہے تمہیں؟'' نعیم نے اس سے متعلق مزید معلومات یاد کیں۔

''یار مزے ہیں حسن کمال کے' ذرا پیار بڑھائیں اس سے کچھ ہم پر بھی رنگ آئے۔'' جہانگیر نے خیال ظاہر کیا۔

''میں' میرا خیال ہے کہ سن رہی ہوں تمہاری گفتگو۔'' کرن جو اس وقت سے ان کی باتیں سن رہی تھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے بولی۔

''پھر کیا خیال ہے تم بھی اس قافلے میں شریک ہونا چاہو گی یا نہیں؟'' نعیم شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔

''جس قافلے کا سالار حسن کمال ہوگا اس میں شریک ہو کر مجھے اپنی آخرت ہی نہیں دنیا بھی بگڑنے کا خطرہ رہے گا۔'' کرن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اوہ......!'' نعیم نے کچھ یاد آ جانے کی ایکٹنگ کی' ''تم تو ویسے بھی مہ پارہ بیگم کے کیمپ کی

بندی ہو' تم کیسے حسن کمال کے قافلے میں شریک ہو سکتی ہو۔''

''ویسے جذبات سے نہیں دماغ سے کام لے کر سوچو تو سودا برا نہیں ہے' آنے والا کافی سارا وقت حسن جیسے لوگوں کا ہے اور اس وقت کے دوران سارا وقت حسن جیسے لوگوں کا ہے اور اس وقت کے دوران وہ اتنا مال بنا چکے ہوں گے کہ ان کی نسلیں بیٹھ کر کھا سکیں گی۔'' جہانگیر نے دانستہ کرن کو طیش دلانے والی بات کی۔

''فصلی بٹیروں کے دن بس ایک فصل تک ہی رہتے ہیں' پھر کھیت اجڑ جاتے ہیں یہ یاد رکھنا۔ اس ملک کی صحافت کی تاریخ میں کئی ایسے نام آئے جو چند دن تک اپنے قلم کی موشگافیوں پر داد و تحسین کے ڈونگرے وصول کرتے رہے اور پھر ایسے غائب ہوئے کہ ان کے نشان بھی باقی نہ رہے' جس ملک میں حکومتیں اور اقتدار زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکیں' وہاں شاہ کے وفادار کیسے زیادہ عرصہ تک نظر آتے رہ سکتے ہیں۔'' کرن نے مسکرا کر جواب دیا۔'' اور بھئی جتنے دن تک تم لوگ اون لکر کے لیے کام کر رہے ہو اتنے دن تک تو ان انکشافات اور ترغیبات کو موقوف کر کے کچھ کام وام کیا کرو جب تم قافلہ حسن کمال میں شامل ہو جاؤ گے' اس وقت جو مرضی کرنا۔'' اس نے ان دونوں کے سامنے اگلی اسائمنٹس کی لسٹ کی فوٹو کاپیز رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم تو یوں ہی دل پشوری کرتے ہیں میڈم صاحبہ' ہمارا جینا مرنا تو اون لکر کے ساتھ ہے۔ ویسے بھی اب ہمارا اون لکر پرائم لائن میں آ چکا ہے' ہمیں کسی اور جگہ کو جوائن کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' نعیم نے مسخرے پن سے کرن کو سیلوٹ کرتے ہوئے کہا اور اپنے سامنے پچھی لسٹ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

.......❁.......

''چوہدری مقصود احمد گورائیہ کی جانب سے نجی محافل میں شریک ہونے اور فرمائشی گیت سنانے کے پیغام ایک تواتر سے موصول ہونے لگے۔'' اگلی ملاقات میں مہ پارہ بیگم کرن کو بتا رہی تھیں۔

''اس وقت تک فوجی حکومت کی ابتدائی دہشت کا زمانہ گزر چکا تھا۔ وفاق میں مجلس شوریٰ قائم کر دی گئی اور چوہدری مقصود احمد اس کے ممبر بھی بنا لیے گئے تھے' سیاسی جماعتیں جو کالعدم قرار دے دی گئی تھیں یا جن کو اپنے لیڈرز کے جانے کا غم تھا اکا دکا احتجاج منعقد کرتی رہتی تھیں۔ اسلامی حکومت قائم ہو جانے کا شور ہر سو گونج رہا تھا۔ کوٹھے' ڈیرے اپنی رونقیں گنوا بیٹھے تھے جو اسلامی

حکومت کے اگلی صفوں میں شامل راہنما تھے، اب شراب و کباب کی محفلوں میں یہ لوگ کالی شیروانیاں پہن کر شرکت کرتے تھے اور سوفٹ ڈرنک کی بوتلوں میں اعلیٰ درجے کی شراب بھر کر پیتے تھے۔ چوہدری صاحب کو اوقاف آثار قدیمہ اور سیاحت کے محکموں کی نگرانی سونپی گئی۔

''یہ انہی دنوں کی بات ہے جب حکومت وقت کی جانب سے ہمیں یہ نوٹس موصول ہوا کہ حویلی مہرو جان کی اصل ملکیت کا کوئی ریکارڈ محکمانہ فائلوں میں موجود نہیں ہے نہ ہی اس کے کسی انتقال نامے کی کاپی کسی فائل میں موجود ہے اور چونکہ یہ حویلی ایک ایسے فن تعمیر کا نمونہ ہے جو اب متروک ہو چکی ہے لہٰذا اس کو محکمہ سیاحت کے کنٹرول میں دینے کا ارادہ رکھتی ہے اور اسے حکومت کے وقف املاک میں سے ایک تصور کیا جائے گا اگر ہم میں سے کسی کے پاس اس کی اصل ملکیت کا کوئی ثبوت موجود ہے تو اسے لے کر ایک ہفتے کے اندر فلاں فلاں افسر کے سامنے پیش ہوا جائے ایک ہفتے کے اندر عدم پیشی کی صورت میں محکمہ اس کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی کاروائی کا مجاز ہوگا۔ یہ ایک قسم کی چھوٹی موٹی قیامت تھی جو ہم حویلی کے مکینوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔'' مہ پارہ بیگم اپنی بات سناتے سناتے کچھ دیر کو سانس لینے کے لیے رکیں۔

''کیا آپ کے پاس اس کی ملکیت کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ ویسے یہ حویلی آپ کے قبضے میں آئی کیسے؟'' کرن نے ذہن میں آئے سوال فوراً داغ دیے۔

''یہ حویلی.....'' مہ پارہ بیگم نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''بیٹی تم نے پچھلے وقتوں کے راجاؤں نوابوں کے قصے تو سنے ہوں گے یہ بھی کسی ایسے ہی قصے کی طرز کا فسانہ ہے۔ ایک ہمارے محسن تھے نواب افتخار سلطان جو عرف عام میں نواب مرجان کے نام سے جانے جاتے تھے وہ اس وقت کے لاہور کے ایک بڑے نامور رئیس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب مرجان روایتی نوابوں سے قدرے ہٹ کر مزاج رکھتے تھے۔ مرنجاں مرنج قسم کی شخصیت تھے، شعر و شاعری، کبوتر بازی اور سنگیت کی محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت ان کے مشاغل تھے۔ اس زمانے کی نامور گلوکاراؤں کی محافل سنتے تھے اور بقدر توفیق کوئی چیز پسند آ جانے پر عنایت بھی کر دیا کیا کرتے تھے۔ ان دنوں میں نے اپنی اماں کی وفات کے بعد مہرو خالہ کی ترغیب پر ابھی روڑ سا کی محافل میں شرکت کرنے کا آغاز ہی کیا تھا۔ استاد کالے خان نے مجھے جو تربیت دی تھی اور استاد غلام حسین کی تقلید میں میری زیادہ تر گائیکی غالب کی غزلوں اور خسرو کے گیتوں پر مشتمل ہوتی تھی اور اس خاص میدان میں میرا نام لوگ جاننے لگے تھے۔ یہ انہی دنوں کا قصہ ہے کہ ریڈیو پاکستان کی طرف سے ایک محفل موسیقی

کا اہتمام گلستان فاطمہ میں کیا گیا۔ اس محفل میں نواب مرجان اپنے حواریوں سمیت شریک تھے۔ میں نے حسب معمول غالب کی غزلوں کی گائیکی کا مظاہرہ کیا۔ اپنی باری کے آغاز سے ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ نواب مرجان میرے گائے ایک ایک مصرعے پر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے جب میں ایک غزل کے اس شعر پر پہنچی۔

دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

نواب مرجان نے باقاعدہ پھڑکنا شروع کر دیا۔ ''دوبارہ سے دوبارہ سے'' انہوں نے ایک رٹ باندھ لی ان کی فرمائش پر تقریباً پانچ مرتبہ میں نے اس شعر کو دہرایا اور پھر پیچھے سے استاد کالے خان کے ٹوکنے پر آگے بڑھی۔

''اجی ایسی خوبصورت گائیکی پر میری تمام جائیداد مال اسباب قربان۔ یہی شعر ایک مرتبہ پھر سنا دیجیے۔'' یہ وہی نواب مرجان تھے۔

''خالی لفظوں میں ہی ارے نواب صاحب حقیقت میں کچھ قربان کر دیجیے تو بات بنے۔'' مجمعے میں سے آواز آئی۔

''یہ بات ہے۔'' نواب صاحب کھڑے ہو کر گرجے ''جاؤ مہ پارہ بیگم اپنی حویلی واقع اندرون موچی گیٹ تمہارے نام کی۔ اس شعر کے صدقے جو ابھی ابھی تم نے سنایا ہے۔'' حاضرین محفل کی طرف سے واہ واہ کی آوازیں آنے لگیں۔

''ان کی اس بات نے مجھے کرنٹ سا لگا دیا۔ میں نے گردن موڑ کر استاد کالے خان اور استاد غریب سلطان کی طرف دیکھا۔ دونوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں گردن موڑ کر اپنی گائیکی میں مشغول ہو گئی۔ محفل کے اختتام پر ہم لوگ واپس آ گئے۔ رات گئے تک اس بڈھا جو اس محفل میں مانگی گئی ذکر ہوتا رہا اور ہم سب ہی اس سے محظوظ ہو رہے تھے۔

اگلے دن علی الصباح ایک رولس رائس مہرو خالہ کے بوسیدہ مکان واقع سمن آباد کے دروازے پر آ کر رکی، کیا دیکھتے ہیں کہ نواب مرجان بمع حواریوں کے کشاں کشاں اندر تشریف لا رہے ہیں۔ بعد آداب سلام کے چند کاغذات میرے حوالے کرتے ہوئے بولے۔ ''بخدا، کل اس محفل میں کہی بات محض ایک بات نہ تھی، وہ نواب مرجان کا قول تھی گو ہم اس وقت نشے کی حالت میں تھے، مگر نواب مرجان اپنی کسی بھی حالت میں کہی بات کو نبھانے کا پابند ہے سو یہ اس حویلی کے

کاغذات ہوئے ہیں جو آپ کے حوالے کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔'' اس مختصر بات کے بعد وہ روکنے پر بھی نہیں رکے۔ ہم سب دنگ ایک دوسرے کی شکلیں تک رہے تھے۔ کسی کو بھی اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جبھی مہر و خالہ آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔

''شکر کرو غیرت والا نواب تھا' جو کہی کو نبھا گیا' شادیانے بجاؤ کہ اللہ نے پارو کی بونی اتنی شاندار کروائی۔ سمیٹنا شروع کر دے پارو خوب موقع ہاتھ آیا ہے۔'' سو ہم سب ان کی حسب ہدایت خوش ہو گئے۔ کیونکہ اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا ہی تھا۔ میری اماں کی ٹمپل روڈ والی رہائش گاہ بک چکی تھی اور مہر و خالہ کا گھر اللہ معافی ایسا تھا کہ اب گرا کہ اب گرا۔ بوسیدہ اور ٹپکتی چھت' شکستہ فرش' کائی زدہ دیواریں' تاریک کمرے جن میں یہ موٹے موٹے چوہے پھلا نگتے پھرتے تھے، سو ہمیں تو ہمارے حساب میں اللہ تعالیٰ نے چھپر پھاڑ کر دیا تھا۔ بغیر کوئی مزید بات کہے سنے ہم نے سامان اٹھا اس حویلی کا قصد کیا۔ حویلی کی شان تم آج جو دیکھ رہی ہو اس وقت سوا تھی۔ ہماری تو موج ہو گئی تھی۔ ہم ان ڈیوڑھیوں' دالانوں' صحنوں اور کمروں میں یہاں وہاں پھیل گئے۔ یہ ہمارے یہاں آنے کی چند دن بعد کا ہی قصہ ہے کہ سننے میں آنے لگا کہ نواب مرجان کے والد اور بھائیوں نے اس معاملے پر خوب واویلا مچا رکھا تھا' ہم گھبرا گئے پچھلا ٹھکانا یوں چھوڑ آئے تھے یہ یوں چھوٹ جانے کا امکان تلوار کی طرح لٹکنے لگا۔ یہ نیا اندیشہ روز بروز بڑھنے لگا کہ جلد ہی ہمیں اس حویلی سے بے دخلی کا نوٹس مل جائے گا' ادھر نواب مرجان نے اپنے گھر والوں سے اس بات پر باقاعدہ دشمنی مول لی تھی۔ ان کی ضد تھی کہ وہ بھری محفل میں یہ دعویٰ کر چکے تھے کہ انہوں نے حویلی میرے نام کی' اب اس بات سے پھرنا ان کی مردانگی' شان اور نوابیت کے خلاف ہے۔ سننے میں آیا کہ اس فیصلے کی واپسی کی ضد کی صورت میں انہوں نے اپنے اہل خانہ سے کنارہ کشی اور خودکشی تک کی دھمکی دے دی تھی۔ اس میں میری آواز کا مداح ہونے سے زیادہ اپنی انا اور مردانگی ثابت کرنے کے سودے کا زیادہ دخل تھا۔

''ایک روز جب ہم اپنے اندیشوں میں پڑے بے چین مہر و خالہ کی سنائی کہانیاں سن رہے تھے جن کا لب لباب یہ تھا کہ نواب مرجان کے والد اب تو کسی صورت ہمیں یہاں نہیں رہنے دیں گے' نواب مرجان خود تشریف لے آئے۔ انہوں نے مجھ سے معذرت کا اظہار کیا اور اس خاندانی تنازعے کے پیش نظر وہ فوری طور پر حویلی کے انتقال کا کام مکمل نہیں کر سکے تھے مگر جب تک اس کی ملکیت بنام نواب مرجان کے کاغذات میرے پاس تھے' میرے یہاں رہنے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا

تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی ضد کے پکے اور آن پر کٹ مرنے والے شخص تھے۔ اس گفتگو سے ہمارے دلوں کو ڈھارس ملی اور ہم کچھ مطمئن ہو گئے۔

''وقت گزرتا گیا نواب مرجان دوبارہ کبھی اس محفل موسیقی میں شریک نہ ہوئے جہاں میری شوکت ہوتی۔ نہ ہی کہیں دوبارہ ان سے ملاقات ہوئی۔ لیکن ہمارے یہاں رہنے کی بابت بھی کبھی کسی نے یہاں آ کر استفسار نہ کیا اور ہم یہاں کے مستقل مکین بن گئے۔ کئی سال بعد اطلاع ملی کہ نواب مرجان اپنے عالی شان گھر کی سیڑھیوں سے پھسل کر گرے' سر پر چوٹ لگ جانے کے باعث چل بسے۔ یہ بلاشبہ ایک تکلیف دہ خبر تھی مگر دہ اندیشہ پھر جاگ اٹھا کہ حویلی کے متعلق نئے فتنے سر اٹھائیں گے مگر شاید ان کے گھر والوں نے ان کے ساتھ حویلی کی فاتحہ بھی پڑھ لی۔ اس سلسلے میں کبھی دعویٰ ان کی جانب سے نہ ہوا۔ یوں اچھی طرح اطمینان ہو جانے کے بعد اس حویلی کا نام مہر و خالہ کے نام پر حویلی مہر د جان تجویز ہوا۔ یہاں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کرایا گیا۔ تین دن تک محفل موسیقی بپا ہوتی رہی۔ دور دور سے گائیک بلوائے گئے۔ رؤسا اور نوابین جو مہر و خالہ کے قدردان اور واقف کار تھے شریک ہوئے اور یوں سمجھو اس حویلی کا عقیقہ کیا گیا۔ اس کے بعد اس کی تزئین و آرائش میرے ہاتھوں ہوتی رہی' مہر و خالہ کی زندگی تک اس کی تزئین و آرائش میں ان کے مشورے شامل رہے۔ انہیں ایسی حویلیوں میں رہنے اور ان کی سجاوٹ کے تقاضوں سے بخوبی واقفیت حاصل تھی۔ یہ تربیت انہوں نے مجھ کو بھی دی۔ جب تک زندہ رہیں' اس حویلی والی نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں۔ عمر پیچھے انہیں من پسند رہائش ملی تھی۔

نواب مرجان کے انتقال کے کچھ سال بعد ہی یہ چودھری صاحب والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سوال حویلی کی ملکیت کا اٹھایا گیا تھا اب ملکیت کیونکر ثابت ہو۔ نواب مرجان کے والد اور اکلوتے بھائی صاحب کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اگلی نسل خاندانی جائیداد فروخت کر کے ترک وطن کر چکی تھی۔ اب حویلی مہر د جان والے واقعے کی تصدیق کرنے والے بھی کم کم ہی باقی رہ گئے تھے' جو رہ گئے تھے وہ تصدیق کرنے پر ہرگز تیار نہ ہوتے کیونکہ معاملہ حکومت وقت کی جانب سے اٹھایا گیا تھا۔ ادھر یہ نوٹس آیا ادھر مہر و خالہ کے قضیے شروع ہو گئے۔

''لے کر گلی گلی رلتی پھر اب یہ لکھنو والیوں کی خودی' انا اور تنگ مزاجی۔ دیکھا کیسا نیچا دکھانے بیٹھا یہ فوجی حکومت کا من موجی اہلکار' بی بنو یہ چونڈے ہم نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ ہم سے بہتر کون جانتا ہے کہ ان حکومتی اہلکاروں سے چونچ لڑانے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اے وہ دو بول جو

تجھے سنانے کو وہ موا کہتا تھا کہ مرتبہ سنائے تو نے میرے تیرے کی محفل میں پھر اس کے لیے دو ہونٹ ہلاتے تجھے کاہے کی غیرت مارتی تھی۔ اب لوٹ اس حویلی میں رہنے کے ٹھاٹ باٹھ خود تو اس بھلی عمر میں خاک چھانے گی ہی ساتھ میں یہ سارا کنبے کا کنبہ بھی رلتا پھرے گا۔"

"چپ رہو مہرو خالہ، تمہیں تو سوائے فضیحتے کرنے کے دوسرا کوئی کام آتا ہی نہیں۔" کئی مرتبہ میں نے تنک کر انہیں سختی سے جواب دیا جبکہ میرا دل اندر ہی اندر ڈوبتا رہتا۔ حویلی کے چھن جانے کا مطلب اچھے خاصے کمائے نام کا گنوایا جانا تھا کیونکہ اس وقت تک حویلی مہرو جان اور میرا نام لازم وملزوم ہو چکا تھا۔ یہاں بیاہ ہونے والی محفلیں شہرت پا چکی تھیں۔ اب جب حکومت وقت کے ایک رکن نے حویلی کی ملکیت کو چیلنج کر کے اسے چھین لینے کی ٹھان لی تھی تو میرا اور میری نوزائیدہ شہرت اور نام کو کیا نقصان پہنچنے والا تھا میں خوب سمجھ سکتی تھی۔ اس وقت زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنی اس بے نیاز طبیعت، تنک مزاجی، انا اور خودداری پر غصہ آیا جو مجھے میری نانی سے گھٹی میں ملی تھی۔ مہرو خالہ کی وقت کے تقاضے سمجھنے کے متعلق کی گئی نصیحتوں کی سمجھ آئی۔ مستقبل ایک سوالیہ نشان کی طرح میرے سامنے ناچنے لگا۔ خبریں، افواہیں، تمسخر، گفتگو جو میرے متعلق ہوتی میرے کانوں میں گونجا کرتی۔

"دانش مندی تو اس میں ہے کہ معاملے کو سلجھایا جائے نا کہ اسے چیلنج سمجھ کر مزید الجھا دیا جائے۔" یہ بات میرے عزیز قابل احترام اساتذہ استاد کالے خان اور استاد غریب سلطان تک پہنچی تو انہوں نے متانت سے سمجھایا۔

"معاملے کیسے سلجھتے ہیں استاد جی؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ یہ بات کر کے میں اس بات کا اعتراف کر رہی تھی کہ چودھری صاحب سے پنگا لے کر میں نے غلط کیا تھا۔

"جیسے الجھائے جاتے ہیں۔" استاد کالے خان مرحوم نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹا ہر مسئلے کا ایک حل ضرور ہوتا ہے عقلمندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سوچ سمجھ کر درست حل کی طرف چلا جائے نا کہ بے شمار غلط حل ڈھونڈ کر ان میں خود کو الجھا لیا جائے۔"

"پھر آپ ہی کچھ مشورہ دیجیے نا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"اجازت دو تو اس مسئلے کا ابتدائی حل ہم دونوں کم عقل مل کر نکال لیں۔" استاد کالے خان نے مسکرا کر کہا۔ میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرے سر سے کچھ بوجھ کم ہوا، دونوں تجربہ کار اور زمانہ شناس انسان تھے یقیناً وہ معاملے کو غلط سمت لے جانہیں سکتے تھے۔ وہ دونوں مجھ سے آیا

نوٹس لے کر سیدھے چودھری صاحب کے پاس چلے گئے، پیشگی ملاقات طے تھی۔ تمام معاملہ ان کے گوش گزار کیا۔ چودھری صاحب سیاست دان بننے کے نشیب وفراز سے گزر رہے تھے اور بہت سے گر جان چکے تھے۔ معاملے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے بات کو یوں سنا جیسے پہلی مرتبہ سن رہے ہوں، اظہار ہمدردی بھی کیا اور مکمل تعاون کا وعدہ بھی۔ یوں دونوں استاد صاحبان نے وقتی طور پر معاملے کو سلجھانے کی طرف جو پیش قدمی کی تھی اس میں کامیاب رہے۔ اس کے بعد کا قصہ مختصر کرنے کی کوشش کرتی ہوں یقیناً تم تھک چکی ہوگی اور شاید تمہاری دلچسپی بھی برقرار نہ رہی ہو۔" مہ پارہ بیگم نے توقف کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔" لرن نے گویا کسی دوسری دنیا سے باہر آتے ہوئے جھرجھری سی لی۔ "میں تو اس قصے میں مکمل کھو چکی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں اس وقت میں موجود تھی اور یہ سب واقعات میرے سامنے رونما ہو رہے ہوں۔"

"یہ بھی غنیمت ہے بھئی۔" مہ پارہ بیگم مسکرائیں۔ "ورنہ آج کل کی نسل کا کوئی اور فرد ہوتا تو کہتا کہ کیا داستان امیر حمزہ سنا رہی ہیں آپ..... اور یہ کہ سراسر من گھڑت قصہ ہے یہ۔"

"ہاں اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔" لرن ان کی بات پر غور کرتے ہوئے بولی "جب ہم اس سارے معاملہ کی اصل حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کریں گے تو بہت سے لوگ یہ بھی کہیں گے کہ ایک حقیقت کو چھپانے کے لیے ماورائی کہانیاں گھڑ لی گئی ہیں حالانکہ جو آپ سنا رہی ہیں وہ کچھ عجیب بات نہیں ہے۔"

"ذرا ہم تھوڑا سا آگے جائیں گے اس واقعے کو بیان میں تو تمہیں بھی اس کی حقیقت پر یقین کامل ہو جائے گا کیونکہ اس کے کئی کردار سلامت اس معاشرے میں موجود ہیں زندہ اور ٹھوس۔" مہ پارہ بیگم نے اعتماد کے ساتھ کہا اور اختری کو چائے لانے کے لیے آواز دینے لگیں۔

.....

فیضان، سلمان کی ذہنی صحت کو اچھی طرح جانچنے کی کوشش کر کے پچھتا رہا تھا۔ کیونکہ بظاہر مکمل طور پر صحت یاب نظر آنے والے سلمان کے ذہن کی سوئی ابھی تک اس نقطے پر اٹکی تھی جہاں سے اس کے ذہنی عدم توازن کا آغاز ہوا تھا۔ اس روز ابا کے متعلق گفتگو کرتے کرتے وہ بری طرح روتا رہا تھا، اسے ایک مرتبہ پھر وہ دوقتل یاد آ گئے تھے۔ جن کا وہ چشم دید گواہ تھا۔ اسے اپنے پس منظر اور اپنے والد کے رویے سے نفرت محسوس ہوتی تھی اور وہ بار بار چلاتا رہا تھا کہ اس نے اپنے

علاقے میں جا کر اس کا انتظام نہیں سنبھالنا نہ ہی اس نے ابا جیسا انسان بننا تھا۔ اسے ایک مرتبہ پھر نارمل ہو جانے میں ایک ہفتہ لگا تھا۔ فیضان نے ہی تمام صورت حال ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر عبدالصبور کے سامنے رکھ دی۔

واقعات کے ردعمل ایک ایسی چیز ہوتی ہے فیضان جن سے انسان مکمل چھٹکارا کبھی نہیں پا سکتا۔ نفسیاتی علاج ایسے شخص کی اتنی مدد ہی کر سکتا ہے کہ وہ اس ردعمل کو اہمیت دینا چھوڑ دے یا پھر کچھ اور مثبت باتوں کی طرف دھیان دینا شروع کر دے۔ جس طرح کسی چیز سے متعلق ایک مرتبہ پیدا شدہ ناخوشگوار احساس عرصے تک اس چیز کا نام سنتے ہی ناخوشگوار احساس ذہن میں جگاتا ہے، ویسے ہی کسی ایک ناخوشگوار واقعے کا ردعمل ہمیشہ ناخوشگوار ہی رہتا ہے، وقت اس کی شدت کو کم کر سکتا ہے اسے مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتا۔ سلمان ذہنی صحت کی بحالی کی بالکل ابتدائی اسٹیج پر ہے، اس وقت ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم اس کے سامنے کسی ایسی بات کا تذکرہ ہی نہ کریں جو اس کے اندر رد عمل ایکشن کو ترغیب دے۔ کچھ عرصہ نارمل انسان کی طرح نارمل لوگوں میں گزار لینے کے بعد یقیناً وہ اس قابل ہو جائے گا کہ اس وقت کے اثر کی شدت اپنے دل سے کم کر دے۔ کیونکہ اس وقت تک اور بہت سی باتیں اس کے ذہن اور دل کے مشاہدے میں آ چکی ہوں گی۔''

ڈاکٹر صبور نے اس کو تفصیل کے ساتھ سمجھاتے ہوئے کہا۔

''پھر آپ اس کے سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں، اس کو کس ایسے کام میں مشغول کیا جائے جو یہ احساس آہستہ آہستہ اس کے دل سے محو ہو جاتے؟'' فیضان نے ان کی بات سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''اس سلسلے میں مجھے تمہارے والد کی سوچ سے اختلاف ہے، وہ تمہارے بجائے سلمان کو اپنے علاقے، جاگیر اور سیاست میں اپنا جانشین بنانا چاہتے ہیں۔ جو میری رائے کے مطابق ایک بالکل غلط فیصلہ ہے۔ سلمان یہ سب ذمے داریاں نہیں اٹھا پائے گا، اس پر زبردستی یہ ذمے داریاں ڈالی گئیں تو وہ اپنی ذہنی صحت بالکل گنوا بیٹھے گا کیونکہ اس کے اندر توری ایکشن ہی اس سیٹ اپ کا ہے۔'' ڈاکٹر صبور نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''آپ نے یہ بات ابا کو بتائی؟'' فیضان نے بے چینی سے پوچھا۔

''کئی مرتبہ۔'' ڈاکٹر صبور نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''مگر اتنے جہاندیدہ ہوتے ہوئے بھی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ اس سلسلے میں وہ خالص دیہاتی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے

ہوئے فرماتے ہیں کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا، لڑکے ذمے داریوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے ایسے ڈھونگ رچا لیتے ہیں، ایک مرتبہ سلمان کو ان چیزوں میں کھب جانے کا موقع دیا جائے وہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا، جب کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں تم لوگ سلمان کو ہمیشہ کے لیے کھو دو گے۔''

''میں اسے ہرگز کھونا نہیں چاہتا۔'' فیضان کی بے چینی یہ بات سن کر مزید بڑھ گئی۔ ''آپ مجھے گائیڈ کیجیے اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''سب سے پہلے تو سارا احترام، ڈر، خوف اور اندیشے بالائے طاق رکھ کر اپنے والد سے اس موضوع پر کھل کر بات کرو۔ تم بڑے بیٹے ہو، جوان ہو، برسر روزگار ہو، پڑھے لکھے ہو، سمجھدار ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم اس معاملے کو بہت بہتر طریقے سے ہینڈل کر سکتے ہو۔ میں نے تو چودھری صاحب سے کئی مرتبہ یہ بھی کہا اس جانشینی کے لیے وہ تمہارا انتخاب کیوں نہیں کرتے جبکہ تم اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔''

''پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟'' فیضان اس جواب کو سننے کے لیے بھی بے چین تھا۔

''ان کا کہنا ہے کہ تمہارے سلسلے میں وہ کسی سے یہ عہد کر چکے ہیں کہ تمہیں ان کاموں میں نہیں ڈالیں گے۔ تمہیں پڑھا لکھا کر ایک مہذب شہری زندگی عطا کرنا بھی ان کا کوئی ایسا عہد ہے جسے پورا کرنے کے وہ پابند ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کے بعد سلمان ہی ان کے پاس ایک چوائس رہ جاتا ہے۔'' ڈاکٹر صبور نے ایک اچٹتی نگاہ فیضان کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا اور پھر انہوں نے اپنا چشمہ اتار کر چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ ''میں عموماً اپنے کلائنٹس کی، کی ہوئی گفتگو کو مکمل طور پر سیکرٹ رکھتا ہوں اور کبھی بھی کسی کے سامنے کسی دوسرے کے کہے ہوئے الفاظ نہیں دہراتا۔ مگر تمہارے سلسلے میں میرا اندازہ ہے کہ تم سب کے سب الجھے ہوئے ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بظاہر بہت نارمل نظر آنے والی زندگیاں درحقیقت پیچیدگیوں اور شکست وریخت کا شکار ہوتی ہیں اگر تمہارے والد کے کہے الفاظ تمہارے لیے کسی بات کا اندازہ لگانے میں معاون ثابت ہو سکتے ہوں تو مجھے تمہارے سامنے انہیں دہرانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔''

''میں آپ کا بے حد ممنون ہوں ڈاکٹر صاحب۔ چلیں امید کرتے ہیں کہ سلمان کا مسئلہ حل ہو جائے اور جس پیچیدگی کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں اس کو بھی سلجھایا جا سکے۔'' فیضان نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ڈاکٹر صبور کی گفتگو نے اسے نئی الجھنوں کا شکار کر دیا تھا اسے اپنے

والد کی شخصیت میں مزید اسرار اور الجھاؤ نظر آنے لگے تھے۔ اس کا ذہن ایک نئے نکتے پر اٹک گیا تھا۔ وہ کون سا عہد تھا جسے اس کے سلسلے میں نبھانے کے وہ پابند تھے اور وہ عہد انہوں نے کس سے کیا تھا۔ یہ تو ایک الگ حقیقت تھی کہ وہ خود بھی علاقے اور جاگیر کا انتظام سنبھالنے کا کوئی شوق نہیں رکھتا تھا، نہ اسے سیاست سے دلچسپی تھی نہ ہی اپنے والد کے کسی اور مشغلے سے مگر جوں جوں وہ سوچتا تھا توں توں اسے یاد آتا جا رہا تھا کہ اس کے والد نے شروع ہی سے اسے دانستہ ان تمام چیزوں سے دور رکھا تھا۔ بچپن ہی میں اسے ہاسٹل بھیج دیا گیا تھا اور پھر اسے بیرون ملک جانے سے بھی انہوں نے نہیں روکا تھا۔ واپسی پر انہوں نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ اسے کوئی جاب کر لینی چاہیے اور اس کے لیے یہ حالیہ پوسٹ بھی انہوں نے ہی تجویز کی تھی۔

اس کے برعکس سلمان کو انہوں نے ہمیشہ اپنے ساتھ ساتھ رکھا تھا۔ وہ بچپن سے ہی اسے گھوڑوں اور کتوں کا شوقین بنانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اس کے اندر جاگیردارانہ ذہنیت پیدا کرنے کے لیے انہوں نے ہر طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اور بات کہ وہ اپنی کسی ایسی ہی کوشش کے جال میں پھنس گئے تھے اور سلمان نے انہیں کسی کو قتل کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس واقعے نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ سلمان کے دل کا وہ فطری پہلو ختم نہیں کر پائے تھے جو انسان کو کسی دوسرے انسان کے دکھ پر تڑپا دیتا ہے۔ سلمان نے ان دو بندوں کے قتل کا جو اثر لیا تھا اس نے انہیں ایک نئے چکر میں ڈال دیا تھا جس سے وہ تا حال نکل نہیں پائے تھے۔ اس روز فیضان کو اپنے والد کی ذات کی ان دیکھی تنہائی اور بے بسی کا احساس بھی ہوا۔ سلمان کے سلسلے میں ان کی ساری پلاننگ فیل ہو رہی تھی، اور خود اسے انہوں نے اپنے کسی بھی میدان کا ساتھی بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

''ابا کیا کریں گے جب سلمان ان کی ہر اس کوشش پر بد کے گا جو وہ اسے جاگیردار اور سیاست دان بنانے کے لیے کریں گے۔ بہ تو طے ہے کہ وہ ہرگز ان کی کوئی ایسی خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنائے گا۔'' اس نے سوچا تھا پھر اسے سلمان کا معصوم چہرہ یاد آیا ''وہ کتنا پیارا اور کتنا معصوم انسان ہے، میں اسے ابا کی خواہشات پر قربان ہونے نہیں دوں گا، کیونکہ میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔'' اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ دل میں اٹھتے خدشات اور سوالات پر سلمان کے لیے اس فطری اور قلبی محبت نے قابو پا لیا تھا جو ہمیشہ سے اس کے اندر موجود تھی۔

''اطہر خان نے مجھ سے اپنے نئے سریل کے لیے بات کی تھی۔ وہ مختلف سماجی برائیوں پر ڈراموں کا ایک ایسا سیریل بنانا چاہتا ہے جس کا مرکزی کردار مستقل ہوگا اور لڑکی کا ہوگا۔'' سمعیہ نے حسب عادت کوئی نئی آفر قبول کرنے سے پہلے حسن کمال سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔

''اطہر خان نو آموز ڈائریکٹر ہے۔ اس کی کوئی بھی آفر پر غور کرنا حماقت ہوگی۔'' حسن کمال نے اس اعتماد کے ساتھ اسے منع کیا جیسے اسے یقین تھا کہ سمعیہ اس کے جواب کے بعد اس موضوع پر بات ہی نہیں کرے گی۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم بہتر سمجھتے ہو۔'' سمعیہ نے اس کے اعتماد کو سچ ثابت کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے حسن تم آج کل بہت مصروف رہنے لگے ہو۔'' اس نے یہ بات یونہی پوچھ لی تھی۔

''یہ تو ایک خوش آئند بات ہے سمعیہ، مصروفیت تو زندگی کی علامت ہے، مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں زندگی گزارنے ہی اب لگا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ سمعیہ نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کا چہرہ صاف ستھرا شاش بشاش تھا۔ اس نے چھوٹی سے فرنچ کٹ داڑھی رکھ لی تھی اور اس کے بال سلیقے سے کٹے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ قیمتی ڈیزائنر سوٹنگ میں ملبوس تھا اور اس کے وجود سے پرفیوم کی مہک اٹھ رہی تھی۔ اسے کچھ عرصے پہلے کا وہ حسن بے اختیار یاد آ گیا جو شکنوں سے بھرپور ایسی پرانی پینٹ شرٹ میں ملبوس رہتا تھا جس پر مختلف طرح کے لوگ بھی نمایاں نظر آتے تھے۔ پرانے جوتے اور گھسے موزے کلون کا استعمال تو وہ جیسے جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے بالوں نے برش کی شکل شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔ یقیناً وہ ہر صبح بال ذرا گیلے کر کے ان میں انگلیاں چلا کر انہیں سیدھا کر لیتا تھا۔ اسے اس کے حلیے سے کتنی تکلیف ہوتی تھی اسے یاد آیا کہ اس کے اس حلیے کو بدلنے کے لیے اس نے کیسے کتابوں کے لیے رکھے پیسوں سے اس کے لیے وہ قیمتی پینٹ شرٹ خریدی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس پینٹ شرٹ نے حسن کمال کی قسمت ہی بدل ڈالی تھی۔ یہ حسن کمال اس حسن کمال سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہ ہی شخص تھا۔ ''یقیناً اب بھی اتنا ہی ذہین اور ٹیلنٹڈ ہے جتنا تب تھا پھر اتنے سال وہ جوتیاں کیوں چٹخا رہا تھا۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ دوسری طرف حسن اس کو دیکھتے ہوئے کم و بیش اس قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔

''یہ لڑکی اندرون شہر کے ایک پس ماندہ محلے سے اٹھی اور کیا بن گئی۔'' وہ سمعیہ کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو صاف اور سفید تھا اس پر کیا گیا ہلکا سا میک اَپ جچ رہا تھا، اس کے گھنے بال جو

کسی امپورٹڈ ہیئر کلر سے رنگے گئے تھے جدید اسٹائل میں تراشے گئے تھے۔ اس کا بات کرنے کا انداز اور میز قطعی بدل چکے تھے۔ کچھ عرصے میں ہی وہ ایک ایسی معروف اور مصروف فنکارہ بن چکی تھی جس کی اس میدان میں اچھی خاصی مانگ تھی، اس کے تعلقات کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔ وہ دو تین مرتبہ بیرون ملک جا چکی تھی۔ یقیناً وہ بہت کچھ سیکھ چکی تھی اور ابھی اس نے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ مگر وقت اور سمعیہ سلطانہ فی الحال حسن کمال کی مٹھی میں تھے اور وہ بخوبی جانتا تھا کہ دونوں کو ہی ایک دن اس کی مٹھی سے نکل جانا تھا اس کا مستقل ارتکاز اس بات پر تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کب تک ان دونوں کو اپنی مٹھی میں رکھ سکتا تھا اور ان سے کتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

''اون لکر سے تمہارا اب ذرا سا بھی تعلق باقی نہیں رہ گیا؟'' یہ بات سمعیہ سلطانہ نے اس سے یونہی پوچھ لی تھی کیونکہ کچھ عرصے پہلے کے حسن کمال کے تصور سے اسے اون لکر بھی یاد آ گیا تھا۔

''اون لکر۔'' حسن استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ''وہ یوٹوپیا میں رہنے والوں کی بستی ہے، میں اس بستی سے نکل آیا ہوں میرا اب اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔''

''یوٹوپیا۔'' سمعیہ نے دل میں دہرایا اس کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا آیا۔ ''کیا وہ بند ہو گیا؟''

''نہیں۔'' حسن ایک مرتبہ پھر کھل کر ہنسا۔ ''اس کی مالکن اور چیف ایڈیٹر تو سنا ہے کہ بن باس نے بیٹھی ہیں، ایک اور کرم فرما ہیں ان کی مس کرن فاطمہ، وہی آج کل تمام عہدوں پر کام کر رہی ہیں وہاں اور خود کو صحافت کے میدان کی طرم خان سمجھتی ہیں۔''

''پھر بھی اون لکر کا کوئی خاص نام تو سننے میں نہیں آیا کبھی۔'' سمعیہ نے حسن کے طنزیہ اوا استہزائیہ انداز کی وجہ سمجھے بغیر اس کا دل رکھنے کو کہا۔

''تمہیں تو شہرت حاصلکرنے سے پہلے بھی اون لکر سے خاصی واقفیت تھی۔'' حسن نے دانستہ چوٹ کی۔

''وہ......'' سمعیہ قدرے جھینپ گئی۔ ''اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ میں ہی جانتی ہوں کہ اون لکر میں کیسے حاصل کرتی تھی ان دنوں......سب سے چھوٹے والے بھائی کو دس مرتبہ کھینچی تھی آئینہ بک اسٹال ریلوے اسٹیشن پر جب جا کر کہیں پرچے کی شکل دیکھنے کو ملتی تھی۔''

''اتنے جتن سے یہ پرچہ حاصل کرتی تھیں تم اور اب تم نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔''

حسن اب تک اون لکر میں سمعیہ کی دلچسپی کی وجہ جان چکا تھا مگر جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

''اب تو سیکڑوں میگزین از خود چل کر میرے گھر آتے ہیں اور انہیں بھی پڑھنے کا وقت نہیں

ملتا مجھے، البتہ میری امی کو خوب مشغلہ ہاتھ آ جاتا ہے چمکتی رنگین تصویروں کو دیکھنے کا۔'' سمعیہ نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا، یہ بتاؤ کہ یہ جو ہمارے نوجوانوں کے امور کے وزیر ہیں ان سے دوبارہ رابطہ ہوا تمہارا؟'' حسن اچانک کچھ یاد آ جانے پر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''کئی مرتبہ۔'' سمعیہ نے اپنے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو مجھ سے ملاقات کا وقت لینے کو بے چین ہیں مگر میں سوچتی ہوں کہ میں ان سے مل کر کیا کروں گی؟''

''اسٹوپڈ!'' حسن نے بے اختیار کہا ''ایسے موقع سے فائدہ نہ اٹھا کر تم انتہائی حماقت کا ثبوت دو گی تمہیں معلوم ہے کہ منسٹر صاحب ہمارے چیف منسٹر کے قریبی عزیز ہیں ان سے تعلق بنانا بہت ضروری ہے۔ اور سنا ہے کہ لکھ پتی ہیں موصوف ان سے تعلق بناؤ، اپنا پروڈکشن ہاؤس بنانے کے لیے ان سے فنانس مانگنے کی کوشش کرو، سمعیہ بی بی یہ وقت ہے تمہارے پاس، جتنا اپنے مستقبل کو محفوظ بنا سکتی ہو بنا لو۔''

''اور تمہارا مستقبل بھی ساتھ ساتھ۔'' سمعیہ نے یہ بات ہنستے ہوئے یونہی کہی تھی مگر نہ جانے کیوں حسن کو یوں محسوس ہوا جیسے نئی نئی دنیا میں دریافت کرتی احمق سی سمعیہ سلطانہ اس کو کچھ سمجھنے لگی تھی۔

''میرے مستقبل کا تمہارے ایسے تعلقات سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''حال اور مستقبل کیسے محفوظ کیے جا سکتے ہیں یہ اب مجھ سے زیادہ کس کو علم ہوگا۔'' سمعیہ اس کے اس لہجے سے فوراً مرعوب ہو گئی، اس کا دل ہر وقت اس خدشے سے لرزتا رہتا تھا کہ اگر کسی وجہ سے حسن نے ناراض ہو کر اس کی سرپرستی کرنا چھوڑ دی تو اس کا کیا بنے گا۔ وہ بہت پہلے سے حسن کی ذہانت اور خوبیوں سے متاثر تھی، اب جب اچانک اس پر اچھا اور نیا وقت آیا تھا اور اسے حسن کی ذہانت اور دوسری خوبیوں کی راہنمائی حاصل ہو چکی تھی وہ حسن کی امداد سے ہرگز علیحدہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اس کے سامنے دبی دبی سی رہتی تھی۔

''کیا حسن کے لیے میری اتنی پرانی پسندیدگی مفادات کے حصول میں بدل رہی ہے۔'' اس نے اس روز خود سے سوال کیا۔ ''ہرگز نہیں۔'' اس کے دل نے جواب دیا۔ ''وہ پسندیدگی تو نشوونما پا کر ایک تناور درخت بننے جا رہی ہے، کیا تمہیں اتنے سارے لوگوں میں حسن جیسا کوئی دوسرا ملا۔'' اس کے دل نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔ ''ابھی تک تو نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آئندہ بھی نہیں

ملے گا کیونکہ جب یوں کوئی نظروں میں سما جاتا ہے تو پھر اس سے بہت اچھا کوئی لگتا ہی نہیں۔
دیارِ دل کے مکین کا قد کاٹھ ہی اتنا اونچا ہوتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا۔''
دل نے کہا۔

''محمد فیضان گورایہ ساڑھے چھ بجے شام۔'' شازیہ کے مانیٹر کی اسکرین اپائنٹمنٹس لسٹ میں چوتھے نمبر پر جو نام دکھا رہی تھی اسے دیکھ کر اس کے دل کے تار بج اٹھے تھے۔ پرسوں شام ہی اس کی فیضان سے بات ہوئی تھی اور اس وقت اس نے شازیہ کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر صبور سے ملنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اب شازیہ کو ساڑھے چھ بجنے کا شدت سے انتظار تھا۔ اس نے قدرے بے دلی سے پہلے اور دوسرے نمبر پر آنے والی کلائنٹس کا استقبال کیا تھا۔ تیسرے نمبر پر جن صاحب کو آنا تھا انہوں نے فون پر اپائنٹمنٹ کینسل کرنے کی درخواست کی تھی۔ چھ بج کر تین منٹ تک فیضان کلینک نہیں پہنچا تھا، شازیہ کا انتظار بے چینی میں بدل گیا تھا، اور اب وہ بار بار وال کلاک پر نظر ڈال رہی تھی تقریباً چھ بج کر پچپن منٹ پر سلمان کے ساتھ آنے والے باڈی گارڈ نے کلینک کا دروازہ کھولا تھا۔ اس کی مونچھیں اور گن دیکھ کر شازیہ کا دل حلق میں آ گیا۔ گویا اب فیضان نے بھی اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس باڈی گارڈ کے پیچھے فیضان اپنے والد کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ اس نے شازیہ پر ایک سرسری سی نظر بھی نہیں ڈالی۔ شازیہ کو محسوس ہوا کہ اس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی اور تناؤ چھایا ہوا تھا۔ اس کے والد نے ہی آگے بڑھ کر اپنی اپائنٹمنٹ کے بارے میں استفسار کیا۔ ڈاکٹر صبور کے پاس اس وقت کوئی کلائنٹ موجود نہیں تھا۔ شازیہ نے انہیں اندر چلے جانے کے لیے کہتے ہوئے ایک مرتبہ پھر فیضان پر نظر ڈالی، وہ ابھی بھی ایسے ہی تھا جیسے وہاں شازیہ کی موجودگی سے بے نیاز ہو۔ شازیہ یہ سوچنے کے باوجود کہ شاید وہ اپنے والد کی موجودگی کی وجہ سے اس قدر بے اعتنائی کا مظاہرہ کر رہا تھا اپنے دل میں اٹھنے والی چبھن سے چھٹکارا نہیں پا سکی تھی۔ جب تک وہ دونوں ڈاکٹر صبور کے پاس رہے اس کا دل پیچ و تاب کھاتا رہا۔
اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری بھی ڈھنگ سے نبھا نہیں پا رہی تھی۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے انٹر کام پر ڈاکٹر صبور کو اپنی طبیعت کی خرابی کے بارے میں مطلع کیا اور اپنا بیگ اٹھا کر کلینک سے باہر آ گئی۔
چاچا شریف نے اس کے لیے رکشا روکا۔ وہ فوراً اپنے گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ وہ جب سے

یہ نوکری کر رہی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے یوں اپنا کام درمیان میں چھوڑا تھا، شاید اسی لیے ڈاکٹر صبور نے بھی اسے گھر جانے کی فوراً اجازت دے دی تھی۔ اس کا رکشا ابھی راستے میں ہی تھا جب اسے بیگ میں موجود موبائل بجنے کی آواز آئی۔ اس نے موبائل نکالا۔ اس کی اسکرین پر فیضان کا نمبر جگمگا رہا تھا۔
''جہاں بھی اس وقت پہنچ چکی ہو وہاں سے فوراً ادھر ہی واپس آ جاؤ، میں کریم بخش کے باہر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔
''میری طبیعت خراب ہے۔'' شازیہ نے کہنا چاہا۔
تمہاری طبیعت کی خرابی کی وجہ میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم واپس نہ آئیں تو تمہاری طبیعت بالکل ہی صاف کر دوں گا۔'' فیضان نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔
پندرہ منٹ بعد وہ واپس لبرٹی پہنچ چکی تھی۔ کریم بخش کی سیڑھیوں کے پاس فیضان اسے چکن کارنر والے سے باتیں کرتا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی اس کے قریب پہنچ گئی۔
''مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔'' وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ''اگر تم نہ آتیں تو میں خود کو ملامت کرتا رہتا۔'' وہ اس کے ساتھ چلتا چلتا روڈ کراس کرنے لگا۔ ''آؤ بندو خان کے کباب کھاتے ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ شازیہ اس کے کچھ دیر پہلے والے رویے پر ابھی بھی دکھی تھی۔
''تم اتنی احمق ہو کہ اتنی سادہ سی بات بھی سمجھ نہیں پائیں۔ بابا، میرے والد میرے ساتھ تھے اوران میں فی الحال کسی صورت یہ اشارہ نہیں دینا چاہتا تا کہ میری تم سے خاصی واقفیت ہے۔'' بندو خان پر کارنر والی ٹیبل سنبھالتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
''کیوں......؟'' شازیہ نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ڈرتے ہو۔''
''نہیں۔'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں ڈرتا تو خیر ہرگز نہیں ہوں۔ البتہ ایسا ہے کہ آج کل حالات کچھ ایسے چل رہے ہیں کہ مجھے ابا سے بہت سے اہم معاملات پر بات کرنی ہے۔ ہر بات اپنا وقت آنے پر ہی جچتی ہے۔''
''یہ غیر اہم بات ہے کیا......؟'' شازیہ مزید غلط فہمی کا شکار ہوئی۔
''نہیں، میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میں نے بہت سے اہم معاملات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک یقیناً یہ بھی ہے لیکن اس کا جب وقت آئے گا جبھی اس کا تذکرہ بھی اچھا لگے گا۔ ویسے میں ان کے پیچھے رہ کر تمہیں کوئی ہلکا پھلکا اشارہ تو کر ہی سکتا تھا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرے یوں ریزرو

رہنے کا تم اتنا برا مناؤ گی۔'' وہ شرارت سے ہنسا۔ ''جب تم انٹر کام پر ڈاکٹر صبور کو اپنی طبیعت کی خرابی کا کہہ کر چھٹی مانگ رہی تھیں اسی وقت میرے دل نے کہا لو جی معاملہ سخت گڑبڑ ہو گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اسی وقت باہر نکل کر تمہیں روک لوں مگر دو بزرگوں کا لحاظ مانع تھا۔ ڈاکٹر صبور سے فارغ ہو کر والد صاحب کو گاڑی میں بٹھا کر رخصت کیا خود اپنے لیے ایک ضروری کام کا بہانہ بنایا اور تمہیں کال کی اس وقت بھی ڈر رہا تھا کہ کہیں تم گھر نہ پہنچ چکی ہو۔ فون پر رکشا کی پھٹ پھٹ سنائی دی تو شکر کیا، ویسے مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی حساس ہو۔''

''ایک عرصے تک گھٹائیاں جھیلتے رہنے کے بعد ایک اچھا احساس ملے تو اس کے کھو جانے کا ڈر انسان کو اسی طرح حساس بنا دیتا ہے۔'' شازیہ کی آواز بھرا گئی۔

''آئی ایم امپریسڈ۔'' فیضان نے ہاتھ میں پکڑا موبائل میز پر رکھتے ہوئے کہا ''تم واقعی بہت معصوم ہو اور اس بات کی مجھے بہت خوشی ہے، معصومیت ایک ایسی چیز ہے جو اب لڑکیوں میں بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔ ٹھیک ہے میری جان، وعدہ رہا کہ اب اس طرح تمہیں کبھی تکلیف نہیں دوں گا۔ مجمع میں بھی نظر آ گئیں تو کوئی نہ کوئی اشارہ ایسا ضرور دے دوں گا جس سے تمہیں تسلی ہو جائے کہ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے ورنہ میرا تو یہ خیال تھا کہ اتنے قریبی تعلق میں احساس دلانے کی تو ضرورت ہی نہیں رہتی۔'' فیضان کے اپنائیت بھرے لہجے میں کہی اس بات نے شازیہ کے دل سے گلہ دور کر دیا اور اب وہ اس سے ان اہم معاملات پر بات کر رہی تھی جو اسے اپنے والد سے ڈسکس کرنا تھے۔

''تم ایک کام کرو۔'' فیضان کو اچانک ایک خیال آیا۔ شازیہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم نے بتایا تھا کہ دن کے وقت تم مختلف کلاسز لیتی ہو کوکنگ اور دوسرے ہنر سیکھنے کی ہے نا؟'' شازیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب تم گانا سیکھنے کا کام شروع کر دو۔''

''کیا.....؟'' شازیہ نے بے اختیار کہا ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''بھئی گانا سیکھنے کا تو بہانہ ہی ہو گا دراصل تم ذرا میڈم مہ مارہ بیگم سے تھوڑی واقفیت حاصل کرو گی۔''

''نہ بابا..... میں تو ہرگز یہ کام نہیں کر سکتی۔'' شازیہ نے صاف انکار کیا ''میرے ابا جی تو کان سے پکڑ کر مجھے گھر سے نکال دیں گے۔''

''واپس سا ہیوال نہیں بھجوا دیں گے۔'' فیضان نے شرارت سے کہا مگر پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا ''دیکھو شازیہ تم یہ سمجھو کہ تم یہ کام صرف میرے لیے کرو گی، مجھے صرف چند روز کے لیے تمہارا وہاں جانا درکار ہے۔''

''تم نے تو خود بھی وہاں جانے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔'' شازیہ نے کہا اس کی یہ بات سن کر وہ تذبذب میں پڑ گئی تھی۔

''ہاں۔'' فیضان نے ہونٹ بھینچ کر سر ہلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا ''مگر پتا نہیں کیوں میں نے ادھر جانا ترک کر دیا۔ دراصل خواتین مردوں سے کتنی بھی بے تکلف ہو جائیں ایک حجاب پھر بھی باقی رہتا ہے خصوصاً مہ پارہ بیگم جیسی خواتین اس کی شدت سے قائل ہوتی ہیں مگر خواتین ایک دوسرے سے بہت سی باتیں چھپانے کی کوشش نہیں کرتیں، شاید تمہارے وہاں جانے سے میرے ذہن کی کوئی الجھن سلجھ جائے۔''

''تمہاری خاطر میں ایسا ضرور کر لوں مگر میرے گھر والے، میرے گھر کا ماحول میرا اپنا مزاج شاید مجھے ایسا نہ کرنے دیں، ویسے بھی یہ ایک فن ہے جو ہر کوئی نہیں سیکھ سکتا۔'' شازیہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''پھر کوئی اور صورت ہو سکتی ہے تمہارے وہاں جانے کی؟'' فیضان نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ میں سوچنے کی کوشش کروں گی، اس سلسلے میں میں جس طرح بھی تمہاری مدد کر سکی ضرور کروں گی لیکن گانا وانا سیکھنے کا اصرار مجھ سے مت کرنا پلیز.....'' شازیہ نے کہا۔

''چلو ایسے ہی سہی، میں منتظر رہوں گا اس سلسلے میں تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو۔'' فیضان نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے کہا ''چلو، اب میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ شازیہ نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اس روز وہ معمول سے لیٹ ہو چکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

''والد صاحب اپنی قیمتی گاڑی لے گئے ورنہ میں آج تمہیں اس میں سفر کراتا، میرے لیے انھوں نے یہ شہزادی بھجوائی ہے۔'' کریم بخش کے سامنے واپس آ کر فیضان نے ایک نیوی بلو ہنڈا اکارڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کتنی گاڑیاں ہیں ان لوگوں کے پاس اور کتنی آسائشات۔'' شازیہ نے گاڑی میں بیٹھتے

کے بعد سوچا ''مگر کس قدر تضاد ہے ان کی زندگیوں میں۔'' وہ اس شاندار زندگی کی حقیقت کو تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھی جس کی ایک مثال فیضان کی شکل میں اس کے سامنے تھی۔

.....

''ایک معالج اپنے مریض کو شاید بہت اچھی طرح جانتا ہو، مگر اس حد تک نہیں جتنا ایک باپ اپنے بیٹے کو جانتا ہے۔'' چوہدری مقصود گورائیہ اپنے سامنے بیٹھے فیضان سے کہہ رہے تھے۔ ''میں سلمان کے مسئلے کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں وہ آزادی اور بے فکری کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ جبھی وہ میرے کہنے پر بہت سی ایسی ذمے داریوں سے دور بھاگتا ہے جن میں اسے اپنی آزادی سلب ہوتی دکھائی دیتی ہے اور اسی لیے اس نے اب اس ذہنی بیماری کے ڈھونگ میں پناہ لے لی ہے۔''

''آپ نے اس روز ڈاکٹر صبور کی بات غور سے سنی تھی نا، وہ کہہ رہے تھے سلمان کو اس کی ناپسندیدہ زندگی میں جھونک کر ہم اسے گنوا بیٹھیں گے۔'' فیضان نے تحمل اور نرمی سے اپنی بات دہرائی۔

''کچھ بھی نہیں ہوگا اسے، تجربے کی اپنی اہمیت ہے گو تمھارے یہ نئے نئے طریقہ کار اور ایجادات بہت معاون ہیں انسانی صحت کو جانچنے کے لیے مگر تجربے کی آنکھ بہت کچھ دیکھ سکتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ اس زندگی میں کھب گیا تو وہاں سے نکلنے کی خواہش کبھی نہیں کرے گا۔'' اس کے والد اپنے موقف پر ڈٹے تھے اور اسے معلوم تھا کہ وہ یونہی ڈٹے رہیں گے مگر سلمان کی زندگی اس کے لیے ہر چیز سے اہم تھی سو اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ان سے ایک ایسی بات کی تھی جو نہ ختم ہونے والی بحث اور ناراضی پر منتج ہو سکتی تھی۔

''ابا میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ڈاکٹر صبور کی بات کو یکسر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے، کم از کم فوری طور پر تو ہمیں سلمان کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کرنی چاہیے، اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ ہم اسے واپس علاقے بھیج دیں گے، اس کا ردعمل پہلے سے زیادہ شدید ہوگا، وہ پھر اسی طرح بیمار پڑ جائے گا اور ہم ایک لمبے عرصے تک اس کا علاج بھی کرواتے رہیں گے، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم فی الحال اسے یوں ہی رہنے دیں۔ پڑھنے کے لیے باہر بھجوا دیں اور اسے موقع دیں کہ وہ حقیقتوں کو خود سمجھنے کی کوشش کرے۔'' فیضان نے ایک مرتبہ پھر سہولت سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''ہوں۔'' وہ غور سے اس کی بات سننے کے بعد بولے ''یہ تم لوگوں کی پڑھی لکھی باتیں ہیں جو تم اور وہ ڈاکٹر آپس میں اس روز بھی کر رہے تھے انگریزی میں، میں بہت روانی سے انگریزی نہیں بول سکتا ہوں، سمجھ ضرور لیتا ہوں آسانی سے۔ صاحبزادے بات یہ ہے کہ ہمارے بزرگ

بھی اگر ہمیں یونہی موقع دیتے رہتے اور حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے دیتے تو اب تک ہمارا نام و نشان مٹ چکا ہوگا۔ منہ زور سرکش گھوڑوں کو کاٹھی وقت پر نہ ڈالیں تو وہ قابو سے باہر ہو جاتے ہیں سو یہ موقع دینے کی بات تو ہرگز مت کرو، یہ معاملہ میں خود نبٹا لوں گا۔''

''اس شخص کے سینے میں وہ دل ہی نہیں جو اولاد کی پریشانی کو محسوس کر لے۔'' فیضان نے بھنا کر سوچا۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں۔'' پھر اس نے جھجکتے ہوئے کہا ''تو سلمان کے مکمل ٹھیک ہو جانے تک میں چلا جاتا ہوں وہاں، میں بہت برا منتظم ثابت نہیں ہوں گا، آپ یقین جانیے۔''

''اچھا تو اب ہماری اسکیمز اور پلان تم بناؤ گے۔'' انھوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سامنے دیوار پر لگے آئینے کی طرف جاتے ہوئے کہا اور آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنے کوٹ کا کالر درست کرنے لگے ''تم جانتے ہو کہ جو تمہارا مزاج ہے اور جس طرح کی زندگی تم اتنے سالوں سے گزارنے کے عادی ہو چکے ہو اس کے بعد تم وہاں کے معاملات کے ساتھ ایک ہفتہ بھی نہیں نکال سکتے۔''

''تو آپ نے مجھے شروع ہی سے ایسا رف لک کیوں نہیں بنایا تھا۔'' بے اختیار فیضان کے منہ سے الفاظ پھسل پڑے، انھوں نے گھوم کر ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر آئینے کی طرف چہرہ کر لیا۔

''شاید یہی میری غلطی ہے اگر میں ایسا کرتا تو شاید آج تم مجھ سے یوں بحث نہ کر رہے ہوتے۔'' انھوں نے اسے وہ وجہ نہیں بتائی تھی جس کا ذکر وہ ڈاکٹر صبور سے کر چکے تھے۔

''تم جو زندگی گزار چکے ہو اور جو گزار رہے ہو کیا اس میں کوئی خرابی نظر آ رہی ہے جو یوں والینٹر بننا چاہتے ہو سلمان کی خاطر۔'' وہ مزید بولے۔

''شاید میں جو کہنا چاہتا تھا وہ درست طریقے سے کہہ نہیں پایا۔'' فیضان نے سر جھکا کر کہا۔

''نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔'' وہ کوٹ ٹھیک کرنے کے بعد واپس اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ ''تم جو کہنا چاہتے تھے جو کہہ نہیں پائے میں وہ بھی سمجھ چکا ہوں، زیادہ سوال مت سوچا کرو خوامخواہ کی الجھنیں بڑھا لو گے، تمہاری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے اسے یوں ہی اچھا اچھا گزارے جاؤ۔''

''میرا خیال ہے کہ جو زندگی میں نے اب تک گزاری ہے اسی کی وجہ سے میں اپنے ذہن کی الجھنیں سلجھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔'' ان کی سرد مزاجی اور استہزائیہ انداز نے فیضان کو طیش دلا دیا تھا۔ ''اور سلمان کے معاملے میں بھی میں پہلے کی طرح بے پروائی نہیں ہونے دوں گا۔'' اس

کا لہجہ یقیناً درشت ہو گیا تھا۔

''ہوں۔'' انھوں نے اپنی سلور گرے مونچھوں کے سرے سنوارتے ہوئے کہا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے ''ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو میرا خیال ہے کہ تم کہیں جانے والے تھے۔'' فیضان کو کہیں بھی نہیں جانا تھا مگر وہ ان کا اشارہ سمجھ گیا تھا خود اس کو بھی اتنا اطمینان ضرور ہو چکا تھا کہ وہ اپنی بات ان تک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا۔

.....

''میں نے تمھارے کہنے کے مطابق مہ پارہ بیگم تک رسائی حاصل کر ہی لی۔'' فیضان کی توقع کے خلاف شازیہ نے اسے چند دن بعد ہی فون پر بتایا تھا۔

''خوب، بہت خوب، تم میری توقع سے زیادہ ایکٹو نکلیں۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا'' کیسے اور کیا پروگریس ہے؟''

''میں نے انھیں بتایا کہ میں اون لکر میں ان کے متعلق مضمون پڑھ کر ان سے ملنے کی مشتاق ہوں اور اس لیے ان سے ملنے چلی آئی۔''

''پھر.....؟''

''پھر انھوں نے کہا بی بی، مجھے لگتا ہے میں نے تمھیں کہیں دیکھا ہے۔ میں نے یاد دلایا کہ انھوں نے مجھے کہاں دیکھا ہے۔''

''اوہ.....!'' فیضان نے کہا'' پھر.....''

''پھر کچھ نہیں اِدھر اُدھر کی چند باتیں ہوئیں اور بس۔''

''تم نے اُن سے ان خبروں کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی جو ان کے متعلق آج کل پڑھنے کو مل رہی ہیں۔''

''نہیں، ان کے متعلق بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ وہاں پہلے ہی ان خبروں پر بات ہو رہی تھی۔''

''کون کر رہا تھا؟'' فیضان نے دلچسپی سے پوچھا۔

''وہاں اون لکر کی ایڈیٹر بھی موجود تھیں اور غالباً وہ مہ پارہ بیگم کا کوئی انٹرویو وغیرہ لے رہی تھیں، میرے سامنے کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی مگر کرن فاطمہ کہہ رہی تھیں کہ آپ نے جو انکشاف کیے ہیں ان کی وجہ سے بڑے بڑے لوگوں کی گردنیں ناپی جا سکتی ہیں اگر ان کو آپ بیتی

کی شکل میں سنایا یا پڑھایا جائے۔''

''خوب۔'' فیضان نے اپنے ذہن میں اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے مہ پارہ بیگم نے آنے سے پہلے یہ بھی کہا کہ تم دوبارہ ضرور آنا، اس وقت تو میں مصروف تھی پھر کبھی فرصت سے بات کریں گے، ان کی شخصیت کا جو رعب میرے دل پر طاری تھا وہ ان کے اس اپنائیت بھرے لہجے اور خوش مزاجی کی وجہ سے ہوا ہو گیا۔'' شازیہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''بڑی بات ہے شازیہ۔'' فیضان مسکرایا۔'' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم میری بات کو اتنی سنجیدگی سے لوگی اس روز تمھارے صاف انکار کی وجہ سے تو میں مایوس ہی ہو چکا تھا۔''

''مجھے بڑی بڑی باتیں یاد دعوے کرنے نہیں آتے مگر تعلق نبھانے کی خاطر میں اپنی توفیق کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور کرنا جانتی ہوں۔''

''گریٹ یو آر، مجھے اپنے انتخاب پر بھروسا ہے۔'' فیضان نے بلند آواز میں کہا اسے شازیہ کے اس عمل سے حقیقی خوشی محسوس ہو رہی تھی اور اپنی ذاتی زندگی کے معاملات میں پہلی مرتبہ دوسرا ہٹ کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

.....

''چوہدری صاحب نے آپ کا معاملہ کیسے سلجھایا پھر؟'' مہ پارہ بیگم کے ساتھ اگلی نشست میں کرن نے پہلا سوال کیا۔

''اس سلجھاؤ میں بڑے الجھاؤ تھے، چوہدری صاحب نے احسان دھرنے کی خاطر پیغام بھجوایا کہ حویلی متروک املاک میں شامل کرا کے اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد وہ اسے میرے نام گفٹ کرنے کو تیار تھے، یوں قانونی عذر پورے ہو سکتے تھے اور حویلی باقاعدہ میری ملکیت میں آ سکتی تھی، ہے تو بظاہر یہ ایک سیدھا سا حل مگر میری وہ اکڑ ابھی پوری طرح نہیں گئی تھی یا پھر میں معاملات سے اتنی باخبر نہ تھی البتہ یہ ضرور سمجھ گئی کہ یہ احسان دھر کر درحقیقت وہ اپنی کہی پرانی بات پوری کرنا چاہتے تھے کہ ایسا نہ ہو مجھے انھیں مسکرا کر حویلی میں خوش آمدید کہنا پڑے۔ سو میں نے اس احسان کو لینے سے انکار کر دیا۔''

''اس پر تو وہ بہت بگڑ گئے ہوں گے؟'' کرن نے کہا۔

''بگڑے ہوں گے یا نہیں اس کا تو مجھے علم نہیں البتہ انھوں نے یہ ضرور پچھوایا کہ پھر میری نظر میں اس کا حل کیا ہے۔ اب حل تو جو بھی تھا انہی کے ہاتھ میں تھا جس طرح ملکیت کے متعلق

سوال اٹھائے گئے تھے اسی طرح ختم بھی کرائے جاسکتے تھے مگر وہ ایسا کیوں کرتے کہ انھوں نے جس مقصد کے لیے ہمیں اس آزمائش میں ڈالا تھا وہ کیسے پورا ہوتا۔ ادھر دن اور مہلت تھی کہ ختم ہوئی جارہی تھی، انہی دنوں ایک اور اہم واقعہ ایسا ہوا کہ ہم سب کی جانو مت ماری گئی۔''

''وہ کیا ہوا؟''

''میں نے شاید تم سے مہرو خالہ کی بیٹی شنو کا ذکر نہیں کیا، یہ شنو بی بی لڑکپن میں ہی کسی آوارہ سے شخص کے ساتھ عشق لڑانے کے بعد اس کے ساتھ فرار ہو چکی تھیں مع مہرو خالہ کے جمع جتھا کے، سننے میں آیا تھا کہ اس لڑکے نے انھیں کسی رئیس آدمی کے پاس بیچ دیا تھا وہ رئیس آدمی انھیں اپنی رانی بنا کر غالباً ولایت لے گیا تھا۔ مہرو خالہ شنو پر اپنے جمع جتھے سمیت فاتحہ پڑھ چکی تھیں۔ حکومت کی بھلوائی مہلت میں دو دن باقی تھے جب شنو بیگم اچانک کہیں سے آن حاضر ہوئیں۔ گود میں ایک بچہ اٹھائے، چہرے سے لگتا تھا زمانے بھر کی خاک اڑانے کے بعد یہاں پہنچی تھیں۔ حالت اس قدر خراب کہ ہم میں سے تو کسی نے کیا پہچاننا تھا مہرو خالہ بھی ان کو نہ پہچان پائیں۔ انھوں نے آ کر یہاں.....ادھر۔'' مہ پارہ بیگم نے صحن کے ایک کونے سے اوپر جاتے زینے کی طرف اشارہ کیا ''ادھر سیڑھیوں پر بیٹھ کر کمال کے بین کرنے شروع کر دیے۔ ''اے اماں اگر تم مجھے نہیں پہچانو گی تو پھر بھلا زمانے میں مجھے کون پہچانے گا، اے اماں میں اجڑ گئی، میں لٹ گئی، اے اماں اگر تم بھی مجھ غریب کی طرف نظر نہ کرو گی تو کون کرے گا۔'' غرض وہ چیخ و پکار ان محترمہ نے ڈالی کہ الامان، ادھر مہرو خالہ اندر پھنکارتی پھر رہی تھیں۔

''اس بدذات سے کہہ دو یہاں سے دفع ہو جائے اس شنو کو یہاں کا راستہ دکھایا کس نے، کسی کسبی کے کوتھوں والی، ذات کی میراثن اس کو دھکے دے کر نکال باہر کرو۔'' ہم سب حیران کس کی سنیں کس کی نہ سنیں، شنو چلاتے ہوئے بے دم ہو کر سیڑھیوں ہی پر بے ہوش ہو کر گر گئی۔ منہ سے خون اگلنے لگی چھوٹا سا بچہ پاس بیٹھا ریں ریں کر رہا تھا، مرتے کیا نہ کرتے اس کو اٹھایا، سنبھالا پانی وانی پلایا اور اس کا احوال سنا۔ زمانے بھر کے ظلم اور دکھ اس نے ہمیں سنائے جو اس کو اٹھانے پڑے تھے اور اب بقول اس کے اس کا آخری وقت تھا کیونکہ وہ ٹی بی کی آخری اسٹیج پر پہنچ چکی تھی، دیکھنے میں بھی ایسا ہی دکھتا تھا یہ بتا اس کی سن کر مہرو خالہ کچھ نرم پڑ گئیں آخر ماں تھیں غریب کیا کرتیں۔ اسے اٹھایا، سنبھالا، بچے کو سنبھالا خاصی ٹہل سیوا کے بعد شام تک وہ اس قابل ہوئی کہ باقی کا احوال سنا سکے۔ بقول اس کے وہ رئیس صاحب اسے ولایت پھینک کر ایسے غائب ہوئے

کہ آج تک ان کا نشان نہ ملا اور نہ جانے کہاں کہاں کے دھکے کھانے کے بعد واپس ادھر پہنچی تھی، بچہ رئیس صاحب کا تھا اور اس وقت تک چونکہ شنو کی حالت بہت بگڑ چکی تھی وہ پوچھتی پچھواتی بچے کو ادھر لے آئی تھی مہرو خالہ کے حوالے کرنے۔ ابھی ہم یہ گفتگو سننے ہی میں مصروف تھے کہ کسی نے چوہدری مقصود احمد گورائیہ کی آمد کی اطلاع دی۔ شنو یہ نام سن کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''یہ یہاں کیوں آیا ہے؟'' اس کا سوال سن کر ہم سب ہی چونک گئے۔

''تو جانتی ہے اسے کیا؟'' مہرو خالہ نے پوچھا۔

''اس کا بھائی منظور احمد گورائیہ ہی تو اس بچے کا باپ ہے۔'' اس نے ایک نیا انکشاف کیا۔

''اماں مجھے چھپا لو، یہ اب نہ جانے میرے ساتھ کیا کرنے آیا ہے۔'' پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''یہ ایک نئی صورتِ حال تھی، قطعی غیر متوقع اور عجیب و غریب'' یہ بچہ جو تو میرے حوالے کرنے آئی تھی اس کے حوالے کر جو اس کا چچا یا تایا ہے، مار اس کے منہ پر بچہ یہ بھائی لوگوں کو جگہ جگہ ذلیل کرنے ہی دنیا میں آئے ہیں، دل پھینک، عیش پرست، کم بخت۔'' مہرو خالہ نے تنک کر کہا مگر شنو کو ایسا کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی وہ چوہدری مقصود کی آمد کا سن کر ہی دم ہار بیٹھی تھی۔ کھانسی کا ایک شدید حملہ اس پر ہوا اور وہ کھانستے کھانستے بے دم ہو کر پڑ گئی، ہم سب کو اس کی پڑ گئی ڈاکٹر بلوایا گیا مگر شاید وہ آخری مرتبہ ماں کو دیکھنے کے لیے ہی یہاں پہنچی تھی۔ رات تک اس کے سانس ختم ہو گئے اور وہ اپنے آخری ٹھکانے پر پہنچ گئی۔

''شنو کا یہاں آنا اور چوہدری مقصود کے ساتھ ایک انوکھے تعلق کا انکشاف چکرا دینے والی بات تو تھی ہی مگر یہ ہمارے لیے اس بدترین صورتِ حال میں ایک ٹرننگ پوائنٹ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ مہرو خالہ نے دنیا دیکھ رکھی تھی اور وہ زمانے کی تمام چالوں سے بخوبی واقف تھیں سو ابتدائی سوگ منانے کے بعد اپنے پاس وقت کم ہونے کے سبب ان کا تجربہ کار ذہن کسی اور نقطے پر سوچنے لگا۔ سوا گلی سہ پہر ہی انھوں نے شنو کے جنازے کے بعد مجھے اور استاد صاحبان کو اپنے پاس بلایا۔

''ان کا خیال تھا کہ اس بچے کی شکل میں ان کے ہاتھ میں ایک ہتھیار آ گیا ہے، شنو کے بیگ سے بچے کا پیدائشی سرٹیفکیٹ بھی نکل آیا تھا، سو ہم نے چوہدری مقصود کو الٹا بلیک میل کرنے کا پورا پروگرام طے کر لیا اور چوہدری مقصود کو اسی رات ملاقات کے لیے وقت بھی دے دیا۔ وہ اپنے وقت پر یہاں پہنچ گئے، مہرو خالہ نے بچے والا انکشاف کیا اور اپنے تئیں دھمکی دی کہ اگر ہم سے حویلی چھیننے کا

پروگرام پکا ہو چکا ہے تو ہم بچے والی بات عام کر کے ان کے لیے بھی مشکلات کھڑی کر سکتے تھے۔"

"پھر ان کا ردعمل کیا ہوا؟" کرن نے بے صبری سے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں، بڑے تحمل سے بولے کہ حویلی چھیننے والی بات سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا البتہ وہ تو اس سلسلے میں ہماری مدد کرنا چاہتے تھے۔ بچے والی بات کو انھوں نے قطعی جھٹلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ سرد آہ بھر کر بولے 'ہمارے بڑے بھائی صاحب مرحوم کی زندگی کے ڈھنگ کچھ عجیب سے ہی رہے۔ ہماری بھابی محترمہ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی، جب تک زندہ رہے اولاد کو ترستے رہے یہ نہیں بتایا کہ کوئی ایسا بچہ ولایت چھوڑ آئے ہیں۔ یقیناً اپنی بیوی کے اس بازار سے تعلق کو ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں گے جبھی یہ بات بتا نہ سکے۔"

"کون سا اس بازار میاں.....؟" مہرو خالہ بیماری اور بڑھاپے کے باوجود تنک کر بولیں "وہ اور ہوں گے جن کا تعلق کسی قسم کے بازاروں سے ہوگا، ہم خالص دلی والیاں ہیں اور ہماری کسی بھی نسل میں سے کوئی لڑکی کوٹھے پر نہیں بیٹھی، گانا بجانا ہمارا خاندانی فن ہے، ضروری ہے کہ فن کا تعلق کسی بازار سے ہی ہو۔"

"آپ اپنی دختر کے والد کا نام بتانا پسند فرمائیں گی؟" مہرو خالہ کی فوں فوں سن کر چوہدری مقصود ملائمت سے مسکرا کر بولے۔ اس بات کا مہرو خالہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"وہ تو شتامہ بدقسمت اپنے بھولپن میں چڑھ گئی تمھارے بھائی جیسے لوگوں کے ہاتھ ورنہ ہم ایسے ویسے کسی کے دام میں آنے والے نہیں۔" مہرو خالہ نے زچ ہوتے ہوئے تنک کر کہا۔

"چلیں جو بھی ہوا، اب یہ بتائیں کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟" چوہدری مقصود نے محظوظ ہو کر جواب دیا۔

"تم ہمارے ٹھکانے کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ ہم اس بچے کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیں گے، تمہاری خاندانی شرافت کا سامان بنا کر۔" مہرو خالہ کا ہتکھنڈا ان کے پس منظر کا پرتو تھا۔

"آپ ایسا کر نہیں سکیں گی۔" چوہدری مقصود سنجیدگی سے بولے "ویسے میں تو مہ پارہ بیگم کی مدد کرنا چاہتا تھا حویلی کے سلسلے میں۔" انھوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر میری موجودہ حیثیت ان کے کسی کام آ سکتی تو میرے لیے خوشی کی بات ہوتی مگر آپ لوگ شاید خود ہی ادھر رہنا نہیں چاہتے۔" مہرو خالہ کا وار ضائع ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

"ہم تو ادھر سے نکال دیے جائیں گے مگر یہ یاد رکھو جاتے ہوئے تم جیسوں کی شرافت کا

جنازہ بھی نکال کر جائیں گے۔" مہرو خالہ جن کے خیال میں شنو کی غیر متوقع آمد ہمارے لیے معجزہ ثابت ہونے والی تھی اور میرے ذہن میں بے شمار سوال گردش کر رہے تھے۔ حویلی سے بے دخلی، نئے ٹھکانے کے لیے خواری، بنی بنائی عزت خلاص، خبریں، افواہیں، قیافے، لوگوں کی زبانیں میرے لیے یہ سب باتیں ناقابل برداشت تھیں۔ میں چکراتے سر کو پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"اگر آپ کو یہ سارے حل ہی ناقابل قبول ہیں تو ایک اور سادہ سا حل پیش کرتا ہوں۔" چوہدری مقصود کی آواز میرے کان میں پڑی تو میں ذرا چوکنی ہو کر بیٹھ گئی۔

"مہ پارہ جی کو ایک مداح کی گفٹ کی ہوئی حویلی قبول نہیں تو ایک شوہر کی گفٹ کی ہوئی حویلی قبول کر لیں!"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں بے ساختہ بولی۔

"سیدھی سی بات ہے آپ کا؟" میں بے ساختہ بولی۔

"سیدھی سی بات ہے وقت کم رہ گیا ہے زیادہ بحث اور سوچ میں پڑنے کے بجائے ایسا کرتے ہیں کہ ایک رسمی سا نکاح کر لیتے ہیں پھر حویلی کا معاملہ میں جانوں یہ آپ کی سردردی نہیں رہے گی۔" میں تلملا کر کوئی سخت سا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ میری نظر استاد کالے خان پر پڑی جو سر کے اشارے سے مجھے کوئی بات کرنے سے منع کر رہے تھے۔ مجھے بھنا کر خاموش رہنا پڑا۔

"استاد جی اگر اس بات کا کوئی مثبت جواب ملا تو مجھے مطلع کر دیجیے گا ورنہ پھر حویلی سے سامان سمیٹنے کی تیاری کر لیجیے گا۔" چوہدری مقصود نے اپنا نقرئی سگریٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا اور کھڑے ہو گئے، میں نے ایک نظر مہرو خالہ کے دھواں ہوتے اور چوہدری صاحب کے پرسکون چہرے پر ڈالی اور میرے اندر مزید آگ لگ گئی۔

"ہر دو صورت میں کل میرے دو بندے آئیں گے اور وہ بچہ جو یہاں لایا گیا ہے اسے لے جائیں گے، امید ہے کہ اس معاملے میں آپ مجھے اس سے زیادہ زحمت اٹھانے کا موقع نہیں دیں گی۔" اب وہ مہرو خالہ سے مخاطب تھے۔

"جاؤ جاؤ میاں، ساری زندگی دیکھے ہیں بہت تم سے طرم خان اور ان کو انگلیوں پر نچایا بھی ہے، یہ فن ابھی ہم بھولے نہیں، جاؤ تم اپنی سی کرو ہم اپنی سے کرتے ہیں۔" وہ اسی پرانی اکڑ کے ساتھ بولیں مگر مجھے محسوس ہوا کہ ان کا لہجہ خاصا کھوکھلا ہو چکا تھا اس وقت تک استاد صاحبان چوہدری صاحب کو رخصت کرنے چلے گئے اور کمرے میں صرف ہم دو نفوس رہ گئے۔

''اے بی، یہ اونٹ جس کروٹ بیٹھنے والا ہے وہ تو نظر آ رہا ہے۔'' مہرو خالہ نے بازو گھٹنے پر اور ہاتھ پیشانی پر ٹکاتے ہوئے کہا ''تمہاری سوکھی ماری فوں فاں نے اس حال تک پہنچایا ہے ایک گیت سنانے کی ضد تھی نا، کیا تھا جو پوری کر دیتیں!''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کی ذاتی زندگی پر حملے کر دیے جائیں۔'' میں تنتنا کر بولی۔

''یہ تو اس میدان میں نیا، نیا آیا ہے شکر کر اس لیے پھر بھی شرافت سے کام لے رہا ہے ہم نے تو کئیوں کو ایسی ہی معمولی ضد کے پیچھے لوگوں کو اٹھاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اٹھا لے جاتے ہیں اپنی ضد اور من مانی پوری کر لیتے ہیں پھر واپس چھوڑ جاتے ہیں اور جن کے ساتھ ایسا کرتے ہیں وہ یوں رہتی ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔'' یہ جو اتنے خاموش دریا بہہ رہے ہیں نا اس فن لی دنیا میں ان کی تہہ میں کبھی موقع ملے تو جھانک کر دیکھو کیسے طوفان بپا ہیں۔'' مہرو خالہ کا تجربہ بولنے لگا۔

''پھر اب کیا کروں، آپ کی بچے والی بات بھی رائیگاں گئی، اس نے تو کوئی نوٹس ہی نہیں لیا الٹا بولا بچہ لے جاؤں گا۔'' میں نے انھیں اشتعال دلانے کی کوشش کی۔

''ہاں تو لے جا سکتا ہے تو کہہ رہا تھا نا!'' وہ بھڑکے بغیر بولیں ''بی بی اس وقت راج ہے اس کے پاس، زمانہ وہ چل رہا ہے جب شرفا ٹوپیاں سنبھالتے پھر رہے ہیں، فوجی عدالتوں اور شرعی سزاؤں کی آڑ میں پرانے بدلے چکائے جا رہے ہیں۔ اس ملک میں اسلام نافذ ہو چکا ہے جسے یہ لوگ شرعی قانون کہتے ہیں جس کی ڈور طالبان رہا ہے۔ اب بتا تیرے میرے جیسیوں کی کون سنے گا اس وقت میں.....'' وہ لفظ چبا چبا کر بولیں۔

''تو پھر ایسا کریں کہ سامان بندھوانا شروع کر دیں۔'' میں نے فیصلہ صادر کر دیا۔

''ہاں، جیسے آگے تیرے لیے محل سرا سجی ہوگی کسی محلے میں.....'' وہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولیں ''بی بی یہ حاکم کی ضد ہے جو تجھے یہاں سے نکلوائے گی تو کہیں بھی چین سے نہ بیٹھنے دے گی وہ تجھے ہر اس جگہ سے نکلوائے گا جہاں تو رہنے کی کوشش کرے گی تاوقتیکہ تو اس کی بات نہ مان لے۔''

''کیا مطلب ہے، کون سی بات مان لوں؟'' میں بھڑک کر بولی۔ ''جو گیت سنانے سے چل کر نکاح پڑھوانے تک آ پہنچی ہے۔''

''اب تو یہ بات مانے گی ہی تو رہ سکے گی سلامت حویلی میں بھی اور فن کی دنیا میں بھی.....'' انھوں نے میری سماعتوں پر تجربے کا ایک اور بم برسایا۔

''پھر کیا ہوا؟'' کرن نے تجسس کی انتہا پر پہنچ کر بے اختیار پوچھا۔

''پھر کیا ہونا چاہیے۔ تھا'' مہ پارہ بیگم نے مسکرا کر کہا ''وہی ہوا جو منظور خدا تھا۔''

''بتایئے تو.....'' کرن نے بے چینی کا مظاہرہ کیا۔

''دراصل انسان بہت کمزور اور الجھا ہوا ہوتا ہے اس کے دعوے، اس کے اصل، اس کا تنتنا، غرور، انا، خودی، خودداری سب ایسی چیزیں ہیں جن پر حالات اور مصلحت قابو پا لیتے ہیں اور پھر انہیں خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں جب ہی تو پیروں، ولیوں، بزرگوں نے ان سب چیزوں سے منع فرمایا ہے اور شاید اسی لیے ہمارے اس خطے کی سمجھدار مائیں اپنی بیٹیوں کی تربیت کرتے ہوئے ایک پیغام ضرور سناتی جاتی ہیں کہ بیٹا پانا پتا مارنا سیکھ، پتا مارنا جوڑ کی سیکھ جاتی ہے بڑے آرام میں رہتی ہے۔ میرے ساتھ ٹریجڈی یہ رہی کہ جتنی بڑی میں خود تھی اس سے کہیں زیادہ بڑی میری انا تھی، میں نے پنا مارنا نہیں سیکھا تھا سو قدرت اور قسمت مجھے یہ دونوں سبق سکھانے پر تل گئیں۔ اسی دعوت، اصول، تنتنے، غرور، خودی اور خودداری جس کے سبب میں نے چوہدری مقصود کو گیت نہ سنانے کا اعلان کیا تھا، اسی کو بچانے کے لیے مجھے اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے کیونکہ میں نے لمحوں میں جان لیا تھا کہ مہرو خالہ غلط نہیں کہہ رہی تھیں، اقتدار اور منصب جب تک چوہدری مقصود کے سر پر ہما کی صورت سجے تھے اس وقت تک اس نے ہمیں کہیں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دینا تھا۔ یہ حویلی تو جاتی سو جاتی رہنے کو کوئی مستقل ٹھکانا نہ مل پانے کے

امکانات قوی تھے۔ جوں جوں سوچتی گئی بڑی اہم باتیں سمجھ میں آتی گئیں، ہڑبڑا کر استاد کالے خان کے پاس جا پہنچی اور انہیں چوہدری مقصود کی نکاح کی پیش کش قبول کر لینے کا عندیہ دے دیا۔ جب عقل کو ہر جانب اندھیرا دکھاتا ہے تو وہ بھی عمل کرنا بند کر دیتی ہے، یہی حال میرا ہوا اپنی جان سے عزیز انا کو بچانے کے لیے وہ کرنے بیٹھ گئی جس سے چند ماہ پہلے صرف ایک گیت سنا کر بچا جا سکتا تھا۔"

"تو آپ نے چوہدری مقصود سے نکاح کر لیا؟" کرن نے گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، نکاح کر لیا۔" مہ پارہ بیگم نے سر جھکا کر اپنے بازو میں پڑے ٹھوس کڑے گھماتے ہوئے کہا۔

"اور باہر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"

"اس وقت تو قطعی نہیں ہوئی، باہر کیا یہاں ہماری حویلی میں بھی ماسوائے استاد صاحبان، مہر و خالہ، فتح خان، استاد کالے خان کی پھوپھی مرحومہ اور اس خاص ملازمہ چمپا کے علاوہ کسی کو پتا تک نہیں چلا کرات کے اندھیرے میں یہاں کیا کایا پلٹ ہوئی۔"

"چوہدری مقصود نے بھی کسی کو نہیں بتایا؟"

"اس خبر کے اڑنے سے مجھ سے زیادہ ان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا وہ ہم سے بھی زیادہ محتاط تھے۔"

"پھر آپ نے چوہدری صاحب کو کیسا انسان پایا؟" کرن نے ایک بار پھر متجسس انداز میں پوچھا۔

"پایا ویایا کچھ نہیں بیٹا، یہ تو محض کاغذی نکاح تھا میری حویلی اور انا بچ گئی، چوہدری کی ضد پوری ہو گئی، اسی حویلی کی دہلیز پر کھڑے ہو کر میں مسکرا کر انہیں خوش آمدید کہہ رہی تھی، بس اتنی سی بات کے پیچھے تو سارا کھکھیڑ پھیلایا گیا۔"

"پھر آپ نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کبھی، کس کی انا بڑی تھی، آپ کی یا چوہدری مقصود کی۔"

"وہ یقیناً اپنی فتح کے نشے میں مخمور ہونے کے حق دار تھے۔"

"کیا بعد میں بھی وہ اس نکاح کو محض کاغذی کارروائی گردانتے رہے؟"

"سو فیصد کیونکہ یہ شرط اس معاہدے میں لکھی گئی جو نکاح سے پہلے لکھا گیا تھا۔"

"اس معاہدے کی دیگر شرائط کیا تھیں؟"

"میں پبلک اور پبلسٹی دونوں سے دور رہوں گی، چوہدری مقصود کی ایک بڑی شرط تو یہ تھی۔"

"اس کے بعد ہی آپ یوں گمنام سی زندگی گزارنے لگیں۔"

"فوراً بعد نہیں کچھ عرصے کے بعد سے، دراصل اس واقعے کا دل پر اثر اتنا ہوا کہ ہر چیز سے خود ہی جی اچاٹ ہونے لگا۔"

"پھر اس نکاح کی حیثیت کیا ہوئی، چوہدری مقصود سے آپ کا یہ نکاح کیا اب تک قائم ہے ان سے آپ کے بچے نہیں ہوئے کیا؟" کرن نے یکے بعد دیگرے کئی سوال داغ دیے۔

"نکاح کی حیثیت رکھی یا کاغذی سمجھو، یہ نکاح اب تک قائم ہے جب ازدواجی تعلق ہی استوار نہیں ہوئے تو بچوں کا کیا سوال، نکاح کاغذی تھا کاغذی ہی رہا۔" مہ پارہ بیگم نے اسے ترتیب سے جواب دیے۔

"اور چوہدری مقصود، انہوں نے کس سے شادی کی اس کے بعد، ان کے بچے وغیرہ یہ محض نکاح اب تک قائم کیسے ہے؟"

"یہ گورکھ دھندا تو مجھ پر بھی اب تک نہیں کھلا بیٹی، چوہدری مقصود نے اب تک کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں، دنیا جانتی ہے کہ ان کے دو بیٹے ہیں، دونوں بیٹے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ چوہدری مقصود کے بیٹے ہیں مگر....." مہ پارہ بیگم کی بات کو سنتی نے آ کر کاٹ دیا۔

"وہ لڑکا آیا ہے بیگم صاحبہ جو آپ سے ستار بجانا سیکھنے کے لیے آیا کرتا ہے، ملاقات کرنا چاہتا ہے۔" اس نے اطلاع دی۔

"ارے ہاں، اس سے تو ضرور ملنا ہے۔" مہ پارہ بیگم نے کہا "بلاؤ اسے، بٹھاؤ مہمان خانے میں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ "آؤ کرن اس بچے سے ملتے ہیں اور اس کے کان بھی کھینچتے ہیں۔"

.....

"اب تو نند صاحبہ کے دماغ ہی نہیں ملتے پہلے کیسا من من کر کے بولتی تھیں بات بے بات خوشامد اور چاپلوسی، بھائیوں اور ان کے بچوں کی طرف روزانہ تحائف روانہ کیے جاتے تھے اور اب مہینوں شکل ہی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ دیکھنا ہو تو ٹی وی پر دیکھ لو۔" یہ سمعیہ سلطانہ کی بھابی تھیں جو اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد چھت پر دھوپ سینکتے ہوئے اپنی دیورانی سے مخاطب تھیں۔

''اس وقت مصلحت اسی میں تھی کہ بھائیوں کی خوشامد کی جائے، بھائی ایک دفعہ اڑ جاتے تو سمعیہ سلطانہ کی کیا مجال تھی کہ یوں سج بن کر ڈراموں میں کام کرنے چل پڑتی، ادھر بھائیوں نے ٹھنڈا ہو کر صورتِ حال کو قبول کر لیا ادھر سمعیہ سلطانہ نے منہ موڑ لیا کیونکہ اب وہ جس جگہ پہنچ چکی ہے وہاں سے واپس لانا اس کے بھائیوں کے بس کا روگ نہیں رہا، ویسے بھی ہمیں کیا فرق پڑتا ہے بڑی بھابی ہماری تو اپنی جان چھوٹی مائی بابے سے۔'' چھوٹی بھابی کینو چھیلتے ہوئے بولیں۔

''ہم چاہتے بھی تو یہی تھے اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔'' بڑی بھابی نے کینو کی پھانک منہ میں رکھتے ہوئے کہا'' لیکن اب کبھی کبھی سمعیہ اور مائی بابے کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر خیال آتا ہے کہ کیا تھا جو وہ اس ٹھاٹھ میں ہمیں بھی شامل کر لیتی۔ بچے پھپھو، پھپھو کرتے ہیں اور مخترمہ کا مزاج ہی نہیں ملتا۔ اماں کی شان دیکھی تم نے جو یہاں اتوار بازاروں میں سستے کاٹن کے کٹ پیس ڈھونڈھتی پھرتی تھیں اب ایک مہنگا ترین امپورٹڈ کپڑا اوڑھے پہنے رہتی ہیں۔ اچھا کھاتی پیتی ہیں اور ہم سب کو یوں دیکھتی ہیں جیسے ہم کوئی کیڑے مکوڑے ہیں۔''

''غیرت اور شرم گھول کر پی لی جائے تو بھی فخر کرنے لگتے ہیں لوگ، بیٹی، روز کسی نئے مرد کی بیوی، گرل فرینڈ، محبوبہ بنی ہوئی ہے اس ڈرامے میں دیکھا نہیں تھا کیسے اس شخص کی بیوی بنی ایک ہی بیڈ پر لیٹی پڑی تھی اس کے ساتھ۔ اشتہاروں میں ناچ رہی ہوتی ہے غیر مردوں کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر، رسالوں پر تصویریں بھی ہوتی ہیں اس کی، ایک شانے پر باریک سی پٹی چڑھائے دوسرا اس سے بھی عاری اور رسالوں میں لکھا ہوتا ہے صرف حسن ہی نہیں بہت سیکسی لگس ہیں سمعیہ سلطانہ کے۔'' چھوٹی بھابی نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''یہ کیا ہوتے ہیں سیکسی لگسڈ'' بڑی بھابی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''بس کچھ نہ ہی پوچھیں تو بلا ہے، ہمیں تو اب اس سے اپنا تعلق بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، ادھر محلے میں نکلو بازاروں میں جاؤ ہر طرف اس کی تصویروں والے اشتہار چپکے ہوتے ہیں، لوگ پوچھتے پھرتے ہیں'' کیا حال ہیں آپ کی نند کا باجی کا؟'' بڑی شرم آتی ہے اس وقت جب آنکھوں کے سامنے وہ سیکسی لگس والے اشتہار ناچتے ہیں۔'' چھوٹی بھابی خاصی جلی بھنی ہوئی تھیں سو اُن کے لہجے میں تنفر جھلک رہا تھا۔

''ہمارا تو بھائی دامن صاف ہے۔'' بڑی بھابی نے مطمئن سے انداز میں کہا۔'' ہم تو لوگوں کو صاف بتا سکتے ہیں کہ ہم ان گناہوں کے شریک نہیں اگر ہم بھی ایسے ہوتے تو آج ان کے ساتھ

بیٹھے عیش کر رہے ہوتے، ہماری تو صاف ستھری، سادہ سی زندگی ہے۔''

''یہ اور بات ہے کہ سمعیہ کی دونوں بہنیں اس نئی صورتِ حال پر بڑی خوش ہیں، والدہ صاحبہ دونوں بیٹیوں کی طرف نت نئے رنگ برنگ تحائف روانہ کرتی رہتی ہیں، ابھی جب سمعیہ واپس آئی تھی باہر سے تو دیکھا تھا کیسے بڑے بڑے بیگ پہنچے تھے دونوں آپاؤں کے گھر۔'' چھوٹی بھابی کو ایک اور بات یاد آ گئی۔

''وہ کیوں خوش نہ ہوں گی، تحائف کی ایک رہی کمر اخالی کرا دیا بہن کو سمعیہ نے اس لڑکے سے کیا نام ہے اس کا.....؟''

''حسن۔'' چھوٹی بھابی نے یاد دلایا۔'' اس کے ساتھ تو سمجھو میاں بیوی والا رشتہ ہی پکا ہو گیا سمعیہ بی بی کا۔''

''مگر شادی نہیں کریں گی اس سے یہ لکھوا لو تم، شادی کے بعد مانگ ہی ختم ہو جاتی ہے اداکاراؤں کی پھر انہیں کام کہاں ملتا ہے۔'' بڑی بھابی نے اپنی معلومات جھاڑیں۔

''کوئی حرج نہیں، سمعیہ بی بی پھر بھی ہر طرح سے فائدہ میں رہیں گی لڑکے کا ساتھ بھی رہے گا اور شادی کے جھنجٹ سے آزادی بھی ملی رہے گی سچ پوچھو تو اس گناہ اور بے شرمی کی زندگی سے تو موت اچھی، ساری برادری تھو تھو کر رہی ہے دونوں پر۔'' چھوٹی بھابی نے خود کو معصوم ثابت کرنے کے لیے سر پر ڈوپٹا اوڑھتے ہوئے کہا۔

''برادری کی بھی خوب کہی تم نے، جہاں کہیں کسی کو کام پڑا وہ ابا جان کے حضور حاضر ہو جاتا ہے پیچھے سے ہی تھو تھو کرتے ہیں منہ پر تو بڑی چاپلوسی کرتے ہیں۔''

''وہ تو ہم بھی کرتے ہیں۔'' چھوٹی بھابی نے صاف گوئی سے کام لیا'' اور اب دیکھو اتنی دیر سے ہم کیا کر رہے ہیں تھو تھو یا تھو کوڑی۔''

''کیا مطلب؟'' حسبِ معمول بڑی بھابی کو خاک سمجھ میں نہیں آیا۔

''نہ سمجھیں تو ہی بھلا ہے۔'' چھوٹی بھابی نے مسکرا کر بولی۔'' بس جیسے چل رہا ہے چلنے دیں تیل دیکھیں تیل کی دھار دیکھیں۔''

.....o.....

''کہو میاں، کیسے غائب ہو تم، معلوم ہوتا ہے کہ ستار کے تاروں نے چند ہی دنوں میں انگلیاں کاٹ ڈالیں، کہاں ہوا تمہارا شوق؟'' مہ پارہ بیگم نے فیضان کو سلام دعا کے بعد چھیڑتے

ہوئے پوچھا۔

''سیکھنے کے معاملے میں غیر مستقل مزاج تو خیر میں ہرگز نہیں ہوں، بس کچھ مجبوری ہی ایسی آن پڑی تھی کہ میں اپنی یہاں آمد کو جاری نہ رکھ سکا گو ستار کے تار بہت یاد آتے رہے اتنے دن۔'' فیضان نے انہی کے سے لہجے میں انتہائی مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

''یاد کیا آتے رہے، اب تک تو بھول بھال بھی چکے ہو گے وہ جو چار دن سیکھا تھا تم نے۔'' مہ پارہ بیگم کو اتنا مسرور کرن نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ حیرانی کے عالم میں ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''قطعی نہیں۔'' فیضان نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا ''میں نے اپنے لیے ایک ستار خرید لیا ہے جب بھی موقع ملتا ہے اس پر مشق کرتا ہوں، کہیں تو ابھی ان چند اسباق کا مظاہرہ کر دوں جو آپ نے مجھے دیے تھے۔''

''پھر فرار کہاں ہو گئے تھے؟'' مہ پارہ بیگم اس کے اس جواب سے خوش ہو کر بولیں۔

''کہیں بھی نہیں، یہیں تھا اسی شہر میں، بس ایک الجھن میں پڑ گیا تھا اسے سلجھاتے سلجھاتے ہی اتنے دن گزر گئے۔''

''کہو پھر سلجھ گئی الجھن؟'' مہ پارہ بیگم نے خشک میوے کی ٹرے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مکمل طور پر نہیں اور آج میں آپ کے پاس حاضر بھی اسی سلسلے میں ہوا ہوں۔'' فیضان نے ٹرے میں سے چند کاجو اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے پاس اس سلسلے میں.....'' مہ پارہ بیگم کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں۔'' فیضان نے نظر اٹھا کر کرن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ میری الجھن کا ایک سرا آپ کی اس حویلی میں بھی اٹکا ہے میں وہ سرا پکڑنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ۔'' کرن نے دل میں سوچا ''ایک اور جھوٹی کہانی سنائی دے گی اب۔''

''یہ حویلی کوئی ایسا بڑا گورکھ دھندا بھی نہیں میاں کہ اس میں اتنے سارے سرے اٹک جائیں جتنے اٹکا دیے گئے ہیں۔ بہرحال اب یہ قصے نکال ہی پڑے ہیں تو تم بھی سناؤ کہ تمہاری کون سی الجھن کا راستہ ادھر کو آتا ہے۔'' مہ پارہ بیگم کا چہرہ یکدم افسردہ ہو گیا تھا۔

''کتنی مسرور نظر آ رہی تھیں چند لمحے پہلے تک اور اب کتنی افسردہ ہو گئیں ان بیچاری کو بھی

خوب مصیبت اٹھانا پڑ رہی ہے ہم لوگوں کی وجہ سے۔'' کرن کا دل بجھ سا گیا۔

''کیا میں کہہ دوں؟'' فیضان نے دوبارہ ایک نظر کرن پر ڈالی۔

''یہ بچی میری اپنی بیٹی کی طرح ہے اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو اسے میں اتنا ہی چاہتی جتنا اس کو چاہتی ہوں اور پھر اب تو یہ میری محرم راز ہے اس کے سامنے ہی بات کرو اور بلا جھجک کرو، ہم جو الف لیلہ ایک دوسرے کو سن سنا رہے ہیں آج کل شاید اس کے کسی باب کا ہی پیرا گراف ہو تمہارا قصہ۔'' مہ پارہ بیگم نے کرن کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر ہاتھ سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرا نام محمد فیضان گورائیہ ہے جی، میں چوہدری مقصود احمد گورائیہ کا بڑا بیٹا ہوں شاید میرے اس مکمل تعارف میں ہی آپ کو میری الجھن کا کوئی سرا نظر آ جائے، آج کل اخبار اور رسالے جس سیاستدان سے آپ کے تعلق کا ذکر کر رہے ہیں وہ شاید نہیں یقیناً میرے والد ہیں۔ میرے والد نے آج تک ہمیں ہماری والدہ کے متعلق کچھ نہیں بتایا اور یقین جانیے کہ انہیں مرا ہوا سمجھ کر ہمارے ذہنوں میں بھی کبھی ان کے متعلق استفسار کرنے کا خیال نہیں آیا مگر اب جو یہ نت نئے قصے پڑھنے اور سننے کو مل رہے ہیں اور میرے چھوٹے بھائی سلمان کی ذہنی علالت کے متعلق آپ کی تشویش اور ڈاکٹر عبدالصبور سے رابطے کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے اس سب نے مجھے ایک عجیب ذہنی انتشار کا شکار کر دیا ہے۔ اپنی شناخت کے بارے میں مجھے تشکیک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ نت نئے سوال میرا ذہن اٹھاتا ہے جن کا جواب مجھے کہیں سے بھی نہیں مل پاتا۔ میں آپ کے سامنے آنے سے اس لیے بھی ہچکچا رہا کہ میں آپ کا سامنا کرنے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتا تھا۔ آپ ممکن ہے میری ذہنی حالت کا اندازہ کر سکیں میں نے خود کو اتنا کمزور، تنہا اور الجھا ہوا پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔'' فیضان کی بات محویت سے سنتے سنتے کرن نے مہ پارہ بیگم کی طرف دیکھا جن کا چہرہ سفید اور ستا ہوا لگنے لگا تھا۔ فیضان کی بات سننے کے بعد وہ کتنی دیر ہی خاموش رہی تھیں، یوں جیسے کچھ بولنے کی ہمت جمع کر رہی ہوں ایک طویل وقفے کے بعد انہوں نے ایک بے بس سی مسکراہٹ کے ساتھ کرن کی طرف دیکھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اس قصے کے کئی کردار تمہیں اسی معاشرے میں ملیں گے، جن سے مل کر تمہیں میرے الفاظ کی سچائی کا یقین آ جائے گا اور دیکھو یہ ایک کردار خود چل کر تمہارے پاس آن پہنچا ہے، کیا تم بوجھ سکتی ہو کہ یہ کون ہے؟''

''آپ کی مہر و خالہ کا نواسا، جسے وہ مہرہ بنا کر چوہدری مقصود کو بلیک میل کرنا چاہتی تھیں۔''

کرن نے فوری جواب دیا۔

''دوست پہچانا تم نے بدقسمت شنو کے اس بیٹے کو چوہدری مقصود اپنے ساتھ لے گئے تھے کیونکہ اس کو ہمارے ماحول میں رکھنا ان کو گوارا نہ تھا۔ چاہتے تو شنو کے دعوے کو مسترد بھی کر سکتے تھے مگر نہیں کیا کیونکہ جانتے تھے کہ دعویٰ غلط نہیں تھا یہ ان کا اپنا خون تھا کیسے گوارا کرتے کہ سر کی دنیا میں پرورش پائے۔'' مہ پارہ بیگم نے آنکھوں میں آئے پانی کو ٹشو پیپر سے خشک کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اس نوجوان کو انہوں نے کیوں نہیں بتایا کہ یہ کون ہے اور ان کا اس سے کیا رشتہ ہے؟'' کرن نے حیرت سے کہا۔

''ابھی میں تمہیں یہ بات بتانے ہی والی تھی کہ چوہدری مقصود کی شخصیت میں ایک عجیب سا اسرار ہے وہ بظاہر ایک روایتی وڈیرا نما سا ستدان ہیں مگر ان کی ذاتی زندگی اس مخصوص وڈیرا زمین ٹائپ زندگیوں سے قطعی مختلف ہے، ان کی جس ضد کے نتیجے میں یہ حویلی میرے نام ہوئی اس کا احوال تو میں تمہیں سنا ہی چکی ہوں، نکاح ہو جانے کے باوجود اپنے وعدے پر عمر بھر قائم رہنا کہ یہ محض کاغذی نکاح ہوگا، ان کی شخصیت کے ایک اور پہلو کو روشن کرتا ہے وہ چاہتے تو زور اور زبردستی دونوں کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس تعلق کو اتنے برس مخفی رکھنے میں بھی ان کا کمال ہے یہ نوجوان جو خود کو ان کا بیٹا سمجھتا رہا اس کو یہ بات باور کرائے رکھنے میں وہ اب تک کامیاب رہے یہ بھی کمال کی بات ہے، عزیز، دوست، برادری، معاشرہ سب ہی بہت سے سوال اٹھاتے ہیں، ان سوالوں کو فیس کرنا، یہ بھی ان کا ہی کمال ہے۔ چوہدری مقصود کا خواہ بقول لوگوں کے بہت سی عورتوں سے تعلق ہو، ان کا اب تک شادی نہ کرنا بھی تعجب خیز بات ہے۔'' مہ پارہ بیگم اپنی رو میں کرن سے اپنی گفتگو کا تسلسل برقرار رکھ رہی تھیں اور غالباً بھول گئی تھیں کہ ان کے مہمان کے دل کے احوال ان کی گفتگو سے مزید بگڑ رہے تھے۔

''آپ یہ سب کیا کہہ رہی ہیں، میں چوہدری مقصود کا بیٹا نہیں ہوں اور ان کا خون بھی ہوں، یہ دونوں باتیں بیک وقت کیسے ہو سکتی ہیں، میں ہوں کون، میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا اور اگر سلمان بھی ان کا بیٹا نہیں ہے تو پھر آپ کون ہیں؟'' فیضان ایک دم چلا کر بولا تھا اور اس کے چلانے پر مہ پارہ بیگم اور کرن دونوں ہی چونک گئی تھیں۔ فیضان کا اضطراب اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

''سلمان۔'' مہ پارہ بیگم گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔'' نکاح کے بعد یہ حویلی باقاعدہ

میرے نام ہوگئی، چوہدری مقصود نے محکمہ اوقات کے افسروں سے کوئی چکر چلا کر اسے خرید لیا اور اسے میرے نام منتقل کر دیا یہ سب کام بالا ہی بالا ہوئے اور ہم ایک دن کے لیے بھی حویلی سے بے دخل نہیں ہوئے۔ یوں سب کہانی عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہی۔ نکاح کے بعد یہ ضرور ہونے لگا کہ چوہدری مقصود کبھی کبھار لاہور آنے پر ادھر ٹھہرنے لگے۔ باہر کا مہمان خانہ ان کے لیے مخصوص ہو گیا۔ اکثر وہ رات کے اندھیرے میں آتے تھے اور آنے کے بعد ان کا ایک ہی تقاضا ہوتا تھا وہی گیت سنانے کی فرمائش۔ چوہدری مقصود ایک بالواسطہ خیر خواہ تھے ورنہ حویلی کی ملکیت کی بابت بعد میں آنے والے دقتوں میں شاید پہلے سے بھی زیادہ شدت سے سوال اٹھائے جاتے۔ سو مہرو خالہ اور استاد صاحبان کی نصیحت پر میں یہ گیت ان کو ان کی ہر بار آمد پر ضرور سنایا کرتی تھی۔ یہ شاید ان کی انا کی تسکین کے لیے کافی تھا۔ میں نے حسب وعدہ پریس، پبلک اور پبلسٹی سے رفتہ رفتہ کنارہ کشی شروع کر دی کچھ اس میں ہاتھ وقت کے بدلتے تقاضوں کا بھی تھا جن پر میں پورا اترنے سے قاصر تھی، میرے لیے ایک چوہدری مقصود والا سبق ہی کافی تھا، میں کسی اور ابن الوقت کی کاسہ لیسی کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی جبکہ وقت کا تقاضا شاید ہر دور میں یہی رہا تھا مجھ سے کہیں بعد میں آنے والی گلوکارائیں جن کا فن ابھی کم سنی کے دور میں تھا رفتہ رفتہ اوپر آنے لگیں اور میرا نام گم ہونے لگا۔

''یہ انہی دنوں کی بات ہے جب ایک صبح ایک بچہ بالکل شیر خوار حویلی کے دروازے پر مہری بادشاہ کو ملا۔ سخت جاڑے کے دن تھے اور مہر دخالہ شدید علیل تھیں۔ کوئی دم جاتا تھا کہ ان کی جان نکلنے والا حال تھا۔ ہم اس بچے کی آمد پر حیران پریشان تھے اور سوچ رہے تھے کہ اس کے بارے میں پولیس میں رپورٹ کرائیں کہ جامع مسجد مولوی صاحب کے حوالے کر آئیں جب بے قرار مہر دخالہ نے پٹ سے آنکھیں کھول کر کہا۔

''میری جان کا صدقہ اس بچے کو سینے سے لگا لے پارو، مجھے اس صدقے کے عوض کچھ سکون مل جائے شاید.....''

''دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا، میں ایک اور مصیبت گلے میں ڈال لوں آپ کے کہنے پر، چپ کر کے پڑی رہیں۔'' میں نے بھنا کر جواب دیا۔

''یہ ان دلی والی بیبیوں کا عقیدہ ہے، ایک جان جانے والی ہوتی ہے تو ایک جان آ جاتی ہے، آنے والی جان کے صدقے جانے والی جان پر سکون ہو جاتی ہے تم دیکھو کیسا ان کی جانگی خاطر

قدرت نے سامان کرتے ہوئے کہا۔

''لغو ہیں یہ سب احمقانہ عقیدے۔'' میں نے سر جھٹک کر کہا اور اپنے ایک شناسا سے قریبی تھانے کا فون نمبر پوچھنے لگی۔

''مت کر پارو، مت کر۔'' عقب سے مہرو خالہ نے فریاد کی ''تجھ سے تو وہ چوہدری اچھا تھا کیسا اس نے شنو کلموہی کی اولاد کو سینے سے لگایا تو اتنا غرور کرتی کس بات پر ہے، اس جان، اس شکل صورت، اس فنکاری، اس ٹھاٹھ باٹھ کا انجام تو یہی ہے ناجو میرا ہونے جا رہا ہے۔ کبھی بڑا نام تھا دلی والی مہر خان کا۔ دیکھ بنجارہ لاد چلا، سب ٹھاٹھ یہیں کا یہیں رہنے والا ہے یہ معصوم جان جو تیرے دروازے پر پڑی ملی ہے، خدا جانے کس بدنصیب کے جگر کا ٹکڑا ہے تو دیکھ، تیری اجاڑ زندگی اور بے آباد کوکھ ہونے سے رہی۔ اس معصوم پر رحم کر خدا تیری زندگی میں بھی سکون اور خوشیاں بھر دے گا۔''

''غرض مہرو خالہ نے زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ کچھ ایسے الفاظ میں کھینچا کہ میں نے تصور ہی میں خود کو بستر مرگ پر دیکھ لیا جس پر وہ پڑی تھیں۔ میں خوف سے کانپ گئی اور میرا دل بیٹھ گیا، میں نے مہری بادشاہ کی گودے سے بچہ لے لیا ''سبحان اللہ'' بچے کی شکل دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے نکلا کیا پیاری شکل پائی تھی کیسا پیارا رنگ اور نقش، بچہ رو رہا تھا میں نے مہرو خالہ کے قریب رکھی شہد کی پیالی میں انگلی ڈبو کر بچے کے منہ میں ڈالی وہ جسر جسر شہد چاٹنے لگا۔

''خدا امتا کا احساس عطا کرے۔'' مہرو خالہ نے اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا۔ دو دن بعد مہرو خالہ کا انتقال ہو گیا۔ ماں کے بعد ماں جیسی شفقت عطا کرنے والی مہرو خالہ کے دنیا سے چلے جانے نے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ میری ہمدم، میری رفیق، غم خوار، دمساز، قدم قدم پر دعائیں، مشورے اور نصیحت کرنے والی مہرو خالہ کے چلے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے کیا گنوا دیا ہے۔ کئی دن ماتمی کیفیت میں گزر دیے نہ کھانے پینے کا ہوش رہا نہ پہننے اوڑھنے کا پھر وہی ہمدرد اور غم گسار استاد صاحبان سامنے آئے۔

''کب تک اس سوگ میں دن گزارو گی بیٹا، جینا تو جب تک ہے ہی جب تک زندگی ہے۔ زندگی ہے تو زندگی کا سامان بھی کرنا ہوگا، سو مردہ دلی سے نکلو اور زندوں کی طرف دھیان کرو۔''

''اس وقت میں صرف نجی محفلوں میں گاتی تھی یقیناً میرے اردگرد رہنے والوں کو اپنے پیٹ اور گزر اوقات کی فکر تھی سو ٹھیک ہی انہوں نے مجھے اس ماتمی کیفیت سے نکالا۔ بہت دن پیچھے نہا دھو

کر کپڑے بدلے، کھانا کھایا تو اس معصوم بچے کا خیال آیا جسے شہد چٹا کر گھٹی دے چکی تھی، معلوم ہوا کہ اتنے دن اسے مہری بادشاہ ہی سنبھال رہی تھی۔ جھٹ بلا کر اسے گود لیا اس کی شکل دیکھتے ہی مہرو خالہ کی آخری گفتگو یاد آ گئی۔ دکھیا تجربہ کار تھیں، جانتی تھیں کہ ان کے جانے کے بعد زندگی کو جینے کا کچھ سامان ضرور درکار ہوگا، اسی لیے اصرار کر کے وہ بچہ گود لینے کا کہا میں نے خود ہی یہ بات فرض کر لی اور پھر خود کو بچے کی دیکھ بھال میں مشغول کر لیا، میں اس کی ماں نہیں تھی، نہ ہی ماں بن سکتی تھی، ماں تو کیا کسی کی بیوی ہوتے ہوئے بھی میں بیوی نہیں بن سکی تھی۔ اپنی افراد یت اور مزاج پر اتنا غرور تھا کہ فطری رشتوں کی حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ نکاح سے پہلے بھی باقاعدہ تحریری معاہدے کے تحت نکاح کو کاغذی اور رسمی قرار دلوا کر چوہدری مقصود کے دستخط لے لیے۔ اب ایسے گھمنڈ پر اپنا انجام کیا ہونے والا تھا۔ بچے کی پرورش کر کے اپنے تئیں مغفرت کا سامان کرنے کا ارادہ باندھا کچھ ہفتے تو بڑی جی جان سے بچے کی خدمت کی، بڑے شوق سے اس کا نام سلمان رکھا پھر اس کے برتھ سرٹیفکیٹ بنوانے کا خیال آنے پر سوچا کہ سرٹیفکیٹ میں اس کے کوائف کیا درج کرواؤں گی۔

''چوہدری مقصود سے پوچھے بغیر والدیت کے خانے میں ان کا نام لکھوا دیا بعد میں ان سے ذکر کیا تو وہ مسکرا دیے۔ جب چند ہفتوں کے دن رات کی دیکھ بھال کے بعد ممتا کا جوش قدرے کم ہوا تو خیال آیا کہ یہ تو ایک مشکل کام ہے اور اس کے پیچھے میں اپنے فن سے دور ہوتی جا رہی ہوں۔ محفلوں میں گانے کے لیے ریاض کی ضرورت ہوتی ہے جو اس عرصے میں بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ سو بادشاہ کو بلا کر بچہ اس کے حوالے کیا۔

''لو بی بی تم پالو اس کو اس کی ضرورت کا انتظام میں کروں گی۔'' وہ مرحومہ اللہ بخشے بہت سیانی تھیں اور اتنے دن سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی بولی۔

''بی بی چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہے اگر کچھ کہوں تو برا مت مانیے گا۔'' میں نے کہا۔

''کہو۔'' وہ بولی۔

''بی بی، بچے سے پیار خدا نے آپ کے دل میں ڈالا ہے کہ یونہی اوپر کا دکھاوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''سچ پوچھو تو اس بات کا جواب وثوق سے نہیں دے سکتی۔'' وہ بولی۔

''اگر اس کوئی انسیت محسوس ہوتی ہے تو ایک کام کیجیے۔'' میں نے کہا۔

"وہ کیا؟" تو کہنے لگی۔

"جیسے شنو کا بچہ چوہدری کے حوالے کیا ہے اسے بھی ان کو دے دیجئے۔ ہمارا پیشہ ایسا ہے کہ پسندیدگی اور واہ واہ کے ڈونگروں کے باوجود اسے عزت کی نظر سے کوئی نہیں دیکھتا، یہ دلی یا لکھنو نہیں، یہ پنجاب ہے وہ بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پنجاب یہاں یہ گانا بجانا میراثیوں اور ڈومینوں کا کام ہی گردانا جاتا ہے، آپ بھلے کتنی ہی نامور ٹنکارہ بن جایے، یہ بچہ بڑا ہو کر ایک مخصوص طبقے میں ہی عزت پائے گا اور آپ کے حوالے سے اسے سب ہی طرف سے سوالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ جس نکاح کو آپ چھپائے بیٹھی ہیں کیا اس کے ثبوت میں اسے پیش کریں گی اگر نہیں تو پھر کیا یہ خود بڑا ہو کر آپ سے نہیں پوچھے گا کہ آپ کون ہیں اور یہ کون ہے، اس کا باپ کون ہے۔ اب بات اور ہے کل کلاں کو چوہدری مقصود کے مزاج کا کیا پتا آج ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھے جانے پر مسکرا دیے کل کیا پتا برہم ہو جائیں یہ بچہ کہیں کا نہیں رہے گا بہتر ہے کہ اسے ان کے حوالے کر دیں اگر وہ مان جائیں تو...... ہم جیسی بچیوں کو پال کر خوش رہتی ہیں لڑکے ہمارے لیے مشکلات ہی کھڑی کرتے ہیں، ہاں اگر اسے مستقبل کا طبلچی یا استاد بنانا مقصود ہو تو اور بات ہے۔"

"بچے کے حوالے سے کھڑے کیے میرے خیالی محل آنِ واحد میں دھڑام سے نیچے گر گئے۔ میں زندگی کی جس اسٹیج پر تھی وہاں سے ایک قدم ادھر اُدھر جانا ممکن نہ تھا، چوہدری مقصود کو میں پاتے ہوئے بھی نہیں پا سکی تھی، لکھنو کی بی بی ہوتے ہوئے پنجابی کی بیوی بن جانے کا خیال ہی میرے لیے بڑا تکلیف دہ تھا پھر وہ بچہ جسے اگر میں اپنا متبنیٰ بھی قرار دیتی تو بڑا ہو کر اپنی شناخت مانگتا میں اس کو کیا شناخت دے سکتی تھی۔ شنو کا بچہ تو چوہدری مقصود کا خون تھا اسے اس نے سینے سے لگا لیا یہ بچہ کون تھا جسے کل وہ اپنی شناخت دے سکتا تھا خاصے غور و خوض کے بعد میں نے چوہدری مقصود سے بات کرنے کی ٹھانی نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ میری درخواست کو رد نہیں کریں گے۔ ان سے بات کی تو پہلے مسکرا دیے اور پھر سنجیدہ ہو کر بولے۔

"آپ بے حد غیر مستقل مزاج ہیں مہ پارہ بیگم، ایک گیت سنانے سے انکار کر کے اس انکار پر قائم نہ رہ سکیں۔ نکاح بھی کر لیا اور گیت بھی سنا دیا۔ اب اس بچے کو گود لینے کا عہد کر کے بھی اس کو گدے سے اتارنے کو بے قرار ہیں۔"

"آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟" میں نے اپنے بگڑتے مزاج کو قابو کرتے

ہوئے کہا" آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"ز

"یا تو میں انکار نہ کرتا، نہ ہی کوئی عہد باندھتا مگر جب ایسا کر چکتا تو پھر مر جاتا اس سے نہ پھرتا۔" وہ بولے۔

"آپ کا کیا خیال ہے، مجھے مر جانا چاہیے؟" میں نے تنتنا کر کہا۔

"ارے نہیں، مریں آپ کے دشمن میں نے تو اپنے مزاج کی بات کی ہے میں یا تو کوئی عہد کرتا نہیں، کر لوں تو توڑتا نہیں۔"

"اس بچے کے سلسلے میں ارشاد فرمایئے۔" میں نے بے صبری سے کہا۔

"آپ میرے بارے میں، میرے خاندانی نظام کے بارے میں، میرے مسائل کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں پھر یہ بچہ میرے حوالے کرنے کی خواہش مند کیوں ہیں۔"

"اس لیے کہ آپ کی فیاضی اور بڑے دل کی معترف ہوں، جانتی ہوں کہ آپ اس کو ایک نام اور ایک شناخت دے سکتے ہیں اس حویلی پر اور اس ناچیز پر آپ کے پہلے بھی احسان بہت ہیں، ایک احسان اس غریب کی درخواست پر کر دیجیے۔ اس بچے سے ایک گہرا دلی لگاؤ محسوس کرتی ہوں کیونکہ میری گود میں آنے والا یہ پہلا بچہ ہے مگر اس کے مستقبل سے ڈرتی ہوں۔ حویلی مہرد خان میں پرورش پانے والا بچہ لاکھ پارسا اور نیت کا صاف ہونے کا دعویٰ کرے اس کی بات کوئی نہیں مانے گا۔" میں نے نیاز مندانہ انداز میں کہا۔

"مگر آپ سے زیادہ پارسا اور نیک نیت خاتون میں نے کوئی اس شعبے میں نہیں دیکھی اب تک......" انہوں نے پہلی مرتبہ اعتراف کیا۔

"لاکھ نیک نیت اور پارسا ہوں گی آپ کے سوا نہ جانے کتنے لوگ ہوں گے جو نہ جانے کیا، کیا میرے بارے میں قیاس آرائی کرتے ہوں گے جبھی یہ درخواست کر رہی ہوں اس بچے کو یہاں سے لے جایئے اس کو دیکھ کر دل میں اس کی پرورش کی خواہش پیدا ہوئی تھی مگر پھر اپنی اوقات یاد آ گئی۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"اور اگر میں انکار کر دوں تو......"

"تو پھر اسے کسی یتیم خانے میں مجبوراً چھوڑ آنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"مہ پارہ بیگم۔" چوہدری صاحب ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے "سر کے رشتوں میں جڑی کوئی بھی شخصیت ہمارے خاندان میں پسندیدہ مقام حاصل نہیں کر سکتی کہ ہمیں بھی معاشرے میں

بقا کا لالچ ہے، اسی لیے میں خواہش کے باوجود آپ کو وہ مقام نہیں دے سکا جو دینا چاہتا تھا مگر خود سے یہ عہد کیا تھا کہ آپ نہیں تو کوئی اور بھی نہیں جس پر آج تک قائم ہوں۔ آپ کی پارسائی اور نیک نیتی پر مجھے کوئی شک نہیں اور اسی کی تحسین اور اسی کے خراج کے طور پر میں آپ کی خواہش پر اس بچے کو اپنی شناخت دینے کو تیار ہوں۔ دینا چوہدری مقصود کو چاہے کسی ڈھنگ سے یاد کرے آپ اپنے دل میں میری ذات کے کسی اچھے پہلو کا رنگ بھر کر میرے لیے دعائے خیر ضرور کیجئے گا۔'' یہاں پہنچ کر مہ پارہ بیگم کی آواز رندھ گئی اور کمرے میں ایک طویل خاموشی چھا گئی۔

''وہ سلمان تھا۔'' پھر مہ پارہ بیگم کی بھرائی ہوئی آواز ابھری'' جسے جنہوں نے اپنا بیٹا کہا اور مانا بھی۔ سلمان کے میرے دل میں آج بھی وہ ممتا ابھرتی ہے جو برسوں پہلے اسے گود لیتے ہوئے ابھری تھی، اسی ممتا سے مجبور ہو کر اس کے یوں بیمار پڑ جانے کا سن کر ڈاکٹر صبور کے پاس خفیہ طور پر جاتی رہی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہاں جانے کا راز بھی فاش ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو میرے سوا صرف چوہدری صاحب اور ڈاکٹر صبور کو معلوم تھا اور چوہدری مقصود کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ کبھی اس تعلق کے بارے میں زبان نہیں کھولیں گے، ڈاکٹر کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے اصولوں کا پکا آدمی ہے، اپنے کلائنٹس کے بارے میں کہیں بات نہیں کرتا پھر یہ بات کیسے کھلی؟'' انہوں نے فیضان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ششدر بیٹھا یہ سارے انکشافات سن رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دل اپنی مخصوص رفتار سے دھڑکنا چھوڑ رہا تھا اور اس کی تمام ہمتیں ختم ہو رہی تھیں۔ وہ بولنا چاہتا تھا مگر بول نہیں پا رہا تھا اپنی زندگی کے ہر کردار کے زاویے بگڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اپنے باپ کو کیسا انسان سمجھتا تھا اور درحقیقت کیا تھا، خود اپنے بارے میں کیا سمجھتا رہا اور حقیقت کیا تھی، سلمان کے متعلق رشک وحسد کا جو جذبہ کچھ دن پہلے سے اس کے دل میں سر اٹھا رہا تھا اس کی حقیقت جان کر اسے اس پر بھی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ڈاکٹر عبدالصبور کی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں جو انہوں نے سلمان کے پالنے کے متعلق اپنے اور سلمان کے متعلق کی تھیں وہ سمجھ چکے تھے وہ سب الجھے ہوئے تھے اور اپنے اپنے نفسیاتی عوارض سے شفایاب ہونے کے لیے انہیں ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ اسے یوں گنگ بیٹھا دیکھ کر مہ پارہ بیگم اور کرن نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''آپ نے اس پر یکدم ہی انکشافات کی بوچھاڑ کر دی، اس کا یہ عالم ہونا تو فطری ہے۔'' کرن نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''عورت ہوتی ہی جذباتی اور کم فہم ہے، خواہ کیسا ہی دانشمندی کا دعویٰ کر لے۔'' مہ پارہ بیگم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فیضان کے پاس جاتے ہوئے کہا اور اس کے قریب بیٹھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''میں بہت بری ہوں بیٹا، یوں تمہیں آن کی آن میں پریشان کر دیا تم اپنے خیال میں بہت کچھ تھے، میری باتیں سن کر خود کو کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہو گے مگر میں تمہیں بتاؤں تم کتنے خوش قسمت ہو۔'' انہوں نے فیضان کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا'' تم دلی والی مہرو جان کے نواسے اور شنو کے بیٹے ہی نہیں ہو تم چوہدری مقصود احمد گورائیہ کے بڑے چوہدری منظور کے بیٹے ہو اس بیوی سے جس سے انہوں نے خفیہ نکاح کیا مگر خاندانی دباؤ اور برادری کے نظام کے خوف سے اس کا اقرار نہ کر سکنے پر تمہیں تمہاری ماں کے پاس تنہا چھوڑ آئے، تم تو بہت خوش قسمت ہو بیٹا کہ جس کے لیے مواقع کا انتظام قدرت نے خوب کیا۔ تمہاری ماں شنو در بدر بھٹکتی پھرتی اور اپنی والدہ مہرو جان کے پاس نہ پہنچ پاتی اور اگر پہنچ بھی جاتی اور چوہدری مقصود کا اس حویلی میں آنا جانا نہ ہوتا تو تم سوچو آج تم کیا ہوتے اور یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ یہاں آتے بھی ہوتے مگر تمہیں قبول نہ کرتے انہیں اس امر سے انکار کیا مشکل تھا کہ تم ان کے بھائی کے بیٹے تھے۔ تمہارا جنونخیالی پس منظر ہے بیٹا وہ تو تمہیں کچھ بھی اچھا مستقبل نہیں دے سکتا۔ اب تم جس ماحول میں پلے بڑے ہو وہاں کے لوگ وقتی خوشی حاصل کرنے کو تو ادھر کا رخ کر سکتے ہیں مگر یہاں سے دائمی تعلق جوڑنا ان کے شان کے خلاف ہوتا ہے۔ میرے بچے۔ تمہیں تو قدرت نے ہاتھ دے کر ایک ناپسندیدہ ترین مستقبل سے بچایا ہے تمہیں رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے، تمہیں تو سرسنگیت کی آوازوں کے درمیان کے بجائے پاکیزہ گودوں میں پلنے کا موقع ملا ہے، یہ خدا کا بہت بڑا احسان ہے تم پر۔'' انہوں نے فیضان کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اس کی آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اٹس شاکنگ اینڈ ان بیریبل۔'' فیضان کے حلق سے بہ مشکل الفاظ نکلے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''جب ہی تو سیانے کہتے ہیں کہ کچھ حقیقتوں پر پردہ پڑا رہتا ہی بہتر ہوتا ہے، انسان کو ضرورت سے زیادہ دکھوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔'' کرن نے ان دونوں کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہا'' مگر انسان کا متجسس ذہن اسے چین سے کہاں بیٹھنے دے سکتا ہے میں اپنی زندگی، اپنے

اس آئیڈیا پر پچھتاتی رہوں گی جو آپ کے خاندان پر آرٹیکل لکھنے کی شکل میں میرے ذہن میں آیا تھا۔ اس آئیڈیے نے کتنی زندگیوں کو متاثر اور مضطرب کیا، مجھے اس کا اندازہ ہو نہیں سکتا تھا۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ کیوں آپ نے ایک عمر یوں گمنامی اور تنہائی میں گزار دی جبکہ موقع بھی تھے اور دعوت بھی۔''

''مجھے اس بات سے زیادہ کہ میں خود کو سمجھتا کیا تھا اور میں نکلا کیا اس بات پر رنج ہے کہ میں نے ایک عرصہ ابا کے بارے میں شک کرتے اور ان سے نفرت کرتے گزار دیا۔ انہوں نے شخصیت اور زندگی کو جس خول میں بند کر رکھا ہے وہ بے درد ہے، اس کے اندر نہ تو کوئی جھانک سکتا ہے، نہ ہی اس کو کھٹکھٹا سکتا ہے۔ آپ کو یہ سب اس لیے معلوم ہے کہ آپ نے یہ خوشی چڑھنے سے پہلے انہیں دیکھ رکھا ہے اور آپ ان کی زندگی میں ہونے والے ہر اہم واقعے کی چشم دید گواہ ہیں۔''

''یہ اتفاق کی بات ہے ورنہ وہ جتنی بند شخصیت کے مالک ہیں، میں نے بھی انہیں سالوں میں جانا ہے، پھر بھی شاید پورا نہیں جان سکی۔''

''آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اس دوسرے بچے سلمان کے بارے میں کچھ پتا چلایا نہیں کہ وہ کون تھا؟'' کرن نے کہا۔

''نہیں۔'' مہ پارہ بیگم نے سر ہلایا ''اس کے متعلق معلوم کیا جا سکتا تھا مگر میں نے دانستہ نہیں کیا، مہری بادشاہ نے اس کی یہاں آمد کے چار سال بعد بتایا کہ ایک شخص ایک بچے کی تلاش کرتا یہاں آیا تھا، اس نے بتایا کہ اس نے بیوی کو گھر سے نکال دیا تھا، بیوی میکے بیٹھی تھی اور بھائیوں پر اس کے چھ بچوں کا بوجھ پہلے ہی سے تھا پھر یہ بچہ ہوا تو وہ اسے غربت کے ڈر سے حویلی کی دہلیز پر رکھ گئی یہ سن کر حویلی والی بی بی بڑی دل والی خاتون ہیں۔ نیک اور نرم دل اس نے سوچا شاید بچے کو دیکھ کر اس کی پرورش کر لیں۔ بادشاہ مرحومہ نے بچے کے متعلق صاف انکار کر دیا اس شخص سے اور وہ یہ سمجھتا ہوا کہ بچے پر ہم لوگوں کی نظر پڑنے سے پہلے کوئی اور اسے اٹھا کر لے گیا یہاں سے رخصت ہو گیا۔

''انہوں نے یعنی بادشاہ نے ایسا کیوں کیا؟'' کرن نے پوچھا۔

''میں نے بھی اس سے یہی پوچھا تھا، بولی بی بی بچہ آپ کے پاس ہوتا تو اور بات تھی، چوہدری مقصود بچے کو آپ کے کہنے پر لے جا چکے ہیں اور اپنی برادری کے سامنے اسے اپنا بیٹا ظاہر کر چکے ہیں، برادری کے سوالوں کے سامنے انہوں نے اپنا آپ کھڑا کر رکھا ہے۔ ایک ایسا

شخص جو اتنے برسوں سے آپ کے مزاج کے تلوں کو سہتا چلا آ رہا ہے اسے مزید امتحان میں ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے سو یہ باب یوں بند ہوا۔''

''ہم اہم اور بڑی شخصیتوں کو دور سے دیکھتے ہیں اور ان کے متعلق کیا کیا قیاس کرتے ہیں۔'' کرن نے کہا ''انہی چوہدری مقصود کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ بڑی جلاد صفت شخصیت کے مالک ہیں اور اپنے سامنے سر اٹھانے والے کا سر کچل دینا خوب جانتے ہیں مگر آپ ان کی شخصیت کا جو پہلو دکھا رہی ہیں وہ اس کے قطعی متضاد ہے اور نا قابلِ یقین بھی۔ انسان کس پر یقین کرے اور کس پر نہ کرے۔''

''یہ حقیقت ہے کہ وہ بیک وقت دو بالکل متضاد شخصیتوں کے مالک ہیں، اپنے علاقے میں اپنے خاندان کا برسوں سے قائم تسلط برقرار رکھنے کی خاطر وہ جلاد صفت وڈیرے، سیاست کے تمام داؤ پیچ جاننے اور ہر طرح کی حکومت میں اقتدار میں رہنے والے سیاستدان، شعر و شعاری، ادب، فن، نازنینوں کی محفل کے دلدادہ زمینداران اور فیضان اور سلمان جیسے بچوں کے باپ جن کی ماؤں کے متعلق وہ آج تک خود بھی خاموش ہیں اور دوسروں کو بھی خاموش کرا رکھا ہے۔''

''انہوں نے ان بچوں کی پرورش میں کوئی کمی چھوڑی؟'' کرن نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ نہیں۔'' مہ پارہ بیگم نے فیضان کی طرف دیکھا ''بلکہ میرا اندازہ ہے کہ وہ فیضان سے زیادہ سلمان سے قریب ہیں۔''

''اس کو آپ کی ممتا جو حاصل ہے اور وہ آپ کی شخصیت کے مداح.....'' فیضان کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی طنز اور تلخی جھلک گئی۔

''وہ تم سے بھی اتنے ہی قریب ہیں اگر تم محسوس کرو تو.....'' مہ پارہ بیگم پہلی مرتبہ مسکرائیں ''تم ان کے بڑے بیٹے ہونے کی وجہ سے ان کی جانشینی کے اصولی طور پر حق دار تھے مگر وہ ایسا نہیں چاہتے، جانتے ہو کیوں؟'' فیضان نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیونکہ برسوں پہلے انہوں نے تمہاری نانی مہرو جان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہیں روایتی چوہدری یا وڈیرا نہیں بنائیں گے۔ مہرو خالہ دلی کی تہذیب کی ایک آخری نشانی تھیں، ان کے مزاج اور تربیت کا ایک الگ ہی انداز تھا، وہ پاکستان آ کر اور بالخصوص اس صوبے میں رہتے ہئے بہت خوش نہیں تھیں اور اس سلسلے میں خاصے تعصب کا شکار تھیں۔ انہوں نے ہی چوہدری صاحب سے درخواست کی تھی کہ شنو دکھیاری کا بچہ لیے جا رہے ہو مگر وعدہ کرو اسے اپنے جیسا نہ بناؤ گے۔''

چوہدری صاحب نے اپنا یہ وعدہ بھی پورا کیا اور تم پر اس نے مخصوص تہذیب اور انداز کی گرد نہیں پڑنے دی جو اُن کے علاقے کا خاصہ ہے، البتہ سلمان کے سلسلے میں وہ آزاد تھے۔"

"اتفاق کی بات ہے کہ اس کے سلسلے میں آزاد ہونے کے باوجود بھی وہ اسے اپنے جیسا نہ بنا سکے، سلمان کی حالیہ ذہنی کیفیت ان کی انہی کوششوں کا تو نتیجہ ہے۔" فیضان کے لہجے میں پھر طنز در آیا۔

"کچھ کیفیتیں جینز میں سرایت کر جاتی ہیں، پسند ناپسند، نفرت، محبت، اخلاقی خوبیاں اور برائیاں ماحول سے بھی ملتی ہیں مگر نسلوں کی جبلت میں شامل ہو کر بھی اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔ سلمان کی اس تہذیب اور وہاں کی مروجہ روایات اور انداز زندگی سے فرار کی وجہ بھی یہی ہے۔ یقیناً وہ کسی اور مزاج کے حامل والدین کی اولاد ہے۔ کیوں کرن میں ٹھیک کہہ رہی ہوں یا غلط تمہاری سائیکالوجی کیا کہتی ہے؟" مہ پارہ بیگم نے کہا۔

"یقیناً ایسا ہی ہے۔" کرن نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "میرا خیال ہے کہ جتنا وہ سلمان کو اس طرف دھکیلیں گے اتنا ہی وہ فرار حاصل کرنے کی کوشش کرے گا میں اس کی کیس ہسٹری تو نہیں جانتی مگر اندازہ کر سکتی ہوں۔"

"میں نے ابا کو یہ بات سمجھنے کی کوشش کی تھی، ڈاکٹر عبدالصبور بھی انہیں یہ سمجھا رہے ہیں مسلسل، ان کے بقول سلمان سے اس سلسلے میں زور زبردستی کے نتیجے میں ہم اسے کھو بھی سکتے ہیں مگر ابا کا خیال بالکل مختلف ہے۔"

"وہ ان باتوں کی مخالفت کرنے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی دوسری چوائس ہی نہیں وہ اپنی عہد پرستی اور انا کو بچانے کے لیے جیسی زندگی گزار چکے ہیں اس کے نتیجے میں ملنے والے آپشنز کو استعمال کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں۔" مہ پارہ بیگم نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ ابا نے ایسی زندگی کیوں گزاری، لاابالی پن، جذباتیت، عہد پرستی یہ سب ایک حد تک تو ٹھیک تھا مگر ان کے دل میں اپنے گھر، اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی خواہش کبھی نہیں ابھری ہوگی۔" فیضان نے کہا۔

"ضرور ابھری ہوگی کیونکہ یہ خواہشات فطری ہیں مگر بعض انسانوں کے لارجر دین لائف امیجز کبھی کبھار اتنا محدود کر دیتے ہیں اتنا مجبور کہ انہیں اپنی فطری خواہشات کو دبا کر زندگی گزارنی

پڑتی ہے۔ انہی فطری خواہشات کو دبانے کے لیے ہی تو انہیں اپنے اردگرد وہ خول چڑھانا پڑا جو بے در ہے اور جس کے اندر نہ جھانکا جا سکتا ہے نہ ہی اسے کھٹکھٹایا جا سکتا ہے۔" کرن نے جواب دیا۔

"تم بڑے ہو بیٹے اور سمجھ دار بھی۔" مہ پارہ بیگم نے فیضان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم سلمان کو اس زندگی سے بچا سکتے ہو جس سے اسے اب بچنا بہت ضروری ہے۔ چوہدری مقصود اور اور ہم اپنی زندگیاں غلط یا صحیح گزار چکے اب تم لوگوں کا وقت ہے اپنی جذباتیت اور حماقتوں کی بھینٹ تم لوگوں کو چڑھانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ سلمان، چوہدری مقصود کی تہذیب اور انداز زندگی سے خائف ہے اور وہ دونوں خون جس کا وہ تذکرہ کرتا ہے اس کے خوف کی علامت ہیں، اسے خوف کے اس حصار سے نکالنا تمہاری ذمے داری ہے، سگے بھائی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عرصے تک اسے اپنا سگا بھائی سمجھتے رہے ہو اس کی محبت تو ہوگی تمہارے دل میں وہاں اس کا سیٹ ہونا بہت مشکل ہے۔"

"میں ان تمام الجھنوں کو سلجھانے کے چکر میں پڑا ہی سلمان کی وجہ سے تھا۔" فیضان نے تھکے ہوئے انداز میں کہا "میں اسے کسی بھی قیمت پر اس ماحول سے بچانا چاہتا تھا، آپ تک بھی اسی لیے آیا تھا کہ شاید آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکیں مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ابا....." وہ کہتے کہتے رک گیا اور اس نے اپنا سر جھکا کر اپنے اٹھے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ کرن کو اس کی بیچارگی اور ذہنی کیفیت پر ترس آنے لگا۔ وہ ماں کی کھوج میں نکلا، باپ بھی گنوا بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کی ذہنی حالت کیا ہو سکتی تھی وہ خود مہ پارہ بیگم بلکہ کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ کمرے میں ایک طویل خاموشی اور گہری افسردگی چھائی ہوئی تھی اور دیوار گیر کلاک اپنی مخصوص ٹک ٹک کے ساتھ وقت گزرنے کا احساس دلا رہا تھا۔

.....

تم کہاں غائب رہتے ہو حسن، کئی کئی دن ملتے ہی نہیں۔' سمعیہ فون پر حسن کمال سے گلہ کر رہی تھی "جب سے ماریشس سے واپس پلٹے ہو تمہاری خبر ہی نہیں مل رہی۔"

"زندگی بہت مصروف اور وقت تیز رفتار ہوگئی ہے سمعیہ، دن گزر جانے کا پتا ہی نہیں چلتا، میں کل ہی اسلام آباد سے واپس آیا ہوں۔ ایک نیا روزنامہ شروع ہو رہا ہے اسلام آباد سے اس کی مینجمنٹ سے میٹنگ تھی میری اس لیے وہاں گیا ہوا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہارا موبائل بھی رسپانس نہیں دے رہا تھا۔'' سمعیہ نے مزید شکوہ کیا۔

''موبائل میں سم دوسری تھی دراصل میں تمہیں وہ نمبر دینا بھول گیا، کہو کوئی کام ہے کیا میں ایک اہم کام کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔'' حسن کے لہجے سے اہم کام کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔'' حسن کے لہجے سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جلدی میں تھا۔

''مجھے تم سے کیا کام ہو سکتا ہے بس تمہاری خیریت معلوم کرنا تھی اور بس.....'' سمعیہ کو نہ جانے کیوں حسن کے رویے سے دکھ ہوا۔

''اچھا، جب میں فارغ ہوں گا تو خود ہی تم سے بات کرلوں گا۔'' حسن نے جلدی میں کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

''ایک وقت وہ بھی تھا حسن کمال جب تم کہتے تھے میری کوئی سی خاص معروفیت ہوتی ہے، میں فارغ ہی رہتا ہوں جب کہو گی آجاؤں گا۔'' سمعیہ نے ہاتھ میں پکڑا فون نظروں کے سامنے کرتے ہوئے سوچا ''سچ ہے، سب انسانوں کی معروفیات ہی بہت بڑھ گئی ہیں، ہم میں سے کسی کے پاس وقت نہیں رہا، خود مجھے بھی تو شوٹنگ پر پہنچنا ہے، نہ جانے آج کا شیڈول کیا ہے، اس نے اپنی ڈائری کھولی اور دن بھر کی معروفیت اور اوقات کار چیک کرنے لگی۔ آج تو انٹرویو بھی کرنا ہے ماہنامہ صورت گر کے نمائندے نے۔'' اسے یاد آیا اور وہ دل ہی دل میں ممکنہ سوالات کے جواب سوچنے لگی۔

.....

''مجھے کچھ دنوں کے لیے ایکسکیوز کردو شازیہ، میں کچھ دن بعد تم سے بات کروں گا، پلیز برا مت مان جانا بات کچھ ایسی ہے کہ فی الحال میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتا مجھ پر یقین رکھنا میں تمہارے ساتھ اتنا ہی مخلص ہوں جتنا تم سمجھتی ہو، بس مجھے چند دن کی غیر حاضری کی اجازت دے دو، میں خود تم سے کانٹیکٹ کروں گا۔'' اپنی ڈیوٹی پر موجود شازیہ کے کانوں میں بار بار فیضان کے الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے فون پر کہے تھے۔

''شازیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے معلوم کرے کہ فیضان بہ خیریت تھا اور اسے کوئی بڑا مسئلہ درپیش نہیں تھا، اسی شام کلینک کا رخ ختم ہونے پر گھر جانے سے پہلے ڈاکٹر عبدالصبور نے اسے مطلع کیا تھا کہ سلمان گوارئیہ کی ہسٹری فائل انہوں نے بند کردی ہے اور وہ بھی اپنے ریکارڈ میں مستقل آنے والوں کی فہرست میں اس کا نام نکال دے۔ اس نئی ہدایت نے شازیہ کو فیضان

کے متعلق نئی تشویش میں مبتلا کردیا۔

''کیا یہ لڑکا مکمل صحت یاب ہو چکا؟'' وہ عموماً اس طرح کے سوالات ڈاکٹر صبور سے کرتی نہیں تھی مگر اس روز اسے پوچھنا پڑا تھا۔

''شاید.....'' ڈاکٹر صبور نے غیر واضح جواب دیا ''وہ لوگ ٹریٹمنٹ کو جاری نہیں رکھنا چاہتے اور یہ ان کی چوائس ہے۔'' شازیہ نے احترام سے سر ہلا دیا۔ سلمان کا نام کراس کر کے فائل کلوزڈ لکھتے ہوئے اسے ایک انجانی سی تکلیف محسوس ہوئی۔ دھما کا خیز انداز میں یہاں آنے والا کتنی خاموشی سے نکل گیا تھا۔ سلمان کی آمد کے تصور سے ہی فیضان کا یہاں آنا اور پھر اس کے بعد چل پڑنے والے ایک غیر متوقع سلسلے اور تعلق کا پیدا ہو جانا بھی اسے یاد آ گیا اور اسے یوں لگا جیسے زندگی میں انتظار اور آہٹ پر چونک جانے والی کیفیت جو شامل ہو گئی تھی ختم ہو چکی تھی۔

''اب تمہارا یہاں آنے کا جواز تو ختم ہوا۔'' اس نے تصور میں فیضان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اب نہ جانے تم سے ملاقات کا سبب کیا ہوگا اور کس ڈھنگ سے ہوگا۔''

.....

''آئیڈیل، ہاں میں بھی آئیڈیل پرست ہوں جس طرح کے ہمارے معاشرے کی اکثر فیصد لڑکیاں ہوتی ہیں، میرے ذہن میں بھی اپنی زندگی میں آنے والے مرد کے متعلق ایک تصوراتی خاکہ موجود ہے، مثلاً اس میں مردانہ وجاہت ہو، وہ ذہین ہو بلکہ اسے انٹلکچوئل ہونا چاہیے، گفتگو کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو، خوش لباس ہو، اصول پرست اور سچ بات کرنے والا ہو اور ایسا شخص میں نے پا بھی لیا اور اسے میں اپنے اردگرد محسوس بھی کرتی ہوں۔'' جہانگیر اپنے سامنے تازہ اخبارات و رسائل پھیلائے بہ آواز بلند پڑھ رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' نعیم نے کمپیوٹر مانیٹر پر نظریں جمائے جمائے پوچھا۔

''یہ ماہنامہ 'صورت گر' کا نیا شمارہ ہے اور اسی میں شائع ہوا ہے منفرد اداکارہ اور ماڈل سمعیہ سلطانہ کا انٹرویو۔''

''اور کیا لکھا ہے؟'' نعیم نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''اور یہ لکھا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں اپنا پروڈکشن ہاؤس بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں، اس سلسلے میں انھیں کئی معروف شخصیات کا تعاون حاصل ہے وہ ڈائریکشن کی طرف آنے کا ارادہ بھی رکھتی ہیں۔''

''وہی مخصوص باتیں ہیں۔'' کرن فائلز کا ایک ڈھیر شیلف میں رکھتے ہوئے بولی۔

''لیکن تم لوگ غور نہیں کر رہے کہ سمعیہ کے بتائے آئیڈیل کا جو خاکہ ہے اس میں کس کا عکس جھلکتا ہے، مردانہ وجاہت، ذہین بلکہ انٹلکچوئیل، گفتگو کا سلیقہ، اصول پرست ذرا غور کرو یار.....'' جہانگیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہارا اشارہ حسن کمال کی طرف ہے تو دو تین چیزیں ایسی ہیں جو اس میں ہرگز پائی نہیں جاتیں نہ تو وہ خوش لباس ہے، نہ اصول پرست، نہ سچ بات کرنے والا، وہ تو کہا ہی اپنی بے اصولی اور جھوٹی باتوں کے سر پر رہا ہے۔ عروج کی طرف جانے والی جس سڑک کا انتخاب اس نے کیا ہے اس کے مائیل اسٹونز پر بھی کچھ لکھا ہے بے اصولی، اور جھوٹی باتوں کے سر پر رہا ہے۔ عروج کی طرف والی جس سڑک کا انتخاب اس نے کیا ہے اس کے مائل اسٹونز پر بھی کچھ تو لکھا ہے بے اصولی، دروغ گوئی، خوشامد، چاپلوسی اور نہ جانے کیا کیا۔'' کرن نے بلند آواز میں کہا۔

''مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو بھی منزل اس نے اپنے لیے متعین کی، وہ اس تک پہنچ چکا ہے۔'' مہرین جو ایک طویل چھٹی لندن میں گزارنے کے بعد واپس آئی تھی اس نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ کرن کو ڈر تھا کہ حسن کمال سے متعلق یہ گفتگو مہرین کو ایک مرتبہ پھر اپ سیٹ کر دے گی اس لیے اس نے موضوع بدلنا چاہا۔

''جہانگیر، مجھے لگتا ہے کہ اپنا کام چھوڑ کر دوسرے میگزینز کے آرٹیکل پڑھنا ہی تمہاری جاب بن چکا ہے۔'' اس نے جہانگیر کو آنکھ کے اشارے سے اس موضوع پر بات نہ کرنے کا کہتے ہوئے ڈپٹا۔

''موضوع بدل لینے سے حقیقت تو بدل نہیں جائے گی کرن۔'' مہرین کو اس کی سوچ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ''اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔'' حسن کمال آج عروج پر ہے اور سمعیہ کا آئیڈیل ہے تو یہ اس کا حق ہے اس نے یہ سب پانے کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں، اپنے اصولوں کی، اپنے ٹیلنٹ کی، اپنی سوچ کی، طالبعلمی کے دور میں وہ بڑی انقلابی باتیں کیا کرتا تھا، وہ صحافت کے میدان میں نئے اصول اور نئے ڈھنگ متعارف کرانے کا عزم رکھتا تھا اور اس نے ایسا کیا بھی، ایسا کر کے پیٹ کی بھوک بھی کاٹی۔ میلوں میل پیدل چلنے کی اذیت بھی، موسموں کی سختی بھی مگر پھر اس نے جان لیا کہ یہ سب کر کے بھی وہ تنہا کوئی انقلاب نہیں لا سکتا، سو اس نے اپنے ساتھی بڑھانے کے بجائے ان کا ساتھی بن جانے کو ترجیح دے دی جن کا کوئی اصول نہیں مگر پھر

بھی وہ عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ ہم ان سب کو ہی غلط قرار نہیں دے سکتے کرن، کیونکہ ضروریات اور آسائشات اصولوں سے زیادہ اہم ہیں۔''

''مگر زرد صحافت کے علمبردار اس چھوٹے گروہ کا حصہ بن جانے پر کیا اس حسن کمال کی موت نہیں ہو گئی جو قلم کی نوک سے ایسے خار کھیرنے کے خلاف تھا جو نشتر بن کر لوگوں کو زخمی اور اپاہج کر دیں۔ جس حسن کمال کو ہم جانتے ہیں وہ یقیناً سادہ لوح، خوش باش لوگوں کی زندگیوں میں تلخیاں اور زہر گھولنے کے بجائے قلم بند کر دینے کو ترجیح دیتا، وہ تین چار سو روپے کے عوض عزت داروں کی پگڑیاں اچھالنے سے مر جانا بہتر سمجھتا۔ صول اتنے اہم نہیں جتنی ضروری آسائشات اور رزق روئی ہے مگر آسائشات اور رزق روٹی حاصل کرنے والا انسان اگر بے روح جسم بن کر رہ جائے تو پھر اس کو زندگی نہیں کہتے۔'' کرن نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

''ہر طرح کی سوچ کے دو کنارے ہوتے ہیں اور دونوں ہی انتہائی ہوتے ہیں، ایک وہ جو اس کے حق میں ہوتا ہے، دوسرا وہ جو خلاف ہوتا ہے۔ انسان کو آزادی ہونی چاہیے اپنے لیے ایک انتہا منتخب کرنے کی، سو حسن کمال نے اپنے لیے جو منتخب کیا وہ اس کا حق تھا، ہمیں اب اس بحث میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔'' مہرین نے سنجیدگی سے اور متانت کے ساتھ بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''لندن میں قیام نے آپ کی سوچ کو خاصا ثبت بنا دیا ہے۔'' جہانگیر کو مہرین کے خیالات پر خوشی ہوئی۔

''ہاں.....'' اس نے سر ہلا کر کہا ''میں نے وہاں رہتے ہوئے یہ سوچا کہ ہمیں اپنے لائن آف ایکشن سے مطلب ہونا چاہیے جو یہاں سے چلا گیا وہ ماضی کا حصہ بن گیا۔ ہمیں اپنے حال اور مستقبل کو پلان کرنا چاہیے بجائے ماضی کے رونے میں مشغول رہنے کے۔ اسی لیے میں نے اسٹائل گروپ آف پبلی کیشنز کے ساتھ جوائن ہو جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اون لکر کا نام تو یہی رہے گا لیکن اس کی مینجمنٹ میں ان کے لوگ بھی شامل ہوں گے۔ ہمارا کینوس بڑا ہو جائے اور فنانس وسیع۔''

''آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کب کیا'' نعیم نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

''کچھ روز پہلے ہی، تم لوگ جانتے ہو کہ میگزینز کی اس مشروم گروتھ میں سروائیو کرنے کا چانس صرف اس کے پاس ہوگا جو مقابلہ کرے گا اور مقابلہ کرنے کے لیے جس کے پاس فنانس ہوگا۔ ہمارے پاس اچھے محنتی اور پرخلوص لوگوں کی کمی نہیں مگر ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے، پیسہ نہ

ہونے کا مطلب مار کھا جانا ہے۔ اسٹائل گروپ کے پاس فنانس بہت ہے، پہلے سے ہی ان کے ایک دو پروجیکٹ چل رہے ہیں، ہم اپنی پالیسیز پر نظرثانی نہ کرنے کی شرط کے ساتھ اگر ان کے فنانس پر اپنا میگزین چلائیں تو ہمیں سوائے منافع شیئر کرنے کے کوئی دوسری درڈسری مول نہیں لینا پڑے گی۔ میں نے اس پیشکش پر ہفتوں سوچا اور پھر یہ فیصلہ کیا کیونکہ میگزین بند کر دینے کی نسبت یہ بہرحال بہتر آپشن ہے کیا تم لوگ مجھ سے متفق نہیں۔''

''نہیں، ایسی بات تو نہیں ہے۔'' محویت سے اس کی بات سنتی کرن نے چونکتے ہوئے کہا ''مجھے صرف ایک ہی خیال آ رہا ہے کہ کیا وہ لوگ ہماری پالیسی کے مطابق چل سکیں گے۔''

''جو معاہدہ طے پایا ہے اس کی سب سے اہم شرط یہی ہے، اس کے متعلق تم فکر مت کرو۔'' مہرین نے مطمئن انداز میں کہا ''اور تم لوگ.....'' اس نے نعیم اور جہانگیر کی طرف دیکھا۔

''ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' نعیم نے مسکراتے ہوئے کہا ''ویسے کیا اس صورت میں ہمارے معاوضے بڑھنے کا بھی کوئی چانس ہے۔''

''یقیناً.....'' مہرین نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا ''بہتر فنانس، بہتر منافع، بہتر معاوضہ۔''

اب وہ سب خوش نظر آ رہے تھے جبکہ کرن کو اس موقع پر حسن کمال یاد آنے لگا ''بس اتنے سے دنوں کی ہی تو بات تھی تم نے اپنی دیرینہ ساتھی اور ہمدرد دوست کی بھی قربانی دے دی بلندی کی خواہش میں۔'' اس نے مہرین کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا، جو نئے اسٹائل میں ترشے ہوئے بالوں، ہلکے میک اپ اور جینز ٹی شرٹ کے اوپر خوبصورت مفلر گلے میں ڈالے پہلے سے بہت مختلف اور بہت ڈیسنٹ لگ رہی تھی۔

''لیکن کیا معلوم یہ تمہارے ہی عمل کا ردعمل ہوا گر تم یہاں سے نہ جاتے تو شاید مہرین کو بھی یہ خیال نہ آتا۔'' اسے دوسرا خیال آیا اور پھر وہ ان کی خوشی میں مسکراتے ہوئے شامل ہو گئی۔

.....o.....

فیضان بہت دن تک تو خود پر ہونے والے نئے انکشافات پر ششدر سا رہا۔ اسے اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے تقریباً سارے لمحات یاد آ رہے تھے کیسے وہ اپنی پھوپی اور تائی کی گود میں پرورش پاتا رہا اور کیسے کئی مواقع پر وہ تائی امی کو کہتے تھے ''یہ فیضی تو آپ کا بیٹا ہے میں نے اس کو آپ کے حوالے کیا پکا پکا'' اور یقیناً سب یہی سمجھتے تھے کہ وہ محبت میں ایسا کہتے تھے اور سلمان کو یقیناً انھوں نے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

کبھی اسے مہ پارہ بیگم کا چہرہ یاد آ جاتا ''کیا ایسی بات تھی ان میں جو ابا نے اتنی قربانی دی ان کی خاطر۔'' وہ سوچتا۔ پھر اسے ابا کے متعلق اپنے پرانے خیالات ستانے لگتے اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ ان سے شرمندہ تھا شاید ان کا سامنا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ مہ پارہ بیگم کے ہاں سے آنے کے بعد وہ تقریباً دو ہفتے تک اپنے آفس سے چھٹی لے کر گھر بیٹھا رہا تھا۔ ملنا، ملانا دوست عزیز اس نے سب چھوڑ رکھے تھے۔ اسے ایسا بھی محسوس ہوتا تھا کہ شاید وہ بھی سلمان کی طرح کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہو رہا تھا۔ دو ہفتے بعد اسنے خود کو اس خود ساختہ تنہائی سے باہر نکالنے کا فیصلہ کیا اور چوہدری مقصود سے اجازت لے کر ان کے پاس چلا آیا۔

''اب تم مجھ سے پوچھو گے کہ میں نے سلمان کو ڈاکٹر عبدالصبور سے ٹریٹمنٹ نہ دلوانے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟'' چوہدری مقصود نے اپنے سامنے بیٹھے فیضان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تمھیں کچھ عرصے سے ڈاکٹر صبور کے مشوروں کے صائب ہونے کا خیال کچھ زیادہ جوستا رہا ہے اس لیے، میں نے آج تمہاری یوں اپنے پاس آمد سے یہ اندازہ لگایا کہ تم اب میرے اس فیصلے پر بحث کرو گے۔'' انھوں نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں یہ پوچھنے یہاں نہیں آیا تھا بلکہ مجھے آپ کے اس فیصلے کا علم ہی نہیں ہے ویسے یہ فیصلہ آپ نے کیوں کیا؟''

''میری ایک امریکن سائیکو تھراپسٹ ڈاکٹر پاؤم سے بات ہو گئی ہے، سلمان کی حالیہ کیفیت پہلے سے زیادہ تشویشناک ہے پہلے وہ نارمل نہیں تھا اور نارمل نظر بھی نہیں آتا تھا اب وہ نارمل نظر آتا ہے مگر حقیقت میں نارمل اب بھی نہیں ہے۔''

''تو آپ کو اس کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالصبور پر یقین نہیں رہا۔ آپ کا خیال ہے کہ معاملہ ان کے علم اور تجربے سے بڑا ہے۔'' فیضان دل میں شکر کر رہا تھا کہ وہ سلمان کی حالت کو جانچ چکے تھے۔

''میں یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے کہ سلمان کے لیے ماحول کی تبدیلی زیادہ ضروری ہے، میں خود بھی دو ہفتوں کے لیے امریکا جا رہا ہوں سلمان کو ساتھ لے جاؤں گا۔'' انھوں نے اطلاع دی۔

''جی۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''اگر تم سلمان کے سلسلے میں بات کرنے نہیں آئے ہو تو پھر کیا بات ہے کہو۔'' انھوں نے

سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ فیضان کو کبھی سمجھ نہیں آیا تھا کہ ان کے سامنے ہمیشہ اس کی آواز گنگ کیوں ہو جاتی تھی اور اسے اپنا حلق خشک ہوتا کیوں محسوس ہوتا تھا۔

"کچھ خاص نہیں سر، بس ایسے ہی۔" اس نے بہ مشکل کہا۔ وہ ان کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا شاید یوں جیسے پہلے کبھی دیکھا نہ ہو۔

"جاب کیسی جا رہی ہے تمہاری، ایک روز مسٹر جوزف کہہ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے تمہارا ٹرانسفر ملائیشیا کر دیا جائے؟"

"جی شاید، مگر میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔"

"ان سے بات کر لیتے ہیں، نہیں ہوگا ٹرانسفر۔"

"میں نے نہیں کہا نا، اب شاید میں ایسا چاہوں گا کہ یہاں سے چلا جاؤں۔" فیضان نے جلدی سے کہا۔ انھوں نے ابرو اٹھا کر اس کی بے ربط گفتگو پر غور کرنے کی کوشش کی۔ "میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے باہر کسی برانچ میں کام کروں۔ یہاں میں یکسانیت کا شکار ہو رہا ہوں اس لیے......" اس نے وضاحت کرنی چاہی۔

"ٹھیک ہے، یوں ہی کرلو۔" وہ کش لیتے ہوئے بولے۔

"اور سلمان، وہ وہیں رہے گا کیا؟" فیضان نے کہا۔

"ہاں، شاید اسے کافی عرصے تک وہاں رہنا پڑے۔"

"اور آپ یہاں اکیلے، تنہا رہیں گے؟" فیضان نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"میرا کیا ہے تو میں ہمیشہ سے تنہا ہی رہا ہوں۔" بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ فیضان خاموش ہو کر کچھ دیر انھیں دیکھتا رہا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

"میں اب چلتا ہوں۔" تیزی سے کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے اپنا موبائل جیب سے نکالا۔ اس کی انگلیاں کرن فاطمہ کا نمبر دبا رہی تھیں۔

......o......

"مجھے آپ سے ایک ریکویسٹ کرنا تھی۔" کرن کا نمبر ملنے اور اپنا تعارف کروانے کے بعد فیضان نے کہا۔

"ہاں، کہو۔" کرن نے کہا۔

"جو کچھ بھی مہ پارہ بیگم نے آپ کو اس انٹرویو کی صورت میں بتایا ہے، آپ اسے اپنے میگزین میں نہ لگائیں۔"

"اِیں......" ریوالونگ چیئر کو گھماتے ہوئے فون سنتی کرن کو جیسے بریک لگ گئے "مگر کیوں......؟"

"پلیز، آپ یہ مہربانی کر دیں، اس کہانی کے شائع ہونے سے کئی اور کہانیوں کو عنوان مل جائیں گے، پلیز آپ ایسا مت کریں۔" فیضان کا لہجہ خاصا ملتجیانہ تھا۔

"اوہ......" کرن نے نچلا ہونٹ دانت تلے دبا کر کہا "تمھیں اپنے والد کی فکر ہے۔"

"یقیناً۔" فیضان نے صاف گوئی سے کام لیا "کیا آپ نہیں سمجھتیں کہ جس طرح کی خاموش اور پُراسرار زندگی انھوں نے گزاری ہے اس کو یوں خبروں کی زد میں آنے سے بچا لینا چاہیے۔"

"خبروں کی زد میں تو وہ کئی ماہ سے آئے ہوئے ہیں فیضان، مہ پارہ بیگم کی ذات پر اچھلنے والے سارے کیچڑ کے چھینٹے ان کی بے داغ شخصیت پر بھی پڑ رہے ہیں کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ان کی

اصل شخصیت سے متعارف ہونے کا موقع ان کے نقاد کو بھی ملے۔'' کرن نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں یہ کبھی بھی نہیں چاہوں گا۔'' فیضان نے مضبوط لہجے میں کہا ''ان کی شخصیت کو ان کی ذات کی وہ تنہائی ہی سوٹ کرتی ہے جو ایک عمر سے ان کا خاصہ ہے، وہ اچھے ہیں یا برے، ہم میں سے کوئی بھی اس کا حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ ہم سب کے پیمانے الگ الگ ہیں مگر ایسی کہانی شائع ہو جانے سے جس میں وہ ہر طرح سے سینٹرل فگر کی حیثیت رکھتے ہیں، ان پر کئی طرح کے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، ان کا سیاسی کیریئر، ان کے علاقے میں ان کی شخصیت کا امیج، ان کے گھر والوں کی نظروں میں ان کی حیثیت اور سب سے بڑھ کر وہ خود جس خول کے اندر بند ہیں اس میں دراڑیں پڑ جانے کا خطرہ ہے۔''

''اور اگر یہ کہانی شائع نہیں ہوتی تو مہ پارہ بیگم کی شخصیت پر اچھالے جانے والے کیچڑ کی مقدار میں کس قدر اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اس کا اندازہ ہے تمہیں؟'' کرن نے اس کی بات کا کوئی اثر نہ لیتے ہوئے کہا۔

''ان کے متعلق تو جو کچھ کہا جا سکتا تھا، کہا جا چکا...... لیکن ابا کی ذات کو یوں لوگوں کی گفتگو کا موضوع بننے میں ہرگز نہیں دوں گا۔'' فیضان کے لہجے میں کرن کی بے نیازی محسوس کر کے تیزی آ گئی۔

''سیاسی داؤ پیچ کے سلسلے میں وفاداریاں اور وابستگیاں بدل لینے کے سلسلے میں، مظلوم لوگوں پر ظلم روا رکھنے اور انہیں جان تک سے مار ڈالنے کے سلسلے میں قومی خزانے کو اجاڑنے کے سلسلے میں ان کی ذات لوگوں کی گفتگو کا موضوع اکثر بنتی ہے اس سے تو تمہیں کبھی فرق نہیں پڑا، پھر ان کی شخصیت کے اس پہلو کے موضوع گفتگو بننے سے کیوں گھبرا گئے جبکہ اس میں تو لوگوں کی نظروں میں ان کے سرخرو ہونے کا مارجن بھی کافی ہے۔'' کرن نے اب کے اپنے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

''یہ صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں کہ اس سے کیا فرق پڑے گا۔ اپنے متعلق نیگیٹو باتوں کے کھل جانے کا اندازہ اگر ہمیں پہلے سے ہو جائے تو ہم ضرور انہیں کھلنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں یہ محض اتفاق ہے کہ اس روز میں حویلی پہنچ گیا جب آپ بھی وہاں موجود تھیں ورنہ شاید مجھے بھی علم نہیں ہوتا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔'' فیضان نے کہا ''اس روز جو انکشافات مجھ پر ہوئے ان کے بعد فرق تو مجھے بھی کوئی نہیں پڑنا چاہیے تھا کہ ابا کی ذات پر کیچڑ اچھلتا ہے یا پھول برستے ہیں لیکن

اتنی طویل رفاقت نے میرا ان کے ساتھ وہی تعلق بنا دیا تھا جو باپ بیٹے کا ہوتا ہے۔ پھر آپ خود ہی سوچیں کہ میں کیسے اس انٹرویو کو شائع ہونے دوں......!''

''اور اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کروں تو......؟'' کرن نے سوالیہ نظروں سے کہا۔

''تو پھر میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کروں گا اسے روکنے کے لیے۔'' فیضان نے قطعیت سے کہا۔

''تو ضرور کرو، جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے یہ بیڑا اٹھایا ہی اس لیے تھا کہ مہ پارہ بیگم کی شخصیت کو ان چہ میگوئیوں کی زد سے نکالوں جو میرے ہی ایک آرٹیکل کے نتیجے میں شروع ہوئیں۔ میرا دوسرا مقصد ان جھوٹے ابن الوقت صحافیوں کے منہ پر طمانچہ مارنا ہے جو عام سی شخصیتوں کو دنوں میں ہاٹ ٹاپک بنا کر ان کا جذباتی و روحانی قتل کرتے پھرتے ہیں۔ مہ پارہ بیگم کا دل اور ذہن جس کرب سے گزر رہا ہے اور جس کیفیت میں وہ آج کل ہیں اس کا اندازہ تمہیں نہیں ہے۔''

''ان کی کہانی میں کچھ مقام ایسے بھی ہیں جن میں ان کی اپنی حماقتیں ظاہر ہوتی ہیں جبکہ ان کی خود غرضی کا عالم یہ ہے کہ اپنے عہد کی پاسداری کرنے والے ایک شخص کی انتہائی ذاتی زندگی کو پبلک کے سامنے لا کر اپنی عزت بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' فیضان نے تلخ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی اس بات نے کرن کے دل پر اثر کیا شاید وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔

''دیکھو میں کوشش کروں گی کہ اس انٹرویو کو اس شکل میں ڈھال لوں کہ چوہدری مقصود کا نام نہ آئے۔''

''یہ شاید آپ کے لیے ممکن نہ ہو کیونکہ آپ ان کے نکاح کا ذکر کریں گی تو اس شخص کا نام ضرور آئے گا جس سے نکاح ہوا، کھل کر نہیں لکھیں گی تو اس انٹرویو کو بھی مہ پارہ بیگم کی شخصیت کے بارے میں لکھے گئے آرٹیکلز کی ایک کڑی کہا جائے گا۔'' فیضان نے اسے یاد دلایا ''آپ اس انٹرویو کو خود اپنے تک محدود رکھیں یہی بہتر ہو گا۔''

''تم چوہدری مقصود کی اپنی اولاد نہ سہی ان کے بھائی کی اولاد تو ہو ہی...... اس لحاظ سے تمہارا بیک گراؤنڈ بھی وہی بنتا ہے جو ان کا ہے جبھی یہ بات کرتے ہوئے تمہارے لہجے اور انداز کے پیچھے دھمکی ابھرنے لگتی ہے۔'' کرن نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں کہ صحافی جب کسی بات کا تذکرہ گول کرنا چاہے تو کیسے کر لیتا ہے اور جب کسی غیر اہم سی بات کو ہائی لائٹ کرنا چاہے تو کیسے

کرتا ہے۔ یہ انٹرویو میرے دل و دماغ میں ہونے والی کشمکش کے خاتمے کے لیے شائع ہونا ضروری ہے اور یہ شائع ہوگا، اس لیے تم انتظار کرو اور دیکھو کہ یہ کس رنگ میں شائع ہوتا ہے۔'' اس نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔

……✿……

''ایک مرتبہ پھر یہ کہنا پڑے گا بیگم صاحبہ کہ منہ چھوٹا ہے بات بڑی، حکم کریں تو عرض کروں……؟'' فتح خان ہاتھ باندھ کر مہ پارہ بیگم کے سامنے سر جھکا کر کھڑا تھا۔

''مجھے اندازہ ہے فتح خان کہ تم کیا کہنے والے ہو۔'' مہ پارہ بیگم نے عینک اتار کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''پھر بھی کہو جو بات دل میں آئے وہ کہہ ڈالنی چاہیے۔''

''بار بار کہنا چاہتا ہوں پھر ایک خیال دل میں آتا ہے، رک جاتا ہوں۔'' فتح خان نے ایک مرتبہ پھر کہا ''خیال آتا ہے کہ آپ کے دل میں یہ بات نہ آئے کہ فتح خان کی بات درست بھی ہو تو اس کی یہ مجال……''

''مت سوچو ایسا فتح خان۔'' مہ پارہ بیگم نے اس کی بات کاٹی ''تم دیکھ رہے ہو کہ اوپر والی ذات ہم سب کو کیا کیا رنگ دکھا رہی ہے۔ وہ جو کبھی ناممکن نظر آتا تھا ممکن ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ سب کون ہیں؟'' انھوں نے اپنے سامنے رکھے اخبارات کے تراشوں کی طرف اشارہ کیا ''ان کے آباؤ اجداد کے حسب نسب کے بارے میں ہم کیا جانتے ہیں مگر آج دیکھ لو سب کے سب ہاتھ میں تیر و تفنگ پکڑے صف آرا ہیں، ہم انھیں کچھ کہہ نہیں سکتے، ان کے ہاتھ پکڑ سکتے ہیں، نہ زبانیں بند کر سکتے ہیں تو پھر ہم تم تو ہمیشہ کے دم ساز ہیں اور ہمراز بھی ہیں پھر ایک دوسرے سے دل میں آئی بات کہہ ڈالنے میں کون سا وہم مانع ہے۔''

''آپ کی بات درست بیگم صاحبہ۔'' فتح خان نے ان کی بات سننے کے بعد ایک مرتبہ پھر سر جھکا کر کہا ''مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ہمارے گھرانے نے آپ کی خدمت میں حاضر رہتے اتنے برس گزار دیے، بہت آشنائی سہی، دمسازی سہی مگر ہم اپنی حیثیت پہچانتے ہیں، اس کو بھلا دینے سے بہت نقصان ہوگا۔''

''تم کہو تو سہی فتے خان، کیوں خلجان میں مبتلا کرتے ہو۔'' مہ پارہ بیگم نے ایک مرتبہ پھر اسے بات کہنے کا حوصلہ دلایا۔

''بات یہ ہے بیگم صاحبہ کہ میری ناقص عقل میں یہ سوچ بار بار سر اٹھاتی ہے کہ آپ نے

رسالے والی بی بی کو ساری بات سنا تو دی، کہیں اب وہ اس کو کسی اور ہی انداز سے چھاپ دیں تو آپ کا ملال ختم نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ چوہدری صاحب ہمارے محسن ہیں۔ اس حویلی کے سارے ستون اماں مہرو جان کے نام سے اب تک اگر جوں کے توں کھڑے ہیں تو صرف اور صرف چوہدری صاحب کی وجہ سے پھر ہم یہ کہانی سنا کر کسی احسان فراموشی کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔''

''ہوں……'' مہ پارہ بیگم نے ہاتھ میں پکڑی عینک کو سنہری ڈبیا میں بند کرتے ہوئے کہا ''بیٹھ جاؤ فتح خان۔'' فتے خان ان کے سامنے قالین پر ہی بیٹھ گیا۔

''تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔'' مہ پارہ بیگم نے کہنا شروع کیا ''میں نے بھی کرن فاطمہ کو یہ ساری کہانی سنانے سے پہلے کئی دن اور کئی راتیں یہی بات سوچنے میں گزار دیں مگر پھر میرے دل نے یہ فیصلہ دیا کہ اب یہ کہانی کہہ ڈالنی چاہئے اور میرے دماغ نے اس پر منظوری کی مہر ثبت کر دی۔ ایسا کیوں ہوا بھلا جانتے ہو؟'' انھوں نے سوالیہ نظروں سے فتح خان کی جانب دیکھا۔ جس نے لمحے بھر کے لیے نظریں اٹھا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''ایسا اس لیے ہوا فتح خان کہ یہ کہانی پردے میں رہتے ہوئے بہت سی ان گزری داستانوں کو سر اٹھانے کا موقع دے رہی تھی۔ اس کی روپوشی کی وجہ سے بہت سی زندگیاں متاثر ہو جانے کا خدشہ تھا۔ سب سے بڑھ کر اس حویلی کی آن بان اور وقار جس کو قائم رکھنے کی خاطر اتنے پاپڑ بیلے گئے اور اتنی قربانیاں دی گئیں داؤ پر لگا تھا۔ ہرا یرا غیرا اسے کنچنیوں کا ڈیرا گردانے لگا تھا۔ اس کی تاریخ کے ساتھ طوائفوں اور امیر زادوں کے بیچ کھیلے جانے والے کھیلوں کی کہانیاں وابستہ کی جانے لگی تھیں۔ ایسی ایسی کہانیاں جنھیں پڑھ کر سر شرم سے جھک جاتا تھا ان کا خصوصاً جو اس حویلی کو پرانی روایات کی امین عمارت سمجھ کر فرصت کے چند لمحات گزارنے ادھر آ جاتے تھے۔ تم نے دیکھا جب سے یہ داستانیں اخباروں میں چھپنے لگی ہیں مرزا صاحب، حکیم صاحب، ببن میاں اور رشید خان جیسے لوگوں نے ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان شرفا کو اپنی یہاں آمد و رفت کی وجہ سے ٹوپیاں اچھلنے کا خدشہ لاحق ہو گیا تھا۔ ایک اس حویلی کی ہی نہیں کہوں گی ان قصوں نے چوہدری مقصود جیسے چھپے وضع دار شخص کی شخصیت کے بھی بخیے ادھیڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مجھ غریب، بے عقل کو تو لوگ ان کی داشتہ یار کھیل جو کہتے سو کہتے ان کی اپنی عمر کی وفاداری اور خاموش عہد پرستی کا جنازہ نکل رہا تھا۔ وہ دو بچے جو انھوں نے اپنی جان کے ساتھ لگا کر رکھتے تھے، ان دونوں کو بھی اپنی ہی نظروں میں مشکوک بنا دیے جانے کا سامان کیا جا رہا تھا اور ان کے علاوہ نہ

جانے کون کون سے بچوں کو اس حویلی کی پیداوار قرار دیا جا رہا تھا۔'' مہ پارہ بیگم کہتے کہتے تھک کر رک گئیں ان کی آواز رندھنے لگی تھی۔

''ہم گویے ہیں، مغنی ہیں، سُر سنگیت سے ہمارا ازل سے ایک رشتہ جڑا ہے فتح خان، ہم لکھنو کی روایتی وضع داری اور آن بان کے امین ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جن پر نہ میری ماں نے نہ میری نانی نے نہ ہی ان کی ماں نے کبھی سمجھوتا کیا تھا۔ استاد کالے خان اس دنیا سے چلے گئے مگر استاد غریب سلطان ان مواقع کے عینی شاہد اب تک زندہ ہیں، جب چوہدری صاحب کی ضد کی وجہ سے یہ سب طغرے جو ہمارے سینوں پر سجے تھے چھینے جانے والے تھے، اس وقت صرف انہی کو بچانے کی خاطر میں نے اپنے دل کی دنیا کی قربانی دے ڈالی کہ مجھے ان سے زیادہ کچھ عزیز نہ تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو اپنے اچھے خاصے شجرے کے ہوتے ہوئے بھی کنجنی کی جنی کہلاتی۔ ایک حویلی جو اتفاقاً ہاتھ آ گئی تھی چھن جاتی تو دوسری کو پانے کے لیے میں عقل کی اندھی شاید کسی غلط شاخ پر جا بیٹھتی۔ سو جب اطمینان ہوا کہ دل کی دنیا کی قربانی دے ڈالنے سے عزت بھی بحال رہتی ہے اور روایتوں کی پاسداری بھی تو کچھ تامل نہ کیا۔ شہرت و ناموری کی بلندیوں کو چھو سکتی تھی مگر منہ موڑ لیا، پیسے کے انبار کما سکتی تھی مگر خیال تک نہ کیا۔ من چاہی زندگی گزار سکتی تھی مگر خود کو پابند کر لیا۔ اس وقت میری عمر اتنی زیادہ بھی نہ تھی، ایک عورت کی من پسند گھریلو زندگی گزار سکتی تھی مگر خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ گمنامی مول لے لی، تھوڑے میں گزارہ کرنے کی عادت ڈال لی، بیاہتا ہوتے ہوئے بھی مجرد زندگی گزاری، شہد کی گھٹی چٹا کر گود لیے بچے کو گود سے نکال کر اپنے اندر کی فطری ممتا کو مار ڈالا اور خود پر خوش رنگ لبادے ڈال لیے، سستی شہرت سے نفرت تھی، ضرورت سے زیادہ پیسے کی خواہش نہیں تھی، عمر بھر کوئی ایسا ملا ہی نئیں جس سے بیاہ کر سکوں۔ میں نے اپنی ذات کو اپنی اس شخصیت کو کیوں چھپا ڈالا ان لبلبو کے نیچے فتح خان جانتے ہو کیوں؟'' ایک مرتبہ پھر انھوں نے فتح خان کی طرف دیکھا وہ یوں ہی سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''صرف اس وجہ سے کہ زندہ رہوں تو اپنی ہی نظروں میں سرخرو رہوں، مر جاؤں تو ماں اور نانی کے سامنے شرمساری سے بچ جاؤں۔ سُر سنگیت سے تعلق رکھنے والے سب لوگ ہی بھانڈ، میراثی نہیں ہوتے، ان میں کچھ وہ بھی ہوتے ہیں جو سُر سنگیت کے اصولوں کو سمجھتے ہیں اور اس کا اصل چہرہ پہچانتے ہیں۔ گانے والی تمام عورتیں اس بازار سے نہیں آتیں، کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا تعلق جن کی پہچان ہی سُر اور تال سے ہوتی ہے، جن کا حسب نسب ہی سُر تال ہوتا ہے، جن کا

خاندان ہی سنگیت ہوتا ہے۔ دنیا کو یہ سب دکھانے کے لیے فتح خان میں نے اپنے دل کی دنیا اجاڑ دی مگر میں گھاٹے میں نہیں رہی۔'' انھوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''خدا کو میری حماقتوں پر پردہ ڈالنا تھا مہر خالہ کی دعاؤں کو قبولیت بخشنا تھی اور میری قربانی کو رائیگاں جانے سے بچانا تھا سو اس نے چوہدری مقصود کا دل موم اور نظر نیچی کر دی۔ میں آج تک یہ بات سمجھ نہیں پائی کہ وہ شخص جو ہمارا سکون اور سائبان لوٹنے کے لیے آیا تھا، ہمارا محافظ اور محسن کیسے بن گیا اور پھر ایسے بنا کہ حق ادا کر دیا۔ ان کی ذات کی بہت سی کجیاں اپنی جگہ سہی مگر یہ جو ان کی شخصیت کا حسن ہے وہ ان کے لیے گالی کیوں بنے، فتح خان ان کی ذات کو اس گالی سے بچانا بھی میرا فرض تھا۔ وہ عہد نامہ جس کی یاد چوہدری صاحب گاہے بگاہے مجھے دلاتے رہے ہیں اس کا ایک ایک لفظ میرے دل پر لکھا ہے اور میرا خدا گواہ ہے کہ میں گزرے سالوں کے کسی بھی لمحے میں ان سے منحرف نہیں ہوئی مگر اب بات اور تھی ایک عرصے کے بعد اس عمر میں آ کر مجھ سے ایک حماقت اور ہو گئی، میں نے یہ سوچ کر کہ ہمارے بعد اس فن سے شناسائی صرف اناڑی لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی، سُر کی تاریخ کے چند ابواب دُہرانے شروع کر دیے، میری قسمت کہ جس کے سامنے دُہرائے وہ بھی اس عہد کی خالص پیداوار نکلا اور اس نے بات کہیں سے کہیں پہنچا دی۔ میرے پاس اس کا واحد حل یہی تھا کہ اس داستان کو حرف بحرف دُہرا دوں کیونکہ نہ دُہرانے کی شکل میں ایک اور نسل کی تاریخ بگڑنے کو تھی۔''

''حق کہتی ہیں آپ حضور، حق کہتی ہیں۔'' فتح خان نے نظریں جھکائے جھکائے سر ہلایا
''مگر پریشانی اور پشیمانی چوہدری صاحب کی طرف سے ہے۔''

''سچ کہتے ہیں چوہدری صاحب کہ ان کے علاقے میں ان کے سینکڑوں وفادار سہی مگر فتح خان جیسا ایک بھی نہیں۔'' مہ پارہ بیگم نے مسکرا کر کہا ''سلمان کی ذہنی حالت سے تم واقف ہو، چوہدری صاحب کی خواہش کے برعکس وہ ایک آزاد زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ چوہدری صاحب اسے اپنی خواہشات اور خوابوں کے شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کشمکش میں سلمان کی زندگی خراب ہو رہی ہے۔ وہ بچہ اس دنیا میں آیا اور قسمت سے چوہدری صاحب کی گود میں چلا گیا مگر اسے جینے کا حق بھی ملنا چاہیے۔ اس کہانی کے بیان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ چوہدری صاحب سلمان کو آزاد کر دیں۔''

''کیا وہ ایسا کر دیں گے بیگم صاحبہ؟'' فتح خان نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

''وہ بہت غضب ناک ہو جائیں گے۔''

''چلو ایسا ہی کر لیں وہ..... مگر ان بچوں کی نفسیات تباہ ہونے سے بچ جانی چاہیے۔'' مہ پارہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ وقت اچھا تھا بیگم صاحبہ، جب استاد کالے خان، استاد غریب سلطان اور اماں مہرو جان آپ کے سر پر تھیں اور ہر وقت آپ کے برے بھلے کی تمیز اور کسی عمل کے ردعمل کے متعلق سمجھاتی رہتی تھیں۔ آپ کی بھول چوک کے نتیجے میں اٹھنے والے طوفانوں کو بھی وہ لوگ روک لیتے تھے مگر اب جو اونٹ سامنے کھڑا کیا ہے آپ نے وہ جس بھی کروٹ بیٹھے گا کوئی چھوٹی موٹی قیامت ہی لائے گا۔'' فتح خان اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے سوچ رہا تھا۔

.....

''میرا خیال ہے کہ تم مجھے بھلا چکے ہو، میرے دل کے تمام خدشات درست نکلے یقیناً میں تمہارے رویے پر دل گرفتہ ہوں اور سلمان کی ہسٹری فائل کلوز ہو جانے پر ملول بھی مگر تمہارا تصور ایک اچھی یاد کی طرح ہمیشہ میرے دل میں رہے گا۔'' فیضان نے غالباً چھٹی مرتبہ شازیہ کا بھیجا میسج پڑھا جو اس کے موبائل کی اسکرین پر روشن تھا۔ اس کے چہرے پر ذرا دیر کے لیے مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یقیناً تم حقدار ہو اس طرح کا شکوہ کرنے کی۔'' اس نے سوچا۔ اسے شازیہ کے لکھے الفاظ پر پیار آ رہا تھا۔ وہ شازیہ سے ملنا چاہتا تھا مگر اس روز اس کا ارادہ مہ پارہ بیگم کی طرف جانے کا تھا اور وہ انہی کی حویلی کی طرف جا رہا تھا جب شازیہ کا پیغام اسے ملا۔

''اگر میں ان مسائل سے جو آج کل مجھے درپیش ہیں، نبٹ کر تم سے ملوں تو وہ ملاقات زیادہ خوشگوار ہوگی۔'' اس نے ایک جگہ گاڑی روک کر شازیہ کے لیے میسج لکھا اور حویلی مہرو جان کی طرف آ گیا۔

''تمہاری بات سن کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میری گفتگو نے تمہارے دل میں چوہدری مقصود کے لیے نفرت جگانے کے بجائے کوئی اور جذبہ پیدا کیا ہے جسے محبت بھی کہہ سکتے ہیں۔'' اس کی بات کے جواب میں مہ پارہ بیگم نے کہا تھا۔

''مجھے معلوم نہیں کہ یہ کیا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ میرا دل کہتا ہے کہ مجھے ابا کا یوں لیٹ ڈاؤن ہونا کبھی بھی اچھا نہیں لگے گا، انھوں نے ایک عمر غیر فطری تعلقات کو نبھاتے ہوئے گزار

دی، میں نے کبھی ان کے کسی انداز سے زندگی کی روٹین سے بیزاری کا تاثر ابھرتا نہیں دیکھا۔ انھوں نے خود کو گونا گوں مصروفیات میں الجھایا ہوا ہے اور کسی طرح سے بھی ایسا نہیں لگتا کہ وہ اپنے دل کی دنیا میں کیا چھپائے بیٹھے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے اس معمول میں کوئی فرق نہ آئے، آپ کی سنائی کہانی شائع ہو جانے سے آپ کی طرف سے آپ کے ناقدین کو تو معقول جواب مل جائے گا مگر ابا کی زندگی کے سارے معمولات بگڑ جائیں گے۔ ان کو یہ سزا کیوں ملے آپ بتا سکتی ہیں؟''

''چوہدری مقصود کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ اچھے انسان ہیں اس حد تک کہ انھوں نے چند چیزوں کو بخوبی نبھایا ہے مگر تم ان کی زندگی کے باقی پہلوؤں پر غور کرو، انھوں نے کیا، کیا۔ تمام عمر وہ اقتدار میں بیٹھی حکومت کے اہم ستون بنے رہے، میں نے کبھی انھیں اپوزیشن میں بیٹھے نہیں دیکھا۔ اقتدار کی مسند نے انھیں کبھی کسی پکڑ میں آنے ہی نہیں دیا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ میرے والا سلسلہ شروع ہی اس لیے ہوا کہ چوہدری مقصود، گرفت میں آ سکیں۔ ان کی ایک ضد نے میری ساری زندگی کو ایک خوف کی کیفیت میں ڈالے رکھا۔ وہ کتنے ضدی ہیں تم نے دیکھا ہوگا کہ اس ضد کو نبھانے کے لیے انھوں نے تمھیں اور سلمان کو بیٹا بنا لینے سے بھی دریغ نہیں کیا اور ان کی ذات کے رعب کا یہ عالم ہے کہ کوئی ان سے تم لوگوں کے متعلق سوال تک نہیں کر سکا۔ یہ سب اللہ کے بندوں کا مقسوم نہیں ہوتا بیٹا، اللہ کو اپنے بندے کی عاجزی اور نرمی پسند آتی ہے۔ چوہدری مقصود نے چند نیکیاں اگر نیک نیت سے کی تھیں، تو اس کہانی کے شائع ہو جانے سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر ایسا نہیں تھا تو پھر انھیں فرق پڑنا چاہیے۔''

فیضان کا دل مہ پارہ بیگم کی دلیل کو مان نہیں پا رہا تھا، اس کی نظروں کے سامنے مستقبل کے سارے نقشے ابھر رہے تھے۔ اس کے اپنے حلقہ احباب میں، اپنے علاقے میں بلکہ قومی سطح پر بہت سے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوگا کہ چوہدری مقصود کی اپنی حقیقی اولاد کوئی بھی نہیں تو اصل کہانی کو سراہنے والے کم اور تمسخر اڑانے والے بے شمار ہوں گے۔ ان کی بظاہر مربوط زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اسے دنوں میں ہی حالیہ زندگی کے اسٹیٹس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

''آپ غلط کریں گی، آپ زیادتی کریں گی۔'' بے بسی کے عالم میں اس کے منہ سے الفاظ پھسلے۔

''وہ درست تھا وہ جو چوہدری مقصود نے کیا؟'' انھوں نے سوال کیا۔

''اس میں ہمارا کیا قصور تھا؟'' اس نے کہا۔

''ہمارا قصور تھا؟'' ایک اور سوال آیا۔

''آپ کا قصور تو تھا اور اب بھی ہے۔'' وہ جھلا کر بولا ''ایک حویلی کو بچاتے ہوئے آپ نے کتنی زندگیاں تماشا بنا دیں۔ اس کا اندازہ ہے آپ کو اور اگر انسان الٹے سیدھے فیصلے اور عہد کر لیتا ہے تو ان کا نتیجہ بھگتنے کے لیے بھی اسے تیار رہنا چاہیے، میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اگر آپ اپنی عزت کی بحالی کے لیے اس ضد پر قائم ہیں۔'' اس کے اس انداز پر مہ پارہ بیگم ہولے سے مسکرا دیں۔

''وہ سلمان کو آزاد کر دیں، تم انھیں یہ بات ماننے پر تیار کر لو، میں یہ انٹرویو شائع کرنے سے روک دوں گی کرن کو۔'' فیضان نے انھیں غور سے دیکھا اسے لگا وہ اس صورتِ حال سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

''وہ سلمان کو امریکا بھجوا رہے ہیں اور جب تک اس کا علاج مکمل نہیں ہو جاتا وہ واپس نہیں آئے گا۔'' اس نے بتایا۔

''وہ اس کے بعد بھی واپس نہیں آئے گا تم انھیں سمجھا لو۔ وہ جس قسم کی زندگی میں اسے دھکیلنا چاہتے ہیں وہ اس میں سروائیو نہیں کر سکے گا پھر سے بیمار پڑ جائے گا۔'' فیضان نے ایک مرتبہ پھر غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا جواب بالکل سپاٹ تھا۔

''آپ کی بات تو وہ خوب مانتے ہیں، آپ کیوں نہیں کہہ دیتیں یہ سب ان سے؟''

''میں کہہ کر دیکھ چکی، وہ نہیں مانے جبھی تو تم سے کہہ رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے جواب تک راز تھا وہ راز ہی رہے گا، اس کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔'' فیضان نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور واپسی کے لیے کھڑا ہو گیا۔

.....o.....

''کمال ہے حسن کمال، آج تم نے ہم پر نظرِ عنایت کیسے ڈال لی ورنہ تم تو ہمیں دیکھ کر ہی نظریں چرا کر نکل جاتے ہو۔'' جدید صحافت کے چار اصول نامی کتاب کی افتتاحی تقریب میں حسن کمال سے مڈبھیڑ ہونے پر نعیم کہہ رہا تھا۔

''اس خیال سے کہ تم پند و نصائح کی ٹوکریاں کھول کر بیٹھ جاؤ گے اور مجھے ماضی بعید میں کی میری ہی باتیں سنانے لگو گے، میں تم سے نظریں چرا کر بھاگتا رہا۔'' حسن نے مسکرا کر کہا ''ویسے تم

مجھ سے ملنا چاہتے تو زبردستی بھی مل سکتے تھے۔''

''ہم تو بھائی تمہاری روز بروز ماؤنٹ ایورسٹ بنتی شخصیت کے رعب سے ہی تھرتھراتے رہے۔'' جہانگیر نے مذاق سے کہا۔

''جبھی اس ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی تیاریوں میں مصروف ہو۔ تمہاری فلائٹس بہت اونچی جانے لگی ہیں، لگتا ہے تم لوگوں کے ہاتھ میں کوئی گیدر سنگھی آ گئی ہے۔'' حسن نے معنی خیز انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاید میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ نہیں پایا۔'' نعیم نے جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب تو بڑے بڑے فنانسرز کے ساتھ شیئرز ہولڈنگ ہونے لگی ہے اور ہینگ، پھٹکری کے بغیر ہی چوکھا رنگ آنے لگا ہے۔'' حسن نے بین السطور اپنی بات سمجھائی۔

''اوہ، اچھا۔'' جہانگیر نے اب کے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا ''بات یہ ہے حسن بھائی کہ ہم نے آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ مارکیٹ میں ان رہنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔''

''بہت خوب!'' حسن نے داد دی ''گویا میرا وہاں سے چلا آنا تمھارے لیے بہت اچھا ثابت ہوا، تم لوگوں کو اپنا ٹریک مل گیا۔''

''یہی سمجھ لیں۔'' جہانگیر اور نعیم اس کی شخصیت کے سامنے خود کو دبا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

''ویسے یار، تم لوگ اتنے لمبے عرصے سے اس فیلڈ میں ہو مگر یقین جانو کہ ابھی تک تمھیں وہ مقام نہیں ملا جو تم ڈیزرو کرتے ہو۔'' حسن نے مڑتے مڑتے رک کر کہا۔

''کیا مطلب.....؟'' نعیم اور جہانگیر نے بیک آواز پوچھا۔

''ابھی بھی میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں کا وہی اسٹیٹس ہے اون لکر میں جو آج سے دو سال پہلے تھا، مینجمنٹ میں نئے لوگ آ گئے، نیا اسٹاف رکھ لیا گیا۔ فوٹو گرافی اور کمپوزنگ وغیرہ وغیرہ میں ماہرین کو اور کوالیفکیشن کو ترجیح دی جانے لگی ہے، تجربے اور ادارے کے لیے پرانی خدمت، میرٹ کا کوئی پیمانہ نہیں رہا، کیوں، میں غلط کہہ رہا ہوں کیا؟'' حسن نے دونوں کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ دونوں اس کی بات کے جواب میں خاموش تھے۔

''یہ تو وہی بات ہے کہ درد کہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں، دیکھو نا اتنا عرصہ تم لوگوں

نے مہرین کیانی کے ساتھ اس امید پر گزارا کہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب اون لکر کے دن بھی پھریں گے یہ بھی پرائم لائن کا لیڈنگ میگزین بن جائے گا اور جب ایسا ہو جائے گا تو راوی تمھارے لیے بھی چین ہی چین اور سکون ہی سکون لکھے گا مگر جب ایسا وقت آیا تو ادارہ نئے نئے چہروں سے بھر گیا اور پرانے چہروں کو پچھلی قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ اب آج کی اس تقریب میں ہی دیکھو تم لوگ کس حیثیت سے آئے ہو، فوٹو گرافی کے لیے یا پھر اون لکر کی نمائندگی کے لیے، وہ بھی اس لیے کہ آج کے دن کی یہ تقریب اون لکر والوں کی ترجیحات کی لسٹ میں کچھ اتنی اہم نہیں ہے۔ یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے چچ چچ۔'' حسن کمال اعتماد کے ساتھ مضبوط لہجے میں بات کر رہا تھا، نعیم اور جہانگیر کے دل کو اس کی باتیں درست محسوس ہو رہی تھیں۔

''جبکہ اپنی اس محدود دنیا سے باہر نکل کر دیکھو، انفارمیشن ٹیکنالوجی کی فیلڈ میں کیسے کیسے نت نئے میدان سجے ہیں، کتنے فورمز ہیں جہاں تمھارے جیسے لوگوں کی ہی مانگ ہے۔ تمھارے جیسے لڑکوں کو صرف خود کو کیش کرانے کا فن آنا چاہیے پھر چاندی ہی چاندی ہے۔ کیوں میری بات کا یقین نہیں آ رہا کیا.....؟'' اس نے اپنے سامنے مبہوت کھڑے نعیم اور جہانگیر سے پوچھا، وہ دونوں بھی جیسے چونک سے گئے۔

''پتا ہے حسن، ہمیں یہ سب پتا ہے مگر ساری بات ہی چانس ملنے کی ہے اور چانس تمھیں معلوم ہے کہ کسی، کسی کو ہی ملتا ہے۔'' جہانگیر نے نیچی آواز میں کہا۔

''چانس ملتے نہیں، کری ایٹ کیے جاتے ہیں میرے بھائی، تم لوگ کوشش کرو تو چانس بنے نا!'' حسن نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا ''اب یہی دیکھ لو ہم چند ساتھی مل کر اپنا ایک چینل شروع کر رہے ہیں اور اس کے لیے ہمیں بہت سے لوگوں کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کو چیک بھی کر رہے ہیں مگر تم لوگوں کو شاید اب تک اس بات کی خبر بھی نہیں ہے۔'' جہانگیر نے نظر اٹھا کر حسن کے قیمتی سوٹ کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

''ابھی تک اس کے بارے میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی اس لیے۔'' اس نے کہا۔

''اوہو، یار.....'' حسن نے جھنجلا کر کہا ''خبریں جب شائع ہو جائیں تو وہ خبریں تو نہیں رہتیں ان لوگوں کے لیے کم از کم جو فیلڈ میں ہیں، خبریں پڑھنا نہیں ان کو پکڑنا سیکھو۔'' اس نے ان دونوں کی طرف ناراض سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''یہ میرا کارڈ ہے۔'' اس نے جیب سے کارڈ نکالتے ہوئے کہا ''اگر میری بات پلے پڑ جائے تو مجھ سے رابطہ ضرور کرنا، میں دوستوں کا

دوست ہوں، مہرین کیانی کی نظروں میں اب سے صرف وہ سمائے گا جو اس قابل ہوگا اور قابلیت کا معیار اب اس کے نزدیک کیا ہے یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں، وہ ریس میں شامل ہو رہی ہے اور اس ریس کے اصول بہت انوکھے ہیں، تمھاری سمجھ میں آنے والے نہیں۔'' وہ ہولے سے مسکرایا اور سر کے اشارے سے خدا حافظ کہتا دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں سے دوسری طرف جاتے ہوئے اسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ جہانگیر اور نعیم کے ذہنوں میں سوچ کے نئے دور وا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

.....

''بیٹی کی کمائی ہی بیٹھ کر کھاتی رہو گی یا کبھی اس کی اپنی زندگی کے بارے میں بھی سوچو گی؟'' سمعیہ کے ابا کو دنوں بعد خیال آیا تھا کہ حالات جیسے چل رہے تھے وہ ان کے مزاج اور خاندانی پس منظر سے میل نہیں کھاتے تھے، اس لیے وہ اپنی بیوی کو بھی اپنے نئے خیال کی خبر دینا چاہ رہے تھے۔

''زندگی اس کی اچھی بھلی ہے، اس کے بارے میں کیا سوچنا ہے؟'' سمعیہ کی امی نے پیزا ہٹ سے منگوائے مشروم اسٹفڈ پیزا کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''تو کیسی بے فکری ماں ہے سکینہ بی بی، تجھے یاد نہیں رہا شاید کہ بیٹیوں کی شادی کے بعد ہی اس کی اصلی زندگی شروع ہوتی ہے۔'' ابا نے بیوی کی بات کے جواب میں بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا، شادی.....!'' امی کو میاں کی بات اب جا کر سمجھ آئی تھی۔

''تو اور کیا.....!'' ابا نے شکر کیا کہ بیوی کو بات تو سمجھ آ گئی ''بڑا شوق پورا ہو گیا ڈراموں میں کام کرنے کا عیش بھی کر لیا، آرام بھی کر لیا۔ برادری کی باتیں بھی سن لیں، ہم دونوں نے بیٹی کا ساتھ دیا اور ہم دونوں ہی آہستہ آہستہ سارے رشتوں سے دور ہو گئے۔ تو نے دیکھا نہیں اب تو بیٹوں نے بھی ادھر آنا تقریباً چھوڑ ہی دیا ہے، وہ بیچارے بھی کیا کریں وہ اسی محلے میں رہتے ہیں، اسی برادری کی خوشی غمی میں شریک ہوتے ہیں سب کی باتیں انھیں ہی سننی پڑتی ہیں۔ اب تو انھوں نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہمارا بہن سے کوئی تعلق ہی نہیں۔''

''نہیں تعلق تو نہ سہی۔'' امی غضب ناک ہو کر بولیں ''اپنی بیویوں کے سکھانے پر ایسا کہتے ہیں، میں پوچھتی ہوں اس وقت ان کی عزتوں کو بٹا نہیں لگتا تھا جب ہلاشیری دینے آئے تھے بہن

کو کہ اس کام میں کوئی حرج نہیں، آج کل اچھے اچھے گھرانوں کی لڑکیاں بھی یہی کچھ کر رہی ہیں۔

اس وقت تو ان کی بیویوں کو اسی بات میں فائدہ نظر آیا تھا کہ سمعیہ کے اس کوٹھی میں چلے آنے سے ساس سسر اور نند کے بوجھ سے آزادی ملے گی۔ اب انھیں یاد آنے لگا کہ اس کی وجہ سے برادری میں ناک کٹتی ہے اور برادری......'' وہ دم بھر کو رکیں ''روٹی ڈکارنے تو بڑی جلدی پہنچ گئی تھی سمعیہ کے بلاوے پر، تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی اب بھی اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو آپ کے پاس کیوں آتے ہیں یہ لوگ کہ سمعیہ فون کرے تو فلاں کام ہو سکتا ہے ان پیٹھ پیچھے برائیاں کرنے والے کی بات پر کان دھرنے لگے میاں تو واپس پہنچ جاؤ گے پرانے محلے اور پڑے رہا کرو گے سیڑھیوں کے نیچے بنی ڈیوڑھی میں بچھی کھاٹ پر۔ تمھارے جیسے ہی ہوتے ہیں باؤلے، لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والے۔''

''میں یہ بات کب کر رہا ہوں۔'' ابا امی کے چلانے پر گھبرا کر بولے ''میں تو کہہ رہا ہوں بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے اور باپ کے گھر سے رخصت ہو جائے تو اچھی لگتی ہے سسرال والے گھر میں۔ سمعیہ اب بہت چھوٹی نہیں ہے اب یہی عمر ہے اس کی شادی کی......''

''کون سا باپ کا گھر ہیں، یہ تو بتاؤ؟'' امی لڑنے کے سے انداز میں ہاتھ نچا کر بولیں ''یہ باپ کا گھر ہے جس میں بیٹی رہتی ہے یا بیٹی کا گھر ہے جس میں باپ رہتا ہے۔'' ابا نے شرمندہ ہوتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''اور شادی......'' انھوں نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی شادی وادی کی عمر نہیں نکلی جا رہی، اب ہی تو اصلی معنوں میں وہ نکھری ہے اپنے کام میں، شادی کر کے سب کچھ گنوا لے اپنے ہاتھ سے۔ ارے کم عقل بندے، شادی شدہ لڑکی کی کیا ویلیو ہوتی ہے شوبز میں، انڈہ یعنی زیرو۔'' انھوں نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو دائرے کی شکل میں جوڑتے ہوئے کہا ''اور سمعیہ کی کوئی ویلیو نہ رہی تو پھر یہ ٹھاٹ، یہ عیش، کوٹھی، کار، کھانا پینا سمجھو سب ہاتھ سے گیا۔ ابھی کوئی شادی وادی نہیں کر رہی سمعیہ سلطانہ اور اس وقت تک نہیں کرے گی جب تک اس کی مانگ ہے اور ہیروئن کے طور پر جگہ اس کی قائم ہے۔''

''مگر نیک بخت شادی کی تو ایک عمر ہوتی ہے وہ نکل جائے تو پھر رشتے ملنے مشکل ہو جاتے ہیں۔'' ابا نے کمزور آواز میں ایک مرتبہ پھر اپنا مدعا بیان کرنا چاہا۔

''رش...... تے'' امی قہقہہ لگا کر ہنسیں ''ہمیں کیا ضرورت ہے رشتوں کو ڈھونڈنے اور

انتظار کرنے کی، اپنی ہی برادری کا لڑکا ڈھونڈا ڈھنڈایا ہمارے پاس موجود ہے۔ دونوں کی آپس میں اتنی اچھی دوستی ہے ساتھ ساتھ رہتے ہیں، انھیں پتا ہے کہ انھوں نے کب شادی کرنی ہے، ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''برادری کا لڑکا ہے...... جبھی تو برادری باتیں کرتی ہے، سب پتا ہے ان کو دونوں کہاں گھومتے پھرتے ہیں، کہاں کہاں اکٹھے جاتے ہیں۔'' ابا نے ایک مرتبہ پھر دبے لفظوں میں جتانا چاہا۔

''تو پروا کس کو ہے......؟'' امی نے بدستور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''جب لڑکا لڑکی راضی ہیں تو پھر کسی کو بھی اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔''

''لیکن لڑکے نے کبھی کسی ارادے کا اظہار بھی کیا ہے یا ہم یونہی دیوانے ہوئے جا رہے ہیں۔'' ابا کے دل کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''یہاں آنا جانا، ہر وقت سمعیہ کے ساتھ ساتھ رہنا بلکہ میں تو کہتی ہوں آج سمعیہ جو کچھ بھی ہے سب اس لڑکے کی وجہ سے ہے، وہ قدم قدم پر اسے سمجھاتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ادھر سمعیہ بھی اس کی دیوانی ہے، اس کے علم اور ذہانت کی تعریفیں کر کے نہیں تھکتی۔ وہ تو گرو مانتی ہے اسے اپنا لڑکے نے منہ سے اظہار نہیں کیا تو کیا ہوا اس کی ہر ادا سے اظہار ہوتا ہے۔'' امی نے اعتماد کے ساتھ کہا اور ابا شاید مطمئن ہو گئے تھے جبھی ان کا دھیان اپنے من پسند ٹی وی چینل کی طرف ہو گیا تھا۔

اپنی ماں کی طرح سمعیہ سلطانہ کو بھی اسی قسم کا یقین تھا بلکہ اسے شاید اپنی ذات سے بھی زیادہ حسن کمال پر یقین تھا۔ وہ جب اپنے اردگرد لوگوں سے حسن کمال کی تعریفیں سنتی یا اس کی کسی کامیابی کی خبر سنتی تو اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ حسن کمال اس کا آئیڈیل اب نہیں بنا تھا، وہ بہت پہلے سے اسے آئیڈیلائز کر رہی تھی شاید اس وقت سے جب سمعیہ سلطانہ دنیا کے متعلق بہت کم جانتی تھی، اس وقت بھی اسے ایک شخص کے بارے میں خوب علم تھا اور وہ شخص حسن کمال تھا اور یہ بھی درست تھا کہ اب اس دنیا کے بارے میں اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی سمعیہ کے خیال میں حسن کمال جیسا کوئی نہیں تھا۔ ذہانت میں وہ اپنے مخاطب کے ہمیشہ کان کاٹتا ہی نظر آیا تھا۔ علم اس کو ہر موضوع پر ہر بات کا ہوتا تھا۔ اس کی تحریر میں روانی اور برجستگی ہوتی تھی کچھ عرصے سے وہ ایک بڑے نیوز چینل پر مستقل مبصر اور ٹاک شوز کے میزبان کے طور پر سامنے آ رہا تھا۔ اسلام آباد

سے جاری ہونے والے ایک نئے اخبار میں روزانہ کالم لکھنے کا وہ پُرکشش معاوضہ لے رہا تھا۔ سمعیہ کو تو بعض اوقات ایسا لگتا کہ حسن کمال ہر طرف چھایا ہوا تھا اور ہر نیا دن اس کے لیے شہرت کی ایک نئی سیڑھی نکال کر لاتا تھا اور وہ بغیر لڑکھڑائے اس سیڑھی پر چڑھ جاتا تھا۔

سمعیہ نے خود کیسا ہی نام اتنے عرصے میں کمایا تھا اور کیسا ہی وہ ایک نامور ٹی وی اداکارہ کے طور پر مشہور ہو چکی تھی، اس کے دل میں حسن کمال کا مقام پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو چکا تھا۔ اپنے کئی انٹرویوز میں وہ اس بات کا برملا اظہار بھی کر چکی تھی مگر اب کچھ دنوں سے اسے احساس ہونے لگا تھا کہ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی دوڑ میں حسن کچھ اتنا زیادہ مصروف ہو چکا تھا کہ اس کے پاس سمعیہ کا فون سننے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ وہ گھر میں ہوتی، شوٹنگ میں مصروف ہوتی یا پھر کہیں باہر گھومنے اور تفریح کرنے میں مصروف ہوتی جب بھی وہ حسن کو کال کرتی اسکا نمبر یا تو مصروف ہوتا تھا یا پھر کال بند کر دی جاتی تھی اگر کبھی حسن سے رابطہ ہو بھی جاتا تو وہ اپنی کسی انتہائی اہم مصروفیت کی خبر دے کر اس سے معذرت کر لیتا تھا۔ سمعیہ کے دل کو یہ توقع تو اب بھی نہیں ہوتی تھی کہ حسن کمال کا رویہ کبھی اس سے بدل سکتا تھا مگر وہ اس کے حالیہ رویے پر مضطرب ضرور تھی۔

.....

''مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ کوئی حماقت نہیں کرو گے اور سیدھے میرے پاس چلے آؤ گے کیونکہ تم بھی اس دور کی پیداوار ہو جس میں اصول، روایات، دعوے اور عہد، ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور جس میں ضرورت، موقع سے فائدہ اٹھانا اور اپنے ٹیلنٹ کا درست استعمال ہی سب سے اہم قرار دیے جاتے ہیں۔'' حسن کمال، نعیم اور جہانگیر سے مخاطب تھا۔

''پیسہ!'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا ''پیسہ سب سے اہم ضرورت ہے انسان کی، اس کے بغیر نہ ٹیلنٹ کی کوئی قدر ہے نا تعلیم کی کوئی اہمیت اور جب انسان کی اتنی سی بھی وقعت نہ ہو تو وہ اصولوں اور روایات کی پاسداری کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔'' جہانگیر اور نعیم اس کی بات کے جواب میں مسلسل یوں سر ہلا رہے تھے جیسے اس سے سو فیصد متفق ہوں۔

''میڈیا، صحافت یعنی فورتھ اسٹیٹ۔'' حسن نے پھر سے کہنا شروع کیا ''آج کے دور کی سب سے بڑی طاقت ہے جو اس میں کہیں ایڈجسٹ ہو گیا وہ سمجھو بادشاہ بن گیا۔ پہلے لوگ یعنی مصور پنسل سے شخصیتوں کے اسکیچ بناتے تھے، اب یہ کام میڈیا کرتا ہے اور اس کام میں اسے کھلی آزادی بھی ہے، چاہے تو اسکیچ بنا دے چاہے تو بگاڑ دے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ دونوں

صورتوں میں پیسے اس کے کھرے ہوتے ہیں۔ بڑی شخصیتوں کو اپنے امیج کی بڑی فکر ہوتی ہے یہ امیج بناؤ تب بھی پیسہ، بگاڑو تب بھی پیسہ اور پھر ہمارا یہ ملک ماشاءاللہ جس میں منتخب نمائندوں سے لے کر میلوں ٹھیلوں میں گڑوی لے کر آنے والیوں تک کو پروجیکشن مل رہی ہے اور پروجیکشن کے ذریعے جس طرح انھیں اپنی شخصیتوں کے امیج کے معاملے میں حساس بنایا جا رہا ہے وہاں صحافی کے لیے پیسے کی کیا کمی ہے، جہاں کسی صوبے کا چیف منسٹر کسی پرائیویٹ چینل پر اپنے انٹرویو نشر کروانے کے لیے بھاری معاوضہ دیتا ہے وہاں بزنس سیکٹر کا کیا عالم ہوگا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔''

''چیف منسٹر بھی.....؟'' نعیم نے بے ساختہ کہا۔

''میاں، تم رہ کس زمانے میں رہے ہو۔'' حسن نے قہقہہ لگایا ''یہ جو پرائیویٹ چینلز کی بھرمار ہے، یہ جو دیکھتے ہی دیکھتے ہر زبان میں چینل اپنی نشریات شروع کر رہے ہیں یہ ایسے ہی نہیں ہو رہا۔ اس میں بھائی بڑا فائدہ ہے روکڑا ہی روکڑا ہے۔ ایک ہی ادارے کے نام سے اخبار، رسائل بھی شائع ہو رہے ہیں، تین چار چینلز بھی چل رہے ہیں کس بات کے سر پر جانتے ہو۔'' حسن نے ان دونوں کی طرف دیکھا ''ایکسپلائیٹیشن صرف ایکسپلائیٹیشن کے سر پر، ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں کے سودے ہوتے ہیں دن بھر میں یہاں عزتیں بنانے کے لیے بھی اور پگڑیاں اچھالنے کے لیے بھی.....''

''مگر آپ کو معلوم ہے کہ اون لکر کبھی کسی ایسے بزنس میں انوالو نہیں رہا۔'' جہانگیر نے سادگی سے کہا۔

''ہو جائے گا۔'' حسن مسکرایا ''ضرور ہو جائے گا، یہ جواب نیا سیٹ اپ بنا ہے نا اون لکر کا یہ اسے اس ٹریک پر لے جائے گا جہاں یہ چیزیں روزمرہ کا معمول ہیں مگر ایک بات اس میں بھی طے ہے۔''

''وہ کیا؟'' جہانگیر نے پوچھا۔

''اون لکر کے پرانے اسٹاف کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، یہ جو نئی مینجمنٹ آ رہی ہے نا وہ مہرین کیانی کو بھی ہائی پاس کر دے گی ایک دن، اسی سے اندازہ لگا لو کہ تم لوگوں کا کیا مقام ہوگا وہاں.....''

''ہم اسی لیے تو تمھارے پاس آئے ہیں یار، تم آج کل ان ہو فیلڈ کے ہر شعبے میں دوستوں سے دوستی نبھانا بھی تو سیکھو۔'' نعیم نے بے ساختہ کہا۔

"ہم تو دوستوں کے دوست ہیں یار، تم لوگ ہی دور دور بھاگتے رہے، میڈم کرن فاطمہ کے جھنڈے تلے کھڑے تم نے ہمیں شجرِ ممنوعہ قرار دے رکھا تھا۔" حسن نے طنزاً کہا۔

"ایسی بات نہیں حسن یار، ہم لوگ تو پروفیشنلزم پر یقین کرنے والے بندے ہیں مگر اب جو تم نئی سنار ہے ہو اون لکر کی وہ بہت حوصلہ شکن ہے اور عنوان بھی ایسے ہی نظر آ رہے ہیں کہ اون لکر کو صرف فنانس ہی نہیں کیا جائے گا بلکہ خاصی اکھاڑ پچھاڑ بھی ہوگی۔" نعیم نے سنجیدگی سے کہا۔

"پھر کیا خیال ہے؟" حسن نے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون سے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا خیال ہوگا سوائے اس کے کہ ہمارے لیے بھی کوئی جگہ ڈھونڈو۔"

"وہ تو ڈھونڈی ہوئی ہے، میرا اپنا چینل حاضر ہے تم لوگوں کی جگہ وہاں پکی ہے۔" حسن نے اپنے جال کی ڈوری کھینچتے ہوئے کہا اور انھیں ان کے کام کی نوعیت اور تفصیل بتانے لگا۔ اس رات جب نعیم اور جہانگیر، حسن کمال سے رخصت ہوئے تو ان کے دل ہلکے تھے اور پرسکون بھی جبکہ حسن کمال کی معلومات کے خزانے میں بھی کافی اضافہ ہو چکا تھا۔

.....

"شاید یہ میرا وہم ہو لیکن شازیہ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کچھ عرصے سے کام میں تمہاری توجہ کم ہو رہی ہے۔" ڈاکٹر عبدالصبور نے کافی دنوں کے مشاہدے کے بعد بالآخر شازیہ سے کہا تھا "اگر کچھ مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔"

"مسئلہ تو ہے سر۔" شازیہ نے سوچا "مگر اس کا تعلق نفسیات سے نہیں جذبات سے ہے پھر آپ میری کیا مدد کر سکیں گے؟"

"تمہارے کام میں وہ ربط اور چستی بھی نہیں ہے جو تمہارا خاصہ ہے، مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ، جھجکنے کی ضرورت نہیں، گھر میں کوئی مسئلہ ہے کیا، تمہارے والد کیسے ہیں؟" ڈاکٹر صبور کے لہجے میں ہمدردی اور شفقت تھی۔

"مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے سر، شاید میں ہی بلاوجہ ان ایکٹو ہو رہی ہوں۔" شازیہ نے پرسکون لہجے میں کہا "آپ نے اچھا کیا جو بروقت مجھے جتا دیا، میں انشاء اللہ اپنے کام پر پوری توجہ دوں گی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ڈاکٹر صبور نے اسی شفیق انداز میں کہا "لیکن اگر کبھی کوئی

مشکل ہو تو ضرور بتانا میں تمہارے پاس ہی موجود ہوں۔"

"تھینک یو سر۔" شازیہ نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ اس کے گھر میں ان دنوں اس کی شادی کا تذکرہ گرم تھا۔ برسوں سے ناراض برادری نے دوبارہ تعلق جوڑنے کے لیے اس کے والد کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور صلح اور تجدید تعلق کی شرط ایک نواستوار رشتے پر رکھی تھی۔ عباس اس کے تایا کا چوتھا بیٹا تھا۔ اس نے ملتان کے کسی کالج سے ایم کام کر رکھا تھا اور وہیں کسی سرکاری ادارے میں ملازمت کرتا تھا۔ شازیہ کے والد اتنے عرصے سے اپنوں سے دور رہتے تھک چکے تھے۔ ان کے ہاں برادریوں، تعلق داریوں اور رشتوں کی بہت اہمیت تھی۔ گو وہ شہر میں ایک نئی زندگی کا آغاز بہت اچھے طریقے سے کر چکے تھے مگر جانتے تھے کہ بچوں کے رشتوں کے سلسلے میں انھیں آنے والوں کے کئی سوالات کا جواب دینا پڑے گا اور اب ان کی دو بیٹیاں تقریباً جوان تھیں، ایسے میں تجدید تعلق کا یہ موقع ان کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا اور یہی وہ دن تھے جب فیضان سے شازیہ کا رابطہ تقریباً منقطع ہو چکا تھا۔ وہ فیضان کے بارے میں بھی مضطرب تھی، اسے کیا ایسا مسئلہ درپیش تھا جس سے نمٹ لینے کے انتظار میں اس نے شازیہ سے رابطہ موقوف کر رکھا تھا۔ شازیہ جانتی تھی کہ یہ وہ مسائل تھے جنھیں وہ ڈاکٹر صبور تو کیا کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتی تھی ہاں اگر فیضان سے رابطہ ہو جاتا تو وہ یقیناً اسے کوئی بہتر راہ سجھا سکتا تھا۔

"مجھے تم سے ضروری ملنا ہے پلیز....." اس نے اس روز پھر فیضان کو میسج کیا۔

"کل صبح گیارہ بجے میں تمھیں لبرٹی ہوٹل کے قریب سے پک کروں گا۔" کافی انتظار کے بعد جب وہ مایوس ہو چکی تھی فیضان کے جواب نے اس کے دل میں امید کی ایک کرن جگا دی۔

فیضان کے لیے شازیہ کی سنائی یہ نئی خبر غیر متوقع تھی "تم اگر کچھ دنوں کے لیے اس معاملے کو لٹکا سکتی ہو تو ایسا ضرور کرو کیونکہ مجھے وقت درکار ہے۔" اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کس معاملے میں الجھے ہوئے ہو؟" شازیہ کو اس کی بات سن کر تاؤ آ گیا۔

"میرا مسئلہ بہت گمبھیر ہے جانِ من، میں آئیڈینٹٹی کرائسس کا شکار ہو گیا ہوں، میری شناخت طبلے کی تھاپ، جاگیرداری کے نظام کے درمیان الجھ کر رہ گئی ہے، مجھے ذرا اسے سلجھا لینے دو۔" فیضان نے ایک مبہم سا جواب دیا۔

"تم بیکار کے جھمیلوں میں پڑ گئے ہو فیضان، تمہارے پاس تمہاری اچھی بھلی شناخت موجود

ہے پھر تم کیوں بنی الجھنوں میں خود کو ڈالتے ہو، کبھی تمھارے والد نے بھی تمھیں ڈس اون کرنے والی بات کی ہے۔'' شازیہ نے اس کے مسئلے کی تفصیل سن کر کہا۔

''نہیں، انھوں نے ایسا کبھی نہیں کیا مگر سارا قصہ سن کر نہ جانے کیوں مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ انھوں نے کبھی مجھے اون بھی ڈھنگ سے نہیں کیا۔'' فیضان نے کہا ''لیکن فی الحال میرا مسئلہ یہ نہیں ہے وہ کچھ اور ہے اور سارے جھمیلے ختم کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے۔''

''مگر میرا خیال نہیں ہے کہ میرے والد اس معاملے کو التوا میں ڈالیں گے خصوصاً جب ان کے پاس کوئی اور آپشن ہی نہیں۔'' شازیہ نے بے بسی کا اظہار کیا۔

''ہوں.....'' فیضان نے سوچتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے، میں کچھ کرتا ہوں۔''

''کیا تم اپنے والد کو آمادہ کرلو گے میرے گھر آنے پر.....؟'' شازیہ نے بے یقینی سے کہا۔

''اسی وجہ سے تو میں چاہتا تھا کہ معاملات کو ترتیب وار چلاؤں۔'' فیضان نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

''مگر شاید قسمت کی لسٹ میں ان کی ترتیب کچھ اور ہے۔ تم فکر مت کرو میں اپنی لسٹ بدل لیتا ہوں۔''

شازیہ کو اس کی بات سن کر ی یقیناً خوشی ہوئی تھی لیکن وہ ایک نامعلوم بے یقینی کا شکار تھی۔ اپنے مسائل میں جکڑا فیضان اس معاملے کو کھولنے کا رسک کیسے لے گا اور اس کے والد کی رجوعت کا جو عالم وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی ویسے شخص کو کسی ایسی بات کے لیے آمادہ کرنا جو اس کے معیار سے کم ہو ایک انتہائی مشکل کام تھا۔ شازیہ کسی بھی قسم کی صورتِ حال کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔

.....

''آپ جیسے لوگ تو ہم جیسوں کو ننگی کا ناچ نچانے میں مشغول ہیں حسن صاحب، آپ نے ہمیں ملاقات کا شرف کیسے بخش دیا آج؟'' اپنے اسلام آباد والے بنگلے میں ملاقات کے لیے آئے حسن کمال سے چوہدری مقصود نے شگفتہ سے انداز میں کہا تھا۔

''ہم نادیدہ دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں چوہدری صاحب، ایسی دوستی جو ملاقات کی محتاج نہیں ہوتی لیکن ہوتی ضرور ہے کبھی، صرف محسوس کرنے کی بات ہے۔''

''ہم محسوس بھی کرتے ہیں، مانتے بھی ہیں اور احسان مند بھی ہیں۔'' چوہدری مقصود نے

نرمی سے کہا ''کہیے، آج کیسے عزت بخشی آپ نے، خیر تو ہے نا ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی؟''

''کچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں چوہدری صاحب، جن کی بازگشت عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتی، وہ زندگی کے ہر موڑ پر سامنے آجاتی ہیں اور کرنے والے کا کچھ وقت ان پر ڈالنے کے لیے پردے کے انتظام میں گزر جاتا ہے۔'' حسن نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب، یہ ہے کہ خیر نہیں ہے۔'' چوہدری مقصود نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا ''فرمائیے، کیا معاملہ ہے؟''

''پھر نہ کہیے گا کہ ہم دوستوں کے دوست نہیں۔'' حسن نے دو فائلز اور دو آڈیو کیسٹ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ چائے لیجیے پلیز۔'' چوہدری مقصود نے فائلز اٹھا کر چشمہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے کہا۔ ان کے پرسنل سیکرٹری نے ایک پاکٹ سائز آڈیو کیسٹ پلیئر ان کے سامنے رکھا اور کیسٹ نمبر ایک فٹس کرنے کے بعد باہر چلا گیا۔ حسن کمال پُرتکلف چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور چوہدری مقصود فائلز پڑھنے اور کیسٹ سننے میں مصروف تھے۔

''ہاں.....'' تقریباً پون گھنٹے کے بعد چوہدری مقصود نے فائل سے نظر ہٹائی ان کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔ ''خوب'' وہ حسن کمال کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس قصے کے آغاز کے محرک تو آپ ہی تھے۔''

''یقیناً۔'' حسن کمال نے پُراعتماد لہجے میں کہا ''مگر بخدا اس وقت میں قطعی نہیں جانتا تھا کہ بظاہر ایک عام سیدھی سادی نظر آنے والی کہانی درحقیقت اتنی پیچ دار اور طویل ہوگی اور اس کہانی کے کئی کردار ایسے ہوں گے جو بہت سی اور کہانیوں میں بھی مین رول ادا کر رہے ہوں گے اور اگر مجھے معلوم ہوتا اور میں اس سلسلے کو آگے بڑھانے کا محرک ہوتا تب بھی آپ مجھے قصوروار سمجھنے میں حق بجانب تھے، مگر یہ اسٹوری جو جلد ہی شائع ہونے جا رہی ہے، اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گئی ورنہ تو شاید آپ اسے شائع ہونے کے بعد ہی پڑھ پاتے۔'' حسن نے نیاز مندانہ انداز میں کہا۔

''یہ آپ لوگوں کے اتفاقات ہی عجیب ہوتے ہیں صاحب، ہمیں تو آج تک سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیسے ہو جاتے ہیں۔'' چوہدری مقصود نے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا جبکہ حسن کمال کو ان کی اندرونی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

''جیسے آپ کے کام میں ہو جاتے ہیں سر.....!'' وہ جوابی حملہ کرتے ہوئے بولا ''سلسلے سارے میدانوں کے ایک سے ہیں جناب بس ان کے عنوان مختلف ہیں۔''

''پھر کیا مشورہ ہے اس سلسلے میں۔'' انھوں نے بات مختصر کرتے ہوئے فائلز کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ کا تجربہ بڑا ہے اور عمر بھی، آپ بہتر سمجھتے ہیں۔'' حسن نے سعادت مندی سے کہا۔

''مجھے کل شام نیویارک کے لیے فلائی کرنا ہے اور میرے پاس وقت کم ہے اس کم وقت میں کیا ہو سکتا ہے معاملہ آپ سامنے لائے ہیں، یقیناً بہتر جانتے ہوں گے کہ اس کو ختم کرنے کا طریقہ کون سے راستوں سے گزر کر ملتا ہے۔'' وہ تحمل سے بات کر رہے تھے۔

''یہ ڈیمنڈ کرتا ہے کہ اس کہانی میں سچائی کتنی ہے۔'' حسن نے اب اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنی کہیے، اس قصے کو مجھ تک پہنچانے اور اس کا ذکر کسی سے نہ کرنے کا معاوضہ کیا ہے؟'' چوہدری مقصود حسن کے ارادے کو بھانپ کر بولے ''باقی میں خود سنبھال لوں گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی!'' حسن نے ان کے بدلتے ارادے اور لہجے کو محسوس کیا اور ایک مرتبہ پھر شانے اچکا دیے ''لیکن فرض کریں کہ میں کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا اور نہ ہی یہ حلف دیتا ہوں کہ میں یہ معاملہ کسی اور تک نہیں پہنچاؤں گا، اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟''

'بلیک میلنگ کے لیے شہرت تو سنی تھی آپ کے گروپ کی، آج دیکھ بھی لی۔'' چوہدری مقصود نے سر ہلاتے ہوئے کہا ''معاملہ انتہائی پرسنل ہے میاں، اس لیے میرا لہجہ نرم ہے ورنہ مجھے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے سے روکا نہیں جا سکتا اتنا تو تمھیں معلوم ہوگا۔'' ان کا لہجہ یکلخت کرخت ہو گیا۔

''یقین جانیے میں کبھی اس دشت کی سیاحی میں پڑتا ہی نہیں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مہ پارہ بیگم آپ کا ذاتی معاملہ ہیں۔'' حسن کو انھیں تاؤ دلانے میں لطف آنے لگا ''لیکن شومئی قسمت اگر یہ معاملہ اب چل پڑا ہے تو اس کے سلسلے میں احتیاط سے کام لینا ہی مناسب ہوگا کیونکہ اس کی نقاب کشائی میں فریق ثانی ملوث ہے۔''

''فی الحال تو ایسا ہے کہ آپ جا سکتے ہیں۔'' چوہدری مقصود نے اپنے مزاج پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''باقی بات میں آپ سے پھر کر لوں گا۔ فی الحال مجھے اس

معاملے کی تہ تک پہنچنے اور اس پر غور کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔''

''جیسے آپ کا حکم۔'' حسن کمال نے اٹھتے ہوئے کہا ''مگر یہ یاد رہے کہ یہ فائلز اور یہ کیسٹس نقل ہی ہیں اصل کی۔''

''خوب جانتا ہوں۔'' چوہدری مقصود سر ہلا کر بولے ''اور اس کی کچھ نقلیں تمھارے پاس ہوں گی اور اصل کہاں ہوگی اس کا اندازہ بھی ہے مجھے۔''

''او کے۔'' حسن مسکرایا ''چلتا ہوں، اُمید ہے کہ پھر جلد ہی ملاقات ہوگی۔''

''بائی دا وے، نیویارک سے واپسی کب تک متوقع ہے آپ کی؟'' چوہدری مقصود اس کو کوئی جواب دیے بغیر اپنے موبائل فون پر کوئی نمبر ملانے میں مصروف ہو گئے۔ اس نے مسکرا کر سر کے اشارے سے سلام کیا اور ان کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔

چوہدری مقصود کے لیے اس شام کی دوسری غیر متوقع خبر فیضان کی بغیر اطلاع دیے اچانک اسلام آباد آمد تھی۔ ان کے پرسنل سیکرٹری نے انھیں بتایا تھا کہ فیضان نور ان سے ملنا چاہتا تھا۔

''میرا دل کمزور نہیں ہے، میں بڑی سے بڑی بات سہہ جانے کا عادی ہوں مگر یہ عہد شکنی جو آپ کی جانب سے اس عمر میں دیکھنے کو ملی ہے بہت شاکنگ ہے اور اس کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔'' فیضان کو انتظار کرنے کا پیغام بھجوا کر وہ تنہائی میں فون پر مہ پارہ بیگم سے مخاطب تھے۔ ''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں اب بھی نظر انداز کر دوں گا؟'' وہ پوچھ رہے تھے۔

''یہ انکشافات کر کے کیا آپ نے فیضی اور مانی کو دُہری اذیت سے دوچار کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' وہ بولے تھے ''کیا یہ سلمان کے معاملے میں ضد کا نتیجہ ہے، کیا یہ اس کا جواب ہے۔'' ان کے لہجے میں کرب تھا جسے مہ پارہ بیگم دور بیٹھی بھی محسوس کر رہی تھیں لیکن وہ کوئی جواب نہیں دے پا رہی تھیں کیونکہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ تحریر جو ابھی شائع ہی نہیں ہوئی، سفر کرتی ہوئی چوہدری مقصود تک کیسے پہنچ گئی تھی۔

.....

''اس سوال کا جواب دینا میرے لیے مشکل ہوتا اگر یہ سوال صرف ایک روز قبل آپ نے مجھ سے پوچھا ہوتا۔'' مہ پارہ بیگم کے استفسار پر کرن نے کہا تھا، ان کی بات سنتے ہی اس کی نظروں کے سامنے فہیم اور جہانگیر کے استعفوں کے کاغذ ناچ گئے تھے جو اس صبح ہی اون لکر کے دفتر میں پہنچے تھے اور جن میں مہرین کیانی کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ''مگر آج میں ایک منٹ میں جواب دے سکتی

ہوں کہ یہ کس کا کام ہوسکتا ہے اور یہ سب کس ذریعے سے چوہدری صاحب تک پہنچ گیا۔ جس شخص کو دن میں تارے دکھانے کی خاطر اس انٹرویو نما مضمون کی ترتیب کا کام شروع ہوا، اسی تک اس کی کاپی پہنچا کر اسے موقع دیا گیا کہ وہ حسب عادت معاملے کو ایکسپلائٹ کر کے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے، کیا کہا جائے اس کو انتہائی بدقسمتی یا محض اتفاق کیونکہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کو جیسا ہے کی شکل میں شائع کرنے کا، میں تو اس پر اس ذہن کے ساتھ کام کر رہی تھی کہ میں نے اس کو ایسی شکل دینی ہے کہ اس میں بہت سے نام اور واقعات پردے ہی میں رہ جائیں۔"

"میں تو رات بھر کی مسلسل بے خوابی اور سوچ کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس عمر میں بھی میں اتنی ہی جذباتی اور احمق ہوں جتنی اس وقت تھی، جب کی کہانی تمھیں سنائی۔" مہ پارہ بیگم نے شکستہ لہجے میں کہا "میں سوچ رہی ہوں کہ مجھ سے زیادہ سیانا تو فتح خان ہے اور وہ لڑکا فیضان بھی جو کم عمر ہے مگر سب حالات جاننے کے باوجود چوہدری مقصود کی ذات پر پردے پڑے ہی رہنے دینا چاہتا ہے۔ میں الزامات اور افواہوں کی یلغار سے گھبرا کر اپنے تئیں اصل کہانی سنا کر ان کا جواب دینے چلی تھی۔ تم دیکھو جس کے پردے اللہ رکھے چاہے بندہ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے جبھی تو وہ سب کچھ چوہدری مقصود تک پہنچ گیا۔" مہ پارہ بیگم سادگی سے اعتراف کر رہی تھیں۔

"یہ شاید اچھا ہوا ہو مگر اتنا بھی اچھا نہیں ہوا۔" کرن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ان کاغذات کی کاپیز اس شخص کے ہاتھ میں بھی یقیناً ہوں گی جو شہرت اور پیسہ کمانے کے جنون میں مبتلا ہو کر ابن شیطان بن چکا ہے۔ وہ اس موقع کو ایکسپلائٹ کرنے سے کبھی بھی باز نہیں رہے گا، میری مراد حسن کمال سے ہے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو، چوہدری مقصود خوب جانتے ہیں کہ کس شخص سے کیسے نبٹنا ہے۔" مہ پارہ بیگم نے کہا "مگر ایسا ضرور ہے کہ یہ کہانی اب کسی بھی شکل میں شائع نہیں ہو سکے گی۔ میں نے چوہدری مقصود سے معذرت کر لی ہے، میں واقعی غلط تھی۔ اس کہانی کے شائع ہو جانے سے میرے کردار کا دفاع تو شاید پھر بھی نہیں ہو پاتا ہاں البتہ چوہدری مقصود اور ان دونوں لڑکوں کی زندگیوں پر ضرور برا اثر پڑتا، خدا مجھے معاف کرے۔"

"انہی مصلحتوں کی خاطر، شاید انہی کی خاطر بہت سی ایسی کہانیاں ہمیشہ پردے میں رہتی ہیں اور ان کے کردار دنیا سے چلے بھی جاتے ہیں۔" ان کی بات سن کر کرن نے سوچا۔ وہ نعیم اور جہانگیر کی اس حرکت پر ششدر تھی، انھوں نے اس کی ریکارڈ فائل سے کاغذات اور آڈیو ٹیپس

نکال کر حسن کمال کے حوالے کر دی تھیں، اس کارنامے کے عوض وہ حسن کمال سے کیا حاصل کرنے والے تھے، اس کا اسے علم نہیں تھا مگر یہ اندازہ ضرور تھا کہ حسن نے انھیں خاصے سرسبز باغ دکھانے کے بعد ہی یہ کام کرنے پر آمادہ کیا ہوگا۔ وہ حسن کمال کی سوچ اور عمل کی گراوٹ پر بھی پہلے سے زیادہ دل گرفتہ ہو گئی تھی۔ وہ کس انتہا کو پانا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ کیا کچھ کر سکتا تھا وہ سوچتی رہی۔ اسے اس کام، اس پیشے سے نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی جہاں پروفیشنلزم کا کباڑا ہو رہا تھا اور جہاں بلند اصول اور قدیم روایت سستے داموں بک رہی تھیں۔ جہاں آئے روز معمولی باتوں کو افسانہ بنا کر عزتیں برباد کی جاتی تھیں اور بھاری رقوم حاصل کر کے بدکردار ترین لوگوں کے سروں پر اونچے شملے والی پگڑیاں رکھی جاتی تھیں۔ "میڈیا انفارمیشن" اس نے اپنے سامنے رکھے اخبارات و جرائد کی طرف شکوہ کرتی نظروں سے دیکھا۔ جاسوس کتوں کی طرح انسانوں کے کرداروں کو سونگھتے پھر رہے تھے، رائی کے پہاڑ اور جھوٹ کے محل کھڑے کر رہے تھے اور عام انسان کس قدر خوش ہے کہ آگاہی کے سارے ذریعے اس کے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول یونٹ میں بند ہیں" کیا میں مزید اس نظام کا حصہ بنے رہنے کی ہمت کر سکتی ہوں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ "کیا میرے جیسی کہیں کہیں اٹھنے والی اکا دکا آوازیں اس برق رفتار برائی کا مقابلہ کر کے اس نظام کو بدل سکتی ہیں؟" اس کی نظروں کے سامنے کچھ عرصہ پہلے کے اون لکر اور ان پبلشنگ اداروں کی حالت زار گھوم گئی جو اس زرد صحافت کے خلاف جہاد کرتے ہوئے حق گوئی و بے باکی کا نعرہ لگاتے تھے۔ ان کے اشتہارات بند، نیوز پرنٹ پر ڈیوٹی عائد، ٹیکسوں کی بھرمار نتیجتاً وہ بیچارے اپنی بقا کی جنگ میں مصروف ہو جاتے تھے۔ "اس ہجوم کے شور میں ایک کمزور آواز کی کیا حیثیت اور کیا اہمیت۔" اس نے سوچا اور اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ اون لکر کے دفتر میں سب کچھ نیا ہو گیا تھا۔ رنگ روغن، فرنیچر، کھولیات، اسٹاف، مینجمنٹ، مہرین کیانی ان تبدیلیوں پر بہت خوش تھی، اتنے طویل انتظار کے بعد اون لکر بہترین کاغذات اور پرنٹنگ کے ساتھ مارکیٹ میں جانے والا تھا اور شاید پہلی مرتبہ منافع بھی کمانے والا تھا کیونکہ اسے ان کی سرپرستی حاصل ہو چکی تھی جو صحافت کی دنیا کے پیر صاحب تھے۔

"اب تم لوگوں کا بھی کیا قصور ہے۔" اس نے دل میں نعیم اور جہانگیر کو مخاطب کیا "جہاں بڑے بڑے نام پرکشش آفرز پر پالیسی لائن اور اصول چھوڑ کر اِدھر سے اُدھر ہو سکتے ہیں تو تم لوگوں کی بساط کیا ہے، خصوصاً ان حالات میں جب یہاں بھی نئے نئے چہرے اپنی جگہ حاصل کر

رہے ہیں۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا قلم بند کر دیا اور اپنا سر جھکا کر میز کی سطح پر رکھ دیا۔ اس کا دل اس کی سوچ کی موت پر رو رہا تھا۔

.....

''میں سمجھتا تھا کہ وقت واقعات پر گرد کی تہ جماڑتا جاتا ہے اور ایک مخصوص عرصہ گزر جانے کے بعد ان واقعات پر وقت کی گرد کی اتنی بھاری تہ پڑ چکی ہوتی ہے کہ وہ کسی کو نظر نہیں آتے مگر میرا یہ تصور غلط نکلا، اب مجھے سمجھ میں آیا ہے کہ تجسس اور جستجو متعلقین کو وقت کی گرد کریدنے پر بھی لگا سکتے ہیں اور جب کسی چیز پر سے گرد کی تہ بے احتیاطی سے کریدی جاتی ہے تو اس پر کریدنے کے نشان پڑ جاتے ہیں اور اس کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی اس واقعے کے ساتھ ہوا۔'' چوہدری مقصود نے فیضان کے واضح استفسار پر چونکنے کے باوجود اشتعال میں آئے بغیر تحمل سے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اب یہی دیکھ لو، میں نے یہ سننے کے بعد کہ مہر و جان کی بیٹی کا بچہ میرے بھائی چوہدری منظور کا بیٹا ہے، میں مزید کوئی سوال جواب کیے بغیر خاموشی سے تمہیں وہاں سے نکال لایا اور اس کام میں، میں نے ذرا سی بھی تاخیر نہیں کی کیونکہ جتنی تاخیر ہو جاتی اتنے ہی کانوں میں اس بات کی خبر پڑ جاتی۔ میں نے اپنے مرحوم بھائی کے فعل کا الزام اپنے سر لے کر تمہیں بھابی جی کی گود میں بھی اس لیے دیا کہ حق دار کا حق اسے پہنچ جائے۔ یہ واقعہ بھی وقت کی گرد کے نیچے چھپ گیا تھا مگر جب گرد اس پر سے کریدی گئی تو اس کا اصل چہرہ میری نیت اور میرا عمل سب مسخ ہو گئے اور تمہارے دل میں درست مجھ سے شکایت پیدا ہوئی ہوں گی۔ تمہیں بہت سے ایسے مواقع خوانخواہ یاد آئے ہوں گے جب میں کسی وجہ سے تمہارے معاملے میں انصاف نہ کر سکا اور یہ یاد کرتے ہوئے تم یقیناً بھول گئے ہو گے کہ کئی مرتبہ سگے باپ بھی ایسا یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ کر جاتے ہیں۔'' فیضان کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے دماغ میں اٹھتی غصے کی لہر کو قابو کرنے کی کوشش میں بات کرتے ہوئے اٹک رہے تھے۔

''سو تمہیں حقیقت کا علم ہو چکا۔'' پھر انھوں نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر زبردستی مسکراتے ہوئے کہا ''کہو اب تمہاری فیلنگز کیا ہیں؟'' فیضان کو ان کی طرف سے اتنے متوازن ردعمل کی توقع قطعی نہیں تھی، وہ اتنی بڑی بات کیسے برداشت کر رہے تھے اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''میں نے کرن فاطمہ سے ریکویسٹ کی تھی کہ وہ یہ کہانی شائع نہ کرے۔'' اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا ''اس لیے نہیں کہ مجھے اپنی شناخت کے حوالے سے متاثر ہو جانے کا دکھ تھا بلکہ شاید اس لیے کہ میں آپ کو لیٹ ڈاؤن ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے مہ پارہ بیگم سے بھی یہی درخواست کی تھی اور آپ کے پاس بھی اسی لیے آیا تھا کہ وہ دونوں میری بات ماننے پر تیار نہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ کے امریکا چلے جانے سے موقع ہاتھ سے نکل جائے گا جبھی میں اتنی ایمرجنسی میں یہاں پہنچا ہوں، میرا خیال ہے کہ آپ اپنے سورسز استعمال کر کے اس معاملے کو روک سکتے ہیں۔''

''مجھے تمہارے اسی عمل نے تو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میرے لیے اس سے بڑی اچیومنٹ کیا ہو گی کہ جنھیں میں نے اپنایا، ان میں سے کم از کم ایک تو مجھ سے نفرت نہیں کرتا بلکہ شاید وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''کیا اتنے طویل ساتھ کا ایسا بھی نتیجہ نہیں نکلنا چاہیے۔'' فیضان نے ان کے غیر متوقع ردعمل پر ان کی طرف نمناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''لیکن ہمیں اپنا لینے کی سزا آپ نے خود کو کیوں دی اباء، آپ نے اتنی تنہا زندگی کیوں گزار دی۔'' وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ان سے اتنی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔

''مجھے اندیشہ تھا کہ میں انصاف نہیں کر سکوں گا، سگے رشتوں کے سامنے گود لیے رشتوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، بھابی جی کے سامنے سچ بولنا تو خود سے یہ ڈر تھا کہ تم سے اپنوں کے بجائے شریکوں کا سا رویہ اختیار کر لوں گا، انسان اظہار نہ کرے تو بھی اسے اپنی ذات کے پوشیدہ گوشوں اور کجیوں کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے شاید زندگی میں یہی ایک ایسا کام کسی لالچ، خوف یا غرض کے بغیر کیا تھا، شاید یہ ایک اچھا فعل مجھ سے سرزد ہوا تھا، میں اس کی کمائی گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی تنہائی کا علاج کرتا تو اس کا ضائع ہو جانا لازمی تھا۔ اب وقت کے ساتھ عمر اور تجربے میں اضافہ ہوا ہے تو خیال آیا ہے کہ یہ سب فریب اور دھوکا ہوتا ہے انا، ضد اور خودداری کے زعم سب بکواس ہے مگر باہر کی دنیا میں ہماری شخصیتوں کے ایج کچھ ایسے بن چکے ہیں کہ ہمیں ان دھوکوں کے ساتھ ہی چلنا ہے۔'' ٹرانسفارمیشن، فیضان نے اب تک یہ لفظ صرف سنا ہی تھا آج اس کی عملی تفسیر بھی دیکھ لی تھی اور اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''مہ پارہ بیگم ایک فنکارہ تھیں۔'' پھر انھوں نے کہا ''مگر وہ فنکاروں کے اس قبیلے سے تعلق

رکھتی تھیں جن کے نزدیک وضعداری اور خودداری سے زیادہ اہم کوئی چیز نہیں تھی۔ قسمت مجھے ان کے در پر لے گئی اور پھر واقعات کا ایک ایسا تسلسل شروع ہو گیا جس کا خاتمہ اب تک نہیں ہوا۔ زندگی کے پیچیدہ معاملات کے متعلق ہماری کم فہمی، ناتجربہ کاری اور احمقانہ جذباتیت نے بہت سے ایسے واقعات کو جنم دیا جن سے بچا بھی جا سکتا تھا مگر قدرت کو شاید تمھارے اور سلمان کے لیے کچھ بہتر انتظام مقصود تھا جبھی وہ سب ہوتا چلا گیا جو شاید ویسے نہ ہوتا۔ جو بھی ہوا پتر جی نتیجہ تمھارے سامنے ہے۔ میں نے مہ پارہ بیگم کو تم لوگوں کے سلسلے میں الزامات سے بچانے کی کوشش کی خود کو الزامات کی زد میں دے دیا مگر.....'' وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولے ''وہ اس عمر میں آ کر گمنامی کا چولا اتار پھینکنے کی خواہش کے جال میں پھنس گئیں، وہ اپنے فن کی تاریخ اگلی نسل کے گوش گزار کرنا چاہتی تھیں اور اسی خواہش نے انھیں خبروں کی شہ سرخی بنا دیا۔ پھر انھیں اپنی وضعداری اور ساکھ کی یاد ستانے لگی اور وہ ذاتی تاریخ کی کتاب کھول کر بیٹھ گئیں۔ دیکھ لو یہ ہمارا انفارمیشن میڈیا کیسے لپیٹتا ہے بندوں کو، میں انھیں بھی عمر بھر یہی سمجھاتا رہا اور مشورہ دیتا رہا کہ پریس اور پبلسٹی سے دور ہی رہیں کیونکہ جو حماقتیں ہم کر چکے تھے ان کو پس پردہ رکھنے کا یہی ایک طریقہ تھا، غلط وہ بھی نہیں تھیں۔'' چوہدری صاحب نے رک کر گلا صاف کیا ''سوچا ہوگا کہ اب اتنی عمر بعد کون زندگی کی تاریخ کی تہیں کھولنے بیٹھے گا، بھول گئیں کہ آج کل پر ملنے کی دیر ہوتی ہے کوا سیکنڈز میں بن جاتا ہے۔''

''آپ تک یہ خبر کس نے پہنچائی، مہ پارہ بیگم نے.....؟'' فیضان نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ مسکرائے ''ایک ہیں ہمارے مہربان جو خبریں خریدتے اور بیچتے ہیں نام ان کا حسن کمال ہے۔''

''یہ حسن کمال وہی ہے نا جس نے پہلے یہ سارا فساد اٹھایا تھا۔'' فیضان نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا کام ہی فساد اٹھانے پر چلتا ہے۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''پھر اب کیا ہوگا، کیا آپ کچھ کر سکتے ہیں؟''

''بس یہی فرق ہے، تم جتنے شریف نظر آتے ہو حقیقت میں بھی اتنے ہی شریف ہو، تمہاری نانی کی خواہش کے احترام میں یہ ایک غلطی میں نے اور کی اور تمھارے اندر تمھارے آبائی مزاج کو ڈیولپ ہونے نہیں دیا۔ جبھی تم ایسی معمولی باتوں پر گھبرا جاتے ہو۔ اب سوچ رہا ہوں کہ دوبارہ

سے تمہاری ٹریننگ شروع کروں، تعلیم علم دینے کے ساتھ ساتھ انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ وہ ولیوز اور اتھکس کی کشمکش میں پڑ جاتا ہے، یہ نہ ہو جائے وہ نہ ہو جائے، زمیندارانہ نظام کی گود میں پلنے والوں کو ایجوکیٹڈ ہونے کے ساتھ تھوڑا سا وائلڈ تھوڑا سا ظالم اور کافی بولڈ ہونا پڑتا ہے۔ تم میں یہ تینوں ہی کوالٹس نہیں ہیں، میں نے سلمان کو اپنا جانشین بنانے کا فیصلہ بدل دیا ہے، میرے فطری اور حقیقی جانشین تم ہی ہو گے، بہت نہیں کچھ کچھ تو میرے جیسے ہو۔ کم از کم میرے جتنا بولڈ اور معاملہ شناس تو تمھیں ضرور ہونا چاہیے۔'' چوہدری صاحب نے نرمی سے کہا۔

''اور سلمان.....؟'' فیضان نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

''وہ تو جا رہا ہے نا اسٹیٹس ایک لمبے عرصے کے لیے پھر وہ اپنے لیے کیا فیصلہ کرتا ہے دیکھتے ہیں۔ وہ کل میرے ساتھ ہی جا رہا تھا مگر اب اس حسن کمال دی نیوز ہنٹر سے وینٹنے کے بعد ہی جا سکیں گے ہم۔ فی الحال روانگی ملتوی کر دی ہے میں نے۔''

''ایک بات پوچھوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟'' فیضان نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''نہیں، تم پوچھو آج ہی پوچھ لو جو پوچھنا ہے پھر شاید میں کبھی اس موڈ میں نہ ہوں۔''

''آپ کو مہ پارہ بیگم سے بہت محبت تھی؟''

''ہوں.....'' انھوں نے ہاتھ میں پکڑی واکنگ اسٹک کے ٹاپ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''شاید وہ محبت تھی، احترام تھا یا ضد تھی۔ میں اب تک سمجھ نہیں پایا۔''

''وہ محبت ہی تھی۔'' فیضان نے یقین سے کہا۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' وہ چونکے۔

''کیونکہ یہ محبت ہی ہوتی ہے جس کے کھو جانے کا خوف ہمیں وہ کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے جو شاید کسی دوسری صورت میں ہم کبھی نہ کریں۔''

''تمھیں اتنا پرفیکٹ اندازہ کیسے ہوا؟''

''کیونکہ خود میرے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔'' فیضان نے سر جھکا کر کہا ''اس لیے میں محسوس کر سکتا ہوں۔''

''اوہ.....'' وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ''میں تو تمھیں انتہائی شریف لڑکا سمجھتا تھا۔''

''میں ایسا ہی ہوں جبھی محبت کی بات کر رہا ہوں، دل لگی کی نہیں۔''

''زبردست.....'' وہ مسکرائے ''کون ہیں وہ خاتون جنھوں نے تمھیں اتنی شاعرانہ گفتگو کرنا

سکھادی؟" فیضان کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"آپ کو شاید اچھا نہ لگے۔" اس نے انھیں کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مہ پارہ بیگم کی حویلی میں تم جاتے رہے ہو، میں نے سنا ہے ستار سیکھنے کے لیے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے وہاں کوئی ایسی لڑکی نہیں جس سے تمھیں محبت ہو جائے۔" انھوں نے اندازہ لگایا۔

"اگر ایسا ہوتا تو آپ برا مان جاتے؟" فیضان نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"شاید......" وہ صاف گوئی سے بولے۔

"اور اگر وہ کسی عام سے گھرانے کی عام سی لڑکی ہو تو؟"

"وہ عام کیسے رہی ہو گی جو تمھیں پسند آ گئی۔" انھوں نے بے ساختہ کہا۔ فیضان نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔

"جب سلمان کو اس کی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق دے رہا ہوں تو پھر تمہارا یہ حق کیسے سلب کر لوں۔" وہ بولے "اگر تم اس لڑکی کے ساتھ مخلص ہو تو میں اپنے مزاج اور اصول کو پس پشت ڈال سکتا ہوں، ویسے، وہ ہے کون؟"

"وہ شازیہ ہے، ڈاکٹر عبدالصبور کے کلینک کی ریسپشنسٹ۔" فیضان جلدی سے بولا۔ صرف وہی دن تھا، وہ دن گزر جاتا تو شاید پھر اسے اپنی بات کہنے کا موقع اس طرح دوبارہ نہ ملتا۔ وہ یہ موقع گنوانے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یہ موقع گنوایا بھی نہیں تھا۔

........✿........

مہ پارہ بیگم نے کرن کو انٹرویو کی اشاعت سے منع کر دیا تھا اور کرن نے بھی ان کی بات کا احترام کیا تھا مگر یہ جان کر کہ وہ فائلز اور ٹیپس حسن کمال کے پاس پہنچ چکی تھیں وہ لاشعوری طور پر منتظر تھی کہ حسن کمال ان کو کس طرح استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے اس نیوز چینل جہاں حسن کمال کام کر رہا تھا کے ہر پروگرام کو غور سے دیکھا اور سنا تھا۔ جہاں جہاں وہ کالم لکھتا تھا سب اخبار و رسائل پڑھے تھے مگر ایسی کوئی بات مہ پارہ بیگم کے متعلق اسے پڑھنے یا سننے کو نہیں ملی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے متعلق گردش کرنے والی خبریں آہستہ آہستہ خود ہی دم توڑتی جا رہی تھیں۔ اس نے اس دوران کئی مرتبہ خود مہ پارہ بیگم سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس کا ان سے رابطہ ہو نہیں سکا تھا۔

نئے سیٹ اپ میں ایڈجسٹمنٹ کے دوران وہ خود بھی بری طرح مصروف رہی تھی۔ اون لکر

کا سارا سیٹ اپ بدل چکا تھا۔ وہ پرانا دفتر ایک جدید یونٹ میں بدل چکا تھا۔ نئے اور انتہائی میلنٹڈ لوگ اون لکر کے لیے کام کر رہے تھے۔ مہرین کیانی صحیح معنوں میں اس نئی اسٹیٹ کو پیشہ ورانہ انداز میں چلا رہی تھی۔ اون لکر ایک نئے رنگ سے مارکیٹ میں متعارف ہوا تھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ کرن کی اپنی درخواست کے باوجود مہرین نے اسے صحافت چھوڑنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس نے اسے نئے تقاضوں سے تھوڑا بہت سمجھوتا کرنے پر ایک طویل لیکچر دیا تھا اور نئی مینجمنٹ کو آزمانے کا مشورہ بھی۔ کرن کے اپنے گھر میں اسے یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اسے ایک دم یہ سب چھوڑ نہیں دینا چاہیے تھا، بقول چامیاں کے اس چکا چوند روشنی میں بھی ایک چراغ جو جل رہا ہو گا اپنی انفرادیت کا احساس ضرور دلاتا رہے گا، انھی سارے جھمیلوں میں کافی وقت گزر گیا تھا اور کرن مہ پارہ بیگم سے نہیں مل پائی تھی۔ پھر ایک روز اس نے اخبار میں اچانک چوہدری مقصود گورائیہ کے بیٹے فیضان مقصود کی شادی کی خبر پڑھی تھی۔ یہ خبر اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کی اس شادی میں شرکت کے حوالے سے شائع ہوئی تھی۔ شادی کی تصویروں میں سے ایک میں اسے مہ پارہ بیگم بھی بیٹھی نظر آئی تھیں۔

"اسٹرینج۔" بے اختیار کرن کے منہ سے نکلا تھا۔ یہ خبر پڑھنے کے بعد اس کا فوری طور پر اُن سے ملنے کو دل چاہا اور اسی ملاقات کے لیے وہ کافی دنوں بعد اندرون لاہور کی طرف آئی تھی۔ حویلی مہرو جان کا دروازہ مخصوص طریقے سے کھٹکھٹاتے ہوئے اس نے اس منقش دروازے کے نقش و نگار کو غور سے دیکھا اور پھر اس کی نظر حویلی کی بلند دیواروں پر پڑی۔

"یہ دیواریں اور بند دروازے اپنے اندر نہ جانے کیسی کیسی کہانیاں چھپائے ہوئے ہیں، یوں ہی چھپائے رکھیں گے کبھی وا نہ ہونے کے لیے۔" دروازہ اندر سے کھلنے کی آواز پر اس نے ایک پٹ دھکیلتے ہوئے سوچا اور اندر داخل ہو گئی۔ وہی گزرگاہ، وہی مہمان خانہ، وہی وسیع صحن، گھاس کے قطعے، سنگ مرمر کا تخت اور ستار۔ وہ مسکراتے ہوئے اس مانوس منظر کو دیکھ رہی تھی مگر اس سارے مانوس منظر میں کہیں کچھ کمی تھی جس نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ کمی کہاں تھی، اس نے غور کرنا چاہا "ہاں سنگ مرمر کے اس تخت پر ستار اپنی مخصوص جگہ پر موجود نہیں ہے، بہت عجیب سی بات ہے۔" اس نے سوچا اور اپنے قریب کھڑے فتح خان کی جانب دیکھا۔ وہ بھی شاید اس کی نظروں کا تعاقب کرتے کرتے اس کے چونک جانے کی وجہ سمجھ چکا تھا۔ وہ اس کے آگے چلتا چلتا اسے نشست گاہ میں لے آیا۔ یہاں کرن کے چونکنے کا کچھ اور سامان بھی تھا۔ کمرے کے تمام سامان کو

سفید چادروں سے ڈھانک دیا گیا تھا۔

''فتح خان۔'' سرگوشی کے سے انداز میں الفاظ کرن کے منہ سے نکلے۔

''بیٹھیے کرن بی بی۔'' فتح خان نے مودب انداز میں کہا۔

''مہ پارہ بیگم کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔'' کرن نے کہا۔

''وہ تو جی چلی گئیں عمرے پر۔'' اس نے جواب دیا۔

''کب.....؟''

''کل دوپہر کی فلائٹ سے۔''

''واپس کب آئیں گی؟''

''معلوم نہیں جی۔'' فتح خان نے سر جھکا کر کہا ''وہ عمرہ کرنے کے بعد سلمان میاں کے ساتھ امریکا چلی جائیں گی اور ان کے ساتھ وہیں رہیں گی۔''

''اور یہاں اس حویلی میں کون رہے گا۔'' کرن نے بے چینی سے پوچھا۔

''یہ حویلی انھوں نے فیضان میاں کے نام کر دی ہے، یہاں شاید فیضان میاں اور ان کی بی بی رہیں گے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ یہ حویلی اماں مہر و جان کے نام سے منسوب ہے اور فیضان میاں.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''اوہ، مائی گاڈ۔'' کرن کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''اور چوہدری مقصود صاحب، کیا انھیں یہ سب معلوم ہے۔''

''جی کرن بی بی۔'' فتح خان پہلی بار مسکرا کر بولا ''چوہدری صاحب، بیگم صاحبہ اور سلمان میاں کے ساتھ ہی گئے ہیں۔ عمرے کے لیے چوہدری صاحب، بیگم صاحبہ کے محرم ہیں۔''

''جو ہو جائے، کم ہے۔'' کرن نے اپنے گھومتے دماغ کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ ''اور فیضان کیا وہ واقعی یہاں رہے گا؟''

''کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں ہے، فی الحال تو وہ اپنے علاقے چلے گئے ہیں، وہ اگلے الیکشن میں حصہ لینے کی تیاری کر رہے ہیں، الیکشن کے بعد ہی پتا چلے گا کہ وہ کہاں رہیں گے۔''

''اور تم لوگ.....؟ میرا مطلب ہے کہ حویلی کا سارا عملہ، تم تمہاری فیملی، استاد غریب سلطان.....؟''

''ہم سب یہیں ہیں دائم آباد، ہماری بیگم صاحبہ ہمارا خرچ مقرر کر کے گئی ہیں۔ اس حویلی کی

دیکھ بھال بھی تو کسی نے کرنا ہے نا جی۔'' فتح خان مسکرایا۔

''تم خوش ہو فتح خان، مہ پارہ بیگم جن کے دم سے یہ حویلی اس کی رونقیں اور محفلیں آباد تھیں وہ یہاں سے چلی گئیں تو تم خوش ہو۔'' کرن نے اسے مسکراتے دیکھ کر کہا۔

''ہماری بیگم صاحبہ ہی اس حویلی کی پہچان تھیں اس میں کوئی شک نہیں کرن بی بی مگر ہم سب ان کے جانے پر اس لیے خوش ہیں کہ ہم سب ان سے پیار کرتے ہیں، ہماری بیگم صاحبہ کی زندگی تو اب آباد ہوئی ہے نا، ہم ان کی زندگی آباد ہو جانے کے خیال سے خوش ہیں۔ ہم نے بڑے کڑے وقت ان پر آتے دیکھے ہیں۔ ایک عہد نامے کی شرائط کی زنجیروں میں جکڑے جکڑے انھوں نے زندگی کے بہت سے کٹھن سال تنہا کاٹ دیے، اب ہی تو صحیح معنوں میں انھیں زندگی ملی ہے۔ ہم کیوں خوش نہ ہوں جی۔''

''ہاں۔'' کرن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ''شاید تم ٹھیک کہتے ہو بلکہ تم واقعی ٹھیک کہتے ہو۔'' اس نے کہا اور ایک نظر طویل خالی کمرے پر ڈالی۔ جس کی سجاوٹ اور سامان جوں کا توں دھرا تھا مگر جس کی مکین موجود نہیں تھی۔ گو اسے ان کی مانوس خوشبو ابھی بھی وہاں بکھری محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کھڑی ہیں کب سے، بیٹھیے کرن بی بی، میں چائے پانی کا انتظام کرتا ہوں۔'' فتح خان کو اچانک احساس ہوا۔

''نہیں فتح خان، بہت شکریہ، میں اب چلوں گی۔'' کرن نے آہستہ آواز میں کہا اور نشست گاہ سے باہر نکل آئی۔ صحن کے نزدیک کو دیکھتے دیکھتے اس کی نظر سامنے گھاس کے قطعے پر پڑی، سفید سنگ مرمر کے تخت سے ستار غائب تھا مگر اس کے سُروں کی بازگشت اس کے کانوں میں ابھی بھی آ رہی تھی۔

''میں تو سیاں سے نیناں ملا آئی رے''

کوئی مدھر آواز میں گا رہا تھا۔ فضا پر چھائی خزاں نے درختوں سے پتے جھاڑ دیے تھے اور صحن میں بکھرے زرد پتے اس کے قدموں کے نیچے چرمرا رہے تھے۔ صحن سے گزر کر کرن ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ مہمان خانے کے کھلے دروازے سے اسکی نظر اندر پڑی۔ سامنے دیوار پر چوہدری مقصود کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔

''جانے سے پہلے بیگم صاحبہ نے خود لگوایا تھا۔'' فتح خان نے ایک مرتبہ پھر اس کی نظروں کا

تعاقب کیا تھا۔

"ہوں۔" کرن نے کہا "گڈ مود۔"

فتح خان اس کے الفاظ کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ کرن آہستہ قدموں سے چلتی حویلی سے باہر آ گئی تھی۔ کالا منقش دروازہ اس کے عقب میں بند ہو گیا "اور ان دروازوں کے اندر بند اسرار اور کہانیاں بند ہی رہتی ہیں۔ انھیں کوئی کھول نہیں سکتا، حسن کمال جیسا ہوشیار اور ذہین شخص بھی....."

اس نے سوچا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی کیسٹ پلیئر آن ہو گیا تھا۔

دل ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے مانوس آواز کرن کے کان میں آئی اور وہ ہولے سے مسکرا دی۔ مہ پارہ بیگم کے آڈیو کیسٹس اور سی ڈیز مارکیٹ میں دھڑا دھڑ بک رہی تھیں۔

.....

ٹریفک سگنل بند ہونے پر سمعیہ سلطانہ کی نظر حسن کمال کی گاڑی پر پڑی تھی وہ اسے بہت دنوں بعد نظر آیا تھا۔ وہ اسے مخاطب کرنا چاہتی تھی مگر حسن کی گاڑی اس کی گاڑی سے کافی فاصلے پر تھی سو وہ اسے اشارہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سگنل کھلنے پر سمعیہ نے اپنی تمام مصروفیات پس پشت ڈال کر حسن کمال کو پکڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی گاڑی حسن کی گاڑی کے پیچھے ڈال دی تھی۔ کئی سڑکیں مڑنے کے بعد حسن کی گاڑی ایک کمرشل ایریا کی دائیں لین میں داخل ہوئی اور تین بلڈنگز چھوڑ کر چوتھی کے آگے جا رکی تھی۔ سمعیہ کے گاڑی روکنے تک حسن گاڑی سے نکل کر اس عمارت کی بالائی منزل کی طرف جاتی سیڑھیوں پر چڑھ چکا تھا۔ اس کی نظر سمعیہ پر نہیں پڑی تھی۔ سمعیہ نے وہیں رک کر اس کی واپسی کا انتظار کرنا شروع کیا۔ پھر عمارت کی اندرونی دیوار پر نصب بورڈز پڑھتے پڑھتے اس کی نظر ماہنامہ اون لکر کے بورڈ پر پڑی جس کے ساتھ اوپر کی جانب تیر کا نشان بنا تھا۔ سمعیہ بری طرح چونک گئی۔ حسن کمال اور اون لکر سے کچھ عرصہ پہلے کی گفتگو یاد آنے لگی جس میں حسن کمال نے اون لکر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ اون لکر کا دفتر اسے فوراً ہی مل گیا تھا۔ وہ بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی یہ ایک ایسا کمرا تھا جس میں مختلف شعبوں کے ڈیسک تھے اور تقریباً تمام ڈیسک ہی خالی تھے۔ وہ آگے بڑھی، اس کے سامنے ایک گلاس وال تھی جس کے دوسری طرف

حسن کمال بیٹھا کسی لڑکی سے بات کر رہا تھا۔

"برا ماننے کی کیا بات ہے کرن فاطمہ، یہ تو پروفیشن کا ایک حصہ ہے۔ میں حالیہ کامیابیوں اور فارمیٹ کی تبدیلی پر مہرین کو مبارک دینے کے خیال سے ادھر آیا تھا، اس میں کوئی برائی ہے کیا؟" حسن کی آواز سمعیہ کو دروازے کے قریب جانے پر سنائی دی۔

"میرا خیال نہیں کہ اس کی کوئی ضرورت ہے اور مہرین کو بھی شاید تمہاری مبارکباد وصول کر کے کچھ خاص خوشی نہیں ہوگی۔" وہ لڑکی کہہ رہی تھی "یا پھر شاید اون لکر کی بڑھتی مقبولیت دیکھ کر تم نے واپسی کا راستہ صاف کرنے کا ارادہ کیا ہے۔"

"کیا تو نہیں مگر یہ آپشن برا بھی نہیں۔" حسن کہہ رہا تھا "میرا خیال ہے کہ حسن کمال کا ایک آرنیکل اون لکر کو چار پانچ چاند تو لگا ہی دے گا۔"

"کبھی سوچنا بھی مت۔" وہ لڑکی پھنکاری تھی۔ "اون لکر کا فارمیٹ کتنا بھی بدل جائے تمہارے جیسے موقع پرست، ضمیر فروش، خود غرض اور جھوٹ کے علم بلند کرنے والوں کی پھر بھی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔"

"اس کا فیصلہ تو مہرین کرے گی مجھے اس سے مل تو لینے دو۔" حسن نے ہنس کر کہا تھا "ویسے تمہارا کیا خیال ہے مہرین کیانی کو یہ نیا راستہ میری موقع پرستی، ضمیر فروشی اور خود غرضی نے نہیں دکھایا کیا۔ اگر میں راہ نہ بدلتا تو اون لکر آج بھی اسی قلمی زدہ دیواروں اور بوسیدہ فرنیچر والے دفتر میں دو چار حق پرست گود میں لیے بیٹھا ہوتا، تم لوگوں کو تو میرا مشکور ہونا چاہیے کرن فاطمہ تم الٹا ناراض ہو رہی ہو۔ فیک ہینڈ کرن فاطمہ ایک کامیاب انسان کو دوسرے کامیاب انسان سے ہینڈ شیک کر لینا چاہیے۔"

"ہیل ود وس کامیاب آدمی۔" وہ لڑکی اٹھ کر کھڑی ہوئی "تم نے سب کو غریب سمعیہ سلطانہ سمجھ رکھا ہے جو صرف تمہاری شخصیت کے سحر اور گفتگو کے دھوکے میں گرفتار ہو جائے گی۔"

"سمعیہ سلطانہ....." حسن نے ایک مرتبہ پھر قہقہہ لگایا تھا "اوپر جانے کے لیے زینہ تو تلاش کرنا پڑتا ہے نا، میں کوئی سپرمین تو نہیں جو ہوا میں اڑ کر اوپر پہنچ جاتا، سمعیہ سلطانہ تو ایک زینہ تھی بلندی پر پہنچنے کا، ہم سب ہی ایسے زینے استعمال کرتے ہیں۔"

"شرم کرو حسن کمال، وہ لڑکی اپنے انٹرویوز میں تمہیں اپنا آئیڈیل قرار دیتی ہے۔" اس لڑکی نے نفرت سے کہا۔

''اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' حسن نے شانے اچکائے ''وہ لڑکی اچھی خاصی شہرت یافتہ اداکارہ ہوتے ہوئے چودھویں صدی کی ہیروئنز کی طرح آئیڈیل ازم کا شکار بنی رہے تو میرا کیا قصور۔ میرے لیے تو وہ ایک ٹی وی اداکارہ سے بڑھ کر کچھ نہیں جس کا ڈراما تفریح طبع کے لیے میں دیکھ لیتا ہوں۔ اب میں جہاں موجود ہوں وہاں دوسرے مجھے زینہ بنانا چاہتے ہیں کیونکہ میں تو خود ٹاپ پر ہوں۔'' سمعیہ سلطانہ کا سر چکرانے لگا۔ پھر وہ لڑکی مہ پارہ بیگم کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی وہ کیا کہہ رہی تھی سمعیہ نے نہیں سنا۔

''اگر اون لکر تمہارا مضمون قبول کرلے گا تو یہ میرا اس ادارے میں آخری دن ہوگا۔'' کچھ دیر بعد اس لڑکی کی چلاتی آواز اس کے کان میں پڑی تھی۔

''تو پھر سامان باندھ لو اپنا کرن فاطمہ، شاید کل تمہارا یہاں آخری دن ہو میں نے مہرین کو لوکیٹ کرلیا ہے اور میں اس سے ملنے ہی والا ہوں۔'' حسن نے موبائل آف کرتے ہوئے کہا تھا اور سرعت سے باہر نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس کی نظر اب بھی وہاں رکھے ایک ڈیسک پر بیٹھی سمعیہ پر نہیں پڑی تھی۔ سمعیہ چکراتے سر کے ساتھ وہاں سے اٹھی تھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل آئی۔

''بلندی کی طرف جانے کے لیے زینہ محض ایک زینہ.....'' اسے حسن کی نظروں میں اپنی اوقات یاد آئی ''ایک ٹی وی اداکارہ جس کا ڈراما تفریح طبع'' الفاظ اس کے کانوں میں گڈمڈ ہونے لگے۔

''دھوکے باز، خودغرض، منافق، موقع پرست۔'' وہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ سمعیہ سلطانہ نیچے جاتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اس کی ٹانگوں نے آگے جانے سے انکار کردیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے دکھ اسے حسن کمال کے الفاظ کا تھا یا اپنے آئیڈیل کی موت کا اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بے آواز رو رہی تھی اور اندر بہت اندر کہیں اس کے دبا دل میں عرصے سے جلتی ایک شمع کی لو پھڑپھڑانے کے بعد بجھ گئی۔

.....